جس کو دل کہتے تھے
ڈاکٹر شیر شاہ سیّد
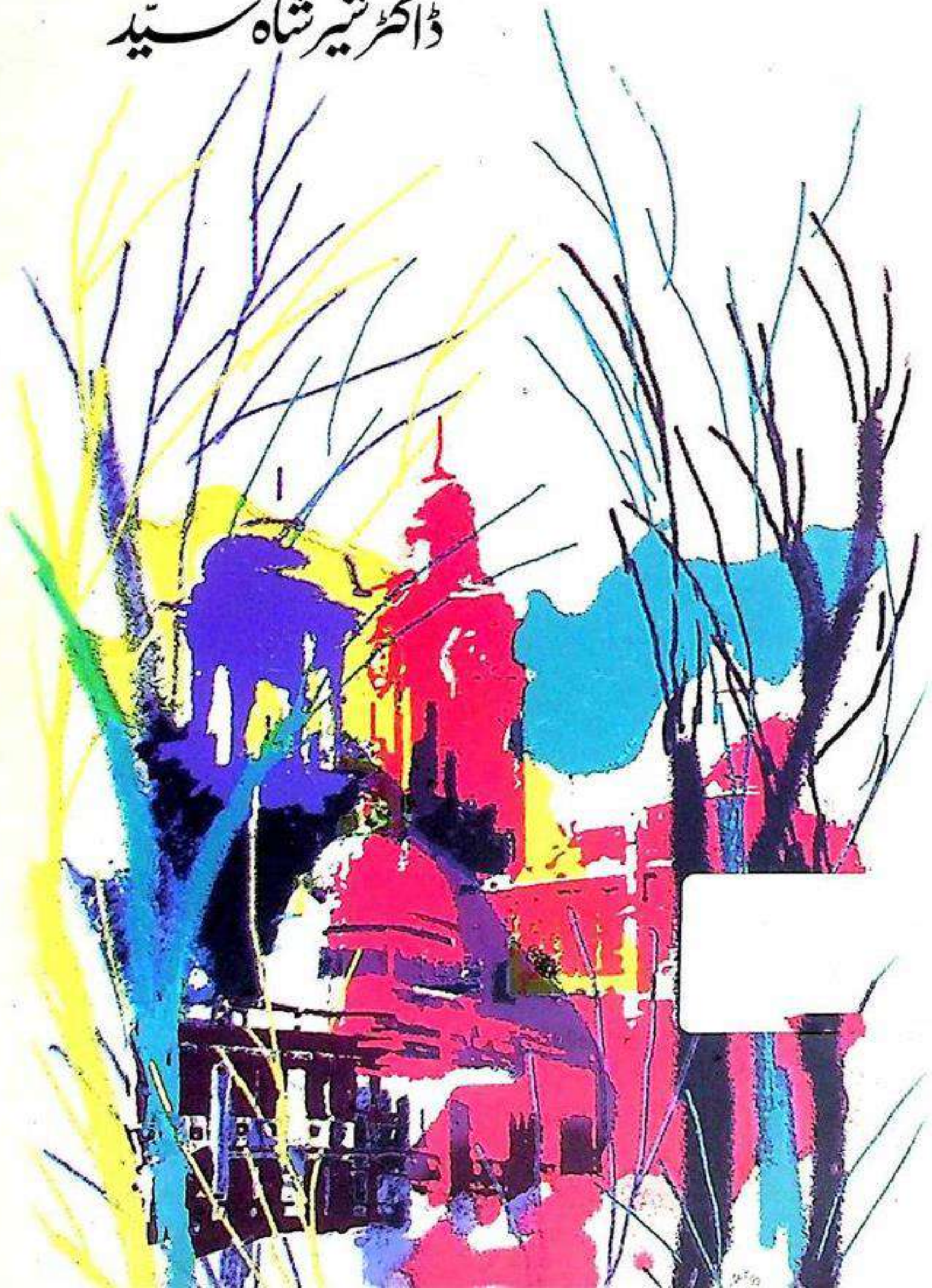
جس کو دل کہتے تھے

(افسانے)

ڈاکٹر شیر شاہ سیّد
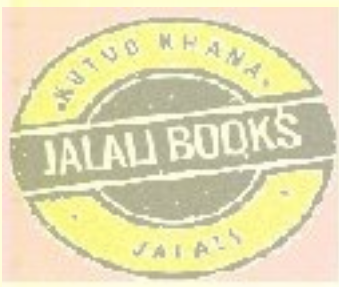
JIS KO DIL KEHTAY THEI

(Short Stories)

By: Dr. Sher Shah Syed

(اس کتاب میں شامل بیشتر کہانیوں کے کردار اور واقعات حقیقی ہیں۔ مماثلت غیر اتفاقی نہیں ہوگی)

نام کتاب : جس کو دل کہتے تھے

سرورق : سیف الاسلام

اشاعت اوّل : ۱۹۹۸ء (مجلد)

اشاعت دوم : ۲۰۰۱ء (پیپر بیک)

طباعت : فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی

ناشر

بی۔۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی۔

scheherzade@altavista.com

اماں کے نام

جن کی شفقت کی چاندنی
ہم سب بھائی بہنوں
خاندان کے دوسرے لوگوں
اور میرے ہر طرح کے
دوستوں پر
بلاامتیاز برستی رہی ہے۔

اماں: ڈاکٹر عطیہ ظفر

کچھ کھٹکتا تھا مرے سینے میں لیکن آخر
جس کو دل کہتے تھے، سو تیر کا پیکاں نکلا

(غالب)
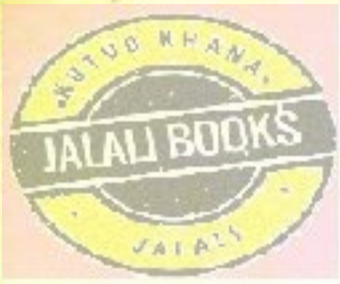
کراچی

رات بھر کان میں رونے کی صدا آتی ہے

(زہرا نگاہ)

ترتیب

میں شکر گزار ہوں ....

۹

آگرے کے ماسٹر صاحب

۱۱

ٹھنڈا پانی

۲۰

ریگِ ساحل

۲۷

وعدہ تو کیا ہوتا

۳۵

باہر کی دُنیا

۴۳

نیلوفر

۵۳

جنّت نگاہ

۶۰

مجبوری

۷۰

فس ٹیولا

۷۷

کھیلن کو مانگے چاند

۸۵

انگارہ آنکھیں سلگتے ہونٹ

۱۰۹

ماما لوسی پوسی مریا

۱۲۳

ٹوٹے ہوئے لوگ

۱۳۲

وہ دل کہاں سے لاؤں

۱۴۰

ننھے ننھے ہاتھ

۱۵۱

بڈو

۱۶۱

شکار پور سے شکاگو

۱۶۹

نگین شلوم

۱۷۹

کچھ شیر شاہ کی کہانیوں کے بارے میں

۱۸۸

کراچی کے بارے میں اور جانوروں کے بارے میں بیش بہا معلومات فراہم کیں اور جانوروں پر رحم کرنا اور انھیں اپنے جیسا ہی سمجھنا سکھایا۔

شکر گزار ہوں مرحوم امیر علی ہود بائی کا جنھوں نے کراچی کے ایک پرانے درخت کو بلڈرز مافیا سے بچانے کے لیے مہم چلائی اور ناکام رہے۔ اس مہم کے دوران انھوں نے اپنے بچپن کے ہرے بھرے کراچی کی تصویر کئی بار دکھائی، خود بھی آب دیدہ ہوئے، مجھے بھی رلایا۔ نہ وہ اس درخت کو بچا سکے اور نہ میں کچھ کر سکا آہستہ آہستہ محمد علی جناح روڈ اور پرانے شہر کے دو دو سو برس پرانے درخت ایک منظم مافیا کے تحت مسلسل ختم کیے جا رہے ہیں۔

شکر گزار ہوں محترم ضمیر نیازی کا جنھوں نے میری پہلی کتاب "دل کی وہی تنہائی" کی تعارفی تقریب میں شدید علالت کے باوجود شرکت کی اور اس کے بعد بھی وہ ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

شکر گزار ہوں ایک بار پھر جناب آصف فرخی کا جنھوں نے قیمتی وقت صرف کر کے اس کتاب کا مسودہ پڑھا اور اسے قابلِ اشاعت بنایا۔ ڈاکٹر حبیب الرحمٰن سومرو کا جن کے مشوروں سے کہانیاں بہتر ہو سکیں۔

شکر گزار ہوں فضلی سنز کے طارق رحمٰن کا جن کی ذاتی توجہ اور محنت سے حسن و خوبی کے ساتھ کتاب کی بروقت اشاعت ممکن ہوئی۔

تمام دوست احباب کا جنھوں نے میری حوصلہ افزائی میں کبھی بھی بخل سے کام نہیں لیا اور جن کا تعاون ہر لحظہ شاملِ حال رہا۔

اور شکر گزار ہوں اپنی اماں اور ابا کا اور عزیز بھائی بہنوں سمیت تمام اہلِ خانہ کا اور شریکِ زندگی طیبہ فاطمہ کا جنھوں نے میرے ہر کام، ہر شوق اور ہر دیوانگی میں، ہر ممکن طریقے سے ساتھ دیا۔ میری مدد کی، میری کوتاہیوں پر درگزر سے کام لیا اور جن کی پشت پناہی سے ناممکنات، ممکن بنتے چلتے گئے۔

ڈاکٹر شیر شاہ سید

آگرے کے ماسٹر صاحب

گھر میں احمد کا داخلہ اس دن سے بند ہو گیا تھا جس دن اس نے لوگوں کو جمع کر کے بھڑکایا اور پنجابیوں کے گھر میں آگ لگوائی تھی۔ ماسٹر صاحب تو بہت سیدھے آدمی تھے نہ کسی کے لینے میں نہ کسی کے دینے میں۔ لانبا سا قد دبلے پتلے انسان۔ اردو ایسے بولتے تھے جیسے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔ ہر جملہ صاف' بغیر کسی غلطی کے۔

وہ آگرے سے آئے تھے۔ جب اپنے لٹے پٹے خاندان کے ساتھ کراچی پہنچے تھے تو صرف دس جماعتیں پڑھی ہوئی تھیں انھوں نے۔

جیسے ہی آگرے میں ہندو مسلم فساد ہوئے ان کے خاندان والوں نے پاکستان آنے کی تیاری شروع کردی۔ ایک رات بلوائیوں نے حملہ کردیا تھا۔ خوب مارا کاٹی ہوئی تھی۔ پولیس اور فوج کے آتے آتے وہ اپنے ابا جان کو گنوا چکے تھے۔ شروع میں تو بہن کا کچھ پتا ہی نہیں لگا۔ جب چچا نے باپ کی کٹی ہوئی لاش کو چادر سے ڈھانپ دیا اور سلمٰی کی تلاش شروع ہوئی۔ تب سب کی سمجھ میں آگیا تھا کہ اسے بلوائی اٹھا کرلے گئے۔ انھیں ابھی تک یاد تھا کہ امی جان پر کیسا غم پڑا تھا وہ رو رو کر دعا کرتی رہی تھیں کہ "اللہ' مولا رسول کے واسطے' انبیا کے واسطے سلمٰی کی جان لے لینا' کسی کے ہاتھوں مروا دینا مگر کسی ہندو گھر میں نوکرانی بن کر یا رکھیل ہو کر نہ رکھوانا۔" ابا جی کو دفنانے کے چند ہی دن بعد جب پاکستان جانے کو قافلہ تیار تھا تو چچا جان کے دوست رام لعل کے ساتھ سلمٰی بھی آئی تھی۔ ساتھ میں پولیس تھی اور فوج کے ہرکارے۔ وہ اپنی ماں سے لپٹ کر بلک بلک کر تڑپ تڑپ کر روئی تھی۔

اس نے بتایا تھا کہ جب بلوائی اسے لے کر بھاگ رہے تھے تو رام لعل نے دیکھ لیا تھا۔ پہچان لیا تھا اور تھوڑی سی جھڑپ اور ڈانٹ ڈپٹ کے بعد اپنے گھر لے گئے تھے۔ بڑی خاطر کی تھی۔ رات باپ ماں اور بیٹے نے حفاظت کی تھی۔

ہندو محلہ تھا رام لعل پر بہت زور ڈالا گیا تھا کہ مسلمان لڑکی کو بلوائیوں کے حوالے کرو مگر

رام لعل نے سمجھا دیا تھا کہ گھر میں ویسے بھی نوکرانی کی ضرورت ہے۔ اسے نوکرانی بنا کر رکھ لیں گے۔

کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یکایک ہوا کیا ہے۔ ابھی تو سب ٹھیک تھا۔ تاج محل کے سائے میں ہندو مسلمان سب اکٹھے کھیلتے تھے' لڑتے تھے اور اکٹھے رہتے تھے۔ مسلمان پاکستان مانگ ضرور رہے تھے مگر کسی نے بھی نہیں کہا تھا آگرہ اور تاج محل چھوڑ کر پاکستان چلے جائیں گے۔ پاکستان بن جائے گا' جہاں بنے گا وہاں قائد اعظم کی حکومت ہوگی اور وہاں کے مسلمان چین سے رہیں گے۔ وہاں پر ہندو بھی رہیں گے مگر ملک اسلام کا ہوگا۔ جہاں ہندو ہوں گے وہاں گاندھی اور نہرو کی حکومت ہوگی اور مسلمان بھی ویسے ہی رہیں گے جیسے رہ رہے ہیں۔ اور ابھی سے تھوڑی رہ رہے ہیں۔ سالوں مہینوں کا تھوڑا ہی ساتھ ہے' صدیوں کا ساتھ ہے۔ خاندانوں کی ایک دوسرے سے کئی کئی سالوں کی شناسائی ہے۔

یہ ساری بحث تو روز ہوتی تھی اور روز ہی سب 'پیٹھا' دال موٹھ کھا کر اور چائے پی کر سو جایا کرتے تھے۔ نہ کسی نے سوچا تھا نہ ہی کسی نے تیاری کی تھی کہ پاکستان جانا پڑے گا۔ اپنی گلیاں' محلے' اپنے گھر' مکان' دالان' دریچے' آگرہ' تاج محل سب کچھ چھوڑ کر ایک مسافر کی طرح بن ہارے ہوئے بھگوڑوں کی طرح سر جھکا کر' شہر کو چھوڑنا پڑے گا۔

ان کی عمر اس وقت سترہ یا اٹھارہ سال تھی اور انھیں سب کچھ یاد تھا۔ ذرا ذرا اور بال بال۔ سلمٰی کو امی نے گلے سے لگایا تھا اور رام لعل کے لیے ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعا کی تھی۔ آنکھوں میں گنگا جمنا کی وہ برسات انھوں نے پھر کبھی بھی نہیں دیکھی تھی۔

رام لعل نے بہت سمجھایا تھا مگر چچا جان اور برادری فیصلہ کر چکی تھی کہ اب یہاں نہیں رہنا ہے۔ انھیں یاد تھا کہ رام لعل نے چچا جان سے کہا تھا "توفیق' وقت بدل جائے گا ایک دفعہ گورے چلے جائیں گے اور ان سیاست دانوں کو حکومت مل جائے گی تو پھر یہ لوگ حکومت میں لگ جائیں گے' جیسے گوروں کی حکومت رہی ہے' ویسے ہی ان کی حکومت ہوگی۔ کیوں جاتے ہو اپنے دروازوں کو چھوڑ کر اور رشتوں کو توڑ کر۔" وہ سب کو اپنے دوستوں کے ساتھ اسٹیشن تک چھوڑنے آیا تھا۔

راستے بھر سمجھاتا رہا' معافی مانگتا رہا مگر چچا ابو نے فیصلہ کر لیا تھا۔ بھائی کی موت کے بعد اب ان کا دل آگرے سے اٹھ گیا تھا۔ چاندنی رات کا چاند' تاج محل کی اجلی' چمک دار' بلند و بالا' پرکشش' مغرور عمارت کی محبت' آگرہ کی گلیوں کی مٹی' دریا کا کنارا' مائی کی منڈی' سوئی کا کٹرہ' ہسپتال روڈ' نمک کی منڈی' کشمیر بازار اور ڈولی کہار ان سب سے ان کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔ وہ اٹل

فیصلہ کر چکے تھے۔ دوستوں کی محبت اور جگہوں کا حسن کچھ بھی انھیں روک نہیں سکا تھا۔

کراچی پہنچ کر ان لوگوں نے آگرہ تاج کالونی میں اپنی جھگیاں ڈال لی تھیں۔ ٹینری روڈ اور مسان روڈ کے درمیان بہار کالونی بھی تھی اور بہار سے آئے ہوئے بہاری مسان کا ٹھکانہ بن گئی تھی۔ مسان روڈ اور ماری پور روڈ کے درمیان آگرہ تاج کالونی بنادی گئی تھی۔ دونوں کالونیوں کے ساتھ ساتھ لیاری ندی بہتی تھی۔

چچا جان نے دو جھگیوں میں گھر بنایا تھا۔ ایک دروازے کے ساتھ دو حصے' ایک میں چچا جان' چچی جان' نصیر' شائستہ' احسن اور مجید تھے اور دوسرے میں وہ ان کی امی' سلمٰی اور رضوان کا گھر بنا تھا۔ ان کے چچا بھی ان کی ہی طرح شریف تھے۔ نہ کوئی جھوٹا کلیم کیا اور نہ کسی ہندو کے مکان دکان مندر پر قبضہ۔ ساتھ میں آنے والے جو ان لوگوں ہی کی طرح کے لوگ تھے انھوں نے کلیم کرکے بڑی بڑی جائیدادیں حاصل کرلیں۔ کوئی زمین دار بن کر حیدر آباد' نواب شاہ' ٹھٹھہ اور ٹنڈو محمد خان چلاگیا اور کسی نے کراچی میں ہی ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی دکانوں پر قبضہ جماکر کام شروع کر دیا۔ ان لوگوں سے بھی بہت سوں نے کہا مگر جو پشتینی شریف تھے' جن کے خاندان میں کسی نے کبھی بھی کوئی برا کام نہیں کیا تھا' وہ جعلی کلیم کیسے داخل کرسکتے تھے۔ ان کے چچا جان کو اس بات کا بڑا مان تھا۔ مرتے دم تک وہ فخریہ کہتے تھے میں نے زندگی میں جھوٹ نہیں بولا' تکلیفیں اٹھائیں' بھیک نہیں مانگی اور بھائی جو مجھے اولاد سے بھی پیارا تھا اس کے قاتلوں کو معاف کردیا۔ ساتھ کے لوگوں نے اگر جھوٹ بول کر محل بنالیے ہیں تو کیا ہے' میرا دل صاف ہے اور میرا خدا میرے ساتھ۔

ان لوگوں نے بڑی محنت کی تھی۔ سارا خاندان کام پر لگ گیا تھا انھوں نے میٹرک اور آئی اے پاس کرنے کے بعد اسکول میں پڑھانا شروع کردیا تھا۔ چچا جان کو لی مارکیٹ میں ایک چائے کی کمپنی میں نوکری مل گئی تھی۔ چچا جان کے بڑے بیٹے نے بھی نوکری شروع کردی۔ آنے کے تھوڑے دنوں کے بعد ہی نصیر کی شادی سلمٰی سے ہوگئی تھی۔ یہی ان کے مرحوم ابو کی خواہش تھی اور نہ جانے چچا جان کو اس خواہش کو پورا کرنے کی اتنی جلدی کیوں تھی۔

پاکستان کیسے چل رہا تھا اس کا اندازہ تو کسی کو نہیں تھا' ان کے چچا کو سیاست سی دلچسپی تھی مگر اتنی ہی کہ روز آل انڈیا ریڈیو اور بی بی سی کی خبریں سن کر اپنی طرف سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ وقت گزر رہا تھا اور وقت کے ساتھ عمریں بڑھ رہی تھیں۔ پھر ایک دن چچا جان اور ان کی امی نے فیصلہ کیا تھا کہ ان کی شادی شائستہ سے کردی جائے۔ یہ ایوب خان کے فوجی انقلاب سے پہلے کی بات ہے۔

وہ اور شائستہ بھی دل سے یہی چاہتے تھے۔ بچپن ساتھ کھیل کر گزارا تھا۔ دل ہی دل میں ایک دوسرے کے لیے نہ جانے کون کون سے جذبات لے کر گھوم رہے تھے۔ سارا خاندان ہی خوش تھا، خاندان کی ایک اور شادی پر۔

شادی کے تھوڑے دنوں بعد ہی ایک حادثہ ہوگیا۔ ان کے چچا جان اچھے بھلے گھر لوٹے تھے کہ سخت جاڑے کے بعد بخار چڑھا۔ سول ہسپتال جاکر دکھایا بھی تھا مگر نہ جانے کیا ہوا کہ تین دن میں ہی انھوں نے دم توڑ دیا۔ یہ غم سب پر بھاری تھا۔ وہ تو خاندان کے اور برادری کے سب کچھ تھے۔ ابھی اس غم سے نکل بھی نہیں پائے تھے کہ نصیر کے بڑے بیٹے کو کتے نے کاٹ لیا۔ گھر میں تو کسی کو پتا بھی نہیں چلا تھا۔ وہ محلے کا آوارہ کتا تھا اور بچہ باہر کھیل رہا تھا کہ وہ کاٹ کر بھاگ گیا تھا۔ گھر میں ہی زخم کی صفائی کرکے مرہم پٹی کردی گئی تھی مگر تھوڑے دنوں بعد اس پر دورے پڑنے لگے تھے اور وہ چیختا چلاتا ہوا ماں، باپ، دادی، نانی کو بلکتا ہوا چھوڑ کر مرگیا۔

ان کی ماں اور ان کی چچی دونوں کے لیے یہ زخم بہت گہرا تھا۔ وہ سوچتے تھے کہ انسان اتنا بے وقعت ہے کہ ایک کتا اس کی جان لے لے۔ ملیریا کا مچھر تمام رشتے ناتوں کے درمیان آکر باپ، ماں، بھائی، چچا، بیوی بچے چھین لے۔ زندگی اتنی سستی ہے۔ شاید غریبوں کی زندگی اتنی سستی ہے اس کا اندازہ انھیں پاکستان میں اچھے طریقے سے ہوگیا تھا۔ سرحد کے دونوں طرف ہزاروں، لاکھوں لوگوں کے مرنے کے بعد ان لوگوں نے سوچا تھا کہ نئے ملک میں غریبوں کی تو عزت ہوگی، انھیں تو کوئی مقام ملے گا مگر یہ سب ہی کچھ جھوٹ نکلا تھا۔ غریب، غریب سے غریب تر ہوتا جارہا تھا۔ امیر کو نہ جانے کیا کچھ مزید اور مزید تر ملتا جارہا تھا۔ عزت ایمانداری، شرافت، محنت، دیانت، عظمت کے یہ سارے الفاظ کتابوں میں دھندلاتے جارہے تھے۔ ان لوگوں کی نظر کے سامنے ہندوستان سے آئے ہوئے گنواروں اور بدمعاشوں نے بہت کچھ جعلی طریقوں اور کلیموں سے حاصل کرلیا تھا اور پڑھے لکھے سمجھ دار لوگ جوتیاں چٹخارہے تھے۔

پھر حکومت نے لیاری ندی میں سیلاب کے بعد آگرہ تاج کالونی کو توڑنے کا فیصلہ کیا تھا، بل ڈوزروں نے مکان گرانے شروع کیے تھے اور کھوکھراپار کالونی، سعود آباد اور ڈرگ کالونی کے اسی اسی گز کے پلاٹوں میں خاندانوں کو پہنچا دیا گیا تھا۔

وہ لوگ شاہ فیصل کالونی آگئے تھے۔ یہ جگہ انھیں آگرہ تاج کالونی سے زیادہ اچھی لگی تھی۔ نہ سمندر کی سیلن تھی، نہ لیاری کی بدبو، ایک ایک کمرے کے مکان تھے، لمبی لمبی گلیاں تھیں اور مکان کے درمیان میں گندی گلی، گلی کے نکڑ پر نل تھا جس میں پانی بھی خوب آتا تھا۔ شروع میں بجلی نہیں تھی مگر تھوڑے دنوں میں ہی لوگوں کو کنکشن ملنے شروع ہوگئے۔ آبادی کے چاروں

طرف کھلے میدان تھے۔ لیاری کی طرح شہر سے قریب نہیں تھے مگر آہستہ آہستہ ڈرگ کالونی میں ہی سب کچھ بنتا چلا گیا تھا۔

تھوڑے دنوں تو وہ شہر جاتے رہے مگر بعد میں ان کو بھی ڈرگ کالونی کے گورنمنٹ اسکول میں نوکری مل گئی۔ ڈرگ کالونی میں ہی احمد بھی پیدا ہوا تھا' ان کی اور شائستہ کی پہلی اولاد۔ پھر یکے بعد دیگرے چھ بچے ہوئے' پانچ لڑکیاں اور ایک لڑکا احمد۔ اسی طرح سے ڈرگ کالونی کی آبادی بھی بڑھتی رہی تھی۔ وہ اسی طرح سے اسکول میں پڑھاتے رہے تھے اپنے حالات میں مگن' صابر و شاکر۔ نصیر کا ایک چھوٹا بھائی سعودی عرب میں تھا اور دوسرا بھائی ابو ظہبی میں رہ رہا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی رضوان کا داخلہ این ای ڈی میں تو نہیں ہوسکا تھا مگر اس نے گورنمنٹ پولی ٹیکنک سے ڈپلومہ لیا تھا جس کے بعد وہ بھی سعودی عرب چلا گیا تھا۔ پھر یکایک اس کا خط امریکا سے آیا تھا جہاں وہ کسی اسٹیٹ کیرولینا میں رہ رہا تھا۔ وہ ایک دفعہ بھی پاکستان نہیں آیا تھا۔ کبھی کبھار کوئی خط یا کوئی تصویر آجاتی تھی۔ اس نے امریکا میں ہی کسی لڑکی سے شادی کرلی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہاں وہ خود بھی پڑھا رہے تھے وہاں بچے بھی پڑھ رہے تھے۔ زندگی کے گزرنے کا احساس کسی کو نہیں ہوتا۔ وقت گزرتا رہتا ہے' اپنی رفتار کے ساتھ جس میں سوئی کی ٹک ٹک سنائی دیتی ہے نہ گھنٹوں کا دن بننا اور دنوں کا ہفتہ ہونا اور ہفتوں کا مہینوں اور سال میں ڈھل جانا' عید' بقر عید' آزادی کا دن سب گزر جاتے ہیں' انسان اس وقت چونکتا ہے جب دھماکا ہوتا ہے۔ وہ بھی نہیں چونکے تھے جب احمد نے میٹرک پاس کیا تھا اسکول میں پڑھنے والا تو میٹرک پاس کرتا ہی ہے۔ اس وقت بھی انھیں کچھ احساس نہیں ہوا تھا جب اس نے بی ایس سی کرکے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ ان کا خیال تھا اگر انجینئرنگ کالج میں داخلہ نہیں ہوگا تو یونیورسٹی میں داخلہ مل ہی جائے گا۔ انھیں نہیں پتا تھا کہ انجینئرنگ کالج میں داخلے دوسرے طریقے سے بھی ہوتے ہیں۔ وہ تو محنت کر رہے تھے۔ دن رات اسکول میں' اس کے بعد ٹیوشن' صرف اس لیے کے انھوں نے اپنے بزرگوں سے یہی سیکھا تھا' ایمانداری' محنت اور محبت۔

انھیں تو وقت گزرنے کا احساس اس وقت ہوا تھا جب احمد کو ایم ایس سی کرنے کے باوجود نوکری نہیں ملی۔ نہ پی آئی اے میں' نہ ہی کے ڈی اے میں' جس جگہ انٹرویو دیا تھا ناکام ہوگیا۔ جہاں کام کرنے کی کوشش کی تھی وہاں سے جواب مل گیا تھا۔ جہاں نوکری ملی وہاں احمد کو کام کرنے کا شوق نہیں تھا۔ پھر انھوں نے دھماکے کو محسوس کیا تھا' اس دھماکے کو جس میں ایک نیا احمد دھیرے دھیرے چپکے چپکے آہستہ آہستہ نکل رہا تھا۔ غصے سے بھرا ہوا' جس کے معصوم چہرے پر پتلی پتلی نفرت کی لکیریں جمع ہوکر موٹی موٹی تحریروں میں بدل گئی تھیں۔

اس کی نفرت کا ان کے پاس جواب نہیں تھا۔ وہ پوچھتا تھا کہ کیوں بنایا تھا پاکستان؟ کیوں جان دی تھی آپ کے والد نے؟ اس لیے کہ آپ کا باپ جیسا چچا ملیریا سے مرجائے؟ اس لیے کہ آپ کا بھائی نوکری نہ ملے تو ملک چھوڑ جائے؟ اس لیے کہ آپ کے بیٹے کو کراچی کے انجینئرنگ کالج میں اس لیے داخلہ نہیں ملے کہ اس کے پاس کراچی کا ڈومیسائل اور پی آر سی ہے' چاہے نمبر کتنے بھی اچھے ہوں اور آپ کی بیٹی سندھ اور ڈاؤ میڈیکل کالج کے بجائے نواب شاہ میں پڑھے کیوں کہ وہ سکھر یا لاڑکانہ کی نہیں ہے۔

وہ ان سوالوں کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔ اسی وقت انھیں احساس ہوا تھا کہ وقت کافی گزر گیا ہے۔ پلوں کے نیچے سے پانی اتنا گزرا ہے کہ نفرتوں کے سمندر بن گئے ہیں۔

انھوں نے احمد کو سمجھایا تھا "مگر احمد' جو بھی ہے اس کا حل یہ تو نہیں ہے کہ ہم نفرت کرنا شروع کردیں۔ پنجابیوں سے' سندھیوں سے' ہر ایک سے۔"

"پھر کس سے نفرت کریں؟" احمد نے بڑے کٹے ہوئے انداز میں کہا تھا۔ "پی آئی اے میں پنجابی کام کرتے ہیں اور سندھ سیکریٹریٹ میں سندھی ہوتے ہیں۔ نفرت اس سے ہی کی جاتی ہے جو آپ کے حق پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔ جہاں ہم لوگ جاتے ہیں وہاں پر یہ لوگ پہلے سے اپنی برادری' اپنے گاؤں' اپنے گوٹھ سے لوگوں کو بلا کر رکھتے ہیں' پھر آپ یہ کہتے ہیں کہ ان سے نفرت نہ کرو' یہ ساری باتیں کتابوں کی باتیں ہیں۔ اسکول میں پڑھانے کی باتیں ہیں' ان کا حقیقی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ پاکستان کتابوں میں ہوگا۔ علامہ اقبال اور قائد اعظم کی قبروں میں ہوگا' یہاں پر کوئی پاکستان نہیں ہے' حقیقی زندگی میں پنجاب انٹرنیشنل ایئر لائنز ہے' پنجاب آرمی ہے' پنجاب پولیس ہے اور جب تک اس طرح سے رہے گا' مہاجروں کو ان کا حق نہیں ملے گا۔"

احمد کا چہرہ غصے سے سرخ اور غضب ناک ہوگیا تھا۔

"مگر احمد' اس نفرت سے نوکری تو نہیں ملے گی اور آخر کار نقصان کس کا ہوگا؟ ان کا ہی ہوگا جو تعلیم چھوڑ دیں گے۔ تم کو سرکاری نوکری ہی کی کیوں تلاش ہے اور بھی تو نوکریاں ہیں' اور بھی تو لوگ ہیں۔ اس شہر میں رہنے والے عیسائی' پارسی' میمن یہ لوگ تو سرکاری نوکری کے پیچھے نہیں بھاگتے مگر رہ رہے ہیں نفرت کیے بغیر۔"

احمد بڑی نفرت سے مسکرایا' "مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسی بات کرتے ہیں آپ' آپ کی ٹیچری اور تعلیم نے آپ کو کیا دیا ہے۔ ایک چھوٹا سا گھر' دن رات کی محنت؟ میں نے بھی ٹیوشن پڑھا پڑھا کر اپنا خرچ پورا کیا ہے۔ میری پانچ بہنوں کی شادی کے لیے تھوڑی سی رقم بھی امی جان کے پاس نہیں ہے اور آپ اپنی شرافت اور محنت کی راگنی الاپ رہے ہیں۔ شرافت کے اس

ریکارڈ سے دنیا نہیں بدلتی ہے ابا جان۔ میں نے سوچا تھا کہ مجھے اچھی سی نوکری مل جائے گی تو میں آپ کا ہاتھ بٹاؤں گا۔ گھر کو تھوڑا بنالوں گا' بہنوں کی شادی کرادوں گا مگر روز بروز ایک گھن چکر کی چرخی میں گھومتا جارہا ہوں۔ مسائل ہیں کہ بڑھتے جارہے ہیں۔ نہ نوکری ملتی ہے اور جو رشتہ آتا ہے اس کے ساتھ جہیز کی فرمائش اور چار سو پانچ سو آدمیوں کے کھانے کی بات ہوتی ہے۔ ایک ماسٹر کی بیٹی سے شادی کون کرتا ہے اور آپ مجھے نفرت نہ کرنے کی تلقین فرما رہے ہیں۔"

"احمد' جہیز کی فرمائش اور کھانے کا اصرار تو ہماری اپنی برادری والے کرتے ہیں۔ یہ سندھی اور پنجابیوں نے تو نہیں سکھایا ہے۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے' علیٰحدہ بات ہے۔"

"نہیں کوئی الگ مسئلہ نہیں ہے اور نہ کوئی علیٰحدہ بات۔" احمد نے بڑی جھنجلاہٹ سے اپنی بات کہی تھی۔ "ساری بات ایک ہے اس برادری اور ان لوگوں کا مسئلہ ہے۔ پاکستان کے جھنڈے کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں اور پاکستان میں جو مسئلے ہیں اس کو سمجھتے ہیں۔ آپ کی مسلم لیگ اور آپ کی جماعت اسلامی کے لوگ اپنے بچوں کی شادیاں جس طرح سے کرتے ہیں وہ بھی آپ کو پتا ہے اور آپ نے دیکھا ہے۔ آپ اور آپ جیسے لوگ کبھی بھی نہیں سمجھیں گے نہ سمجھیں گے نہ بدلیں گے۔ حالات بدل گئے ہیں۔ پاکستان اب نہیں رہا ہے۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن چکا ہے اور اب سندھی ہیں' بلوچی ہیں' پٹھان ہیں' پنجابی ہیں' ہم لوگ کہیں بھی نہیں اور کوئی بھی ہمارا نہیں ہے اور ہم لوگوں کو خوب بے وقوف بنایا گیا ہے۔ کبھی اسلام کے نام پر اور کبھی پاکستان کے نام پر۔ یہ سب کچھ نہیں چلے گا۔"

وہ کیا کہتے' کیا جواب دیتے۔ کیا سمجھاتے' سوال سب تھے اور جواب صرف ایک۔ انھوں نے آگرہ میں ہی سیکھا تھا ایمان داری کا سبق' محنت اور ہر ایک سے محبت اور ہر کوئی ان سے محبت ہی کرتا تھا۔ مجھے بھی ان سے ایسی ہی محبت ہوگئی تھی جیسے کسی استاد سے کسی شاگرد کو ہوتی ہے۔ میری پوری کلاس میرے سے پہلے کے طالب علم اور میرے بعد کے طالب علم ان پر جان دیتے تھے۔ وہ ایسے استاد تھے مگر ان کا اپنا بیٹا احمد ان کی بات نہیں سمجھتا تھا۔ جب ہنگامے شروع ہوئے تھے تو محلے میں پنجابیوں کے گھر کو آگ لگوانے میں احمد سب سے آگے آگے تھا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ احمد نے ہی سب سے پہلے لوگوں کو جمع کرکے بھڑکایا تھا۔ گھروں میں آگ لگنے سے پہلے ہی پنجابی خاندان بھاگ کر گرین ٹاؤن چلے گئے تھے جو کہ پنجابیوں کی بستی تھی۔ جہاں سے اکّے دکّے رہنے والے مہاجر بھاگ کر شاہ فیصل کالونی میں آگئے تھے۔

مگر اس دن کے بعد ماسٹر صاحب نے احمد کا داخلہ گھر میں بند کردیا تھا۔ اس سے نہیں ملے

تھے۔ یہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا غم تھا۔ اسے وہ اپنی ناکامی سمجھتے تھے۔ میں اکثر ان سے ملنے چلا جایا کرتا تھا۔ ان کے گھر کے اس چھوٹے سے کمرے میں ان کی چارپائی کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ کر گھنٹوں ان کی بات سنا کرتا تھا مگر احمد والے واقعے کے بعد سے آہستہ آہستہ جیسے انھوں نے اپنی توانائی گنوا دی تھی۔

احمد محلے میں ہی ایک اور گھر پر رہتا تھا۔ اس نے وڈیو کی دکان کھول لی تھی اور اس کا کام بہت اچھا چل رہا تھا۔ ماسٹر صاحب کی غیر موجودگی میں جب وہ اسکول میں ہوتے تھے تو اپنی ماں اور بہنوں سے ملنے آتا تھا جس کی خبر ماسٹر صاحب کو نہیں ہوتی تھی۔ مگر آہستہ آہستہ انھیں بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ احمد کا گھر میں آنا جانا ہے۔ انھوں نے احمد کی ماں کو سمجھایا تھا تو انھیں یہی جواب ملا تھا کہ احمد نہیں آتا ہے۔ وہ اندر سے جیسے ٹوٹ سے گئے تھے۔

اس روز ماسٹر صاحب کے کمرے میں ان کی چارپائی کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔ وہ سخت بیمار تھے۔ ان کی دھنسی ہوئی آنکھیں، ان کے چہرے کا کرب، ان کی بے قراری کہہ رہی تھی کہ اب وہ نہیں بچیں گے۔ میں نے ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا تھا۔ ان کی ذیابیطس، پھر دل کی پرانی بیماری اور دن رات کی ان تھک محنت اپنا پورا حساب مانگ رہی تھی۔ کچھ دواؤں کا انتظام میں چند ڈاکٹر دوستوں کی مدد سے کرتا رہا تھا اور کچھ وہ خود خریدتے رہے تھے۔ انھوں نے علاج معالجے کے لیے احمد کی طرف سے آنے والی رقم کی مدد لینے سے منع کر دیا تھا۔ آخر کی اس گھڑی میں انھوں نے اپنی بیوی شائستہ کو بلایا تھا۔ وہ پریشان صورت میرے سامنے بستر پر بیٹھی دھیرے دھیرے رو رہی تھیں۔

ماسٹر صاحب نے شائستہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا۔ ''شائستہ میرا وقت آگیا ہے۔ اب میں نہیں بچ سکتا ہوں۔ میں نے زندگی بھر سچ اور محنت کی تبلیغ کی ہے، خدا اور میرے بزرگوں کی روحیں گواہ ہیں اور تم گواہ ہو۔ مجھ سے وعدہ کرو میرے بعد بھی احمد اس گھر میں نہیں آئے گا۔ میری صورت نہیں دیکھے گا۔ میں نے اس کے لیے صرف دعا کی ہے اور اب بھی دعا کرتا ہوں یا رب اس کے دل سے نفرت نکال دے۔ نفرت نکال دے۔ نفرت نکال دے۔''

مجھے ایسا لگا کہ ان کی سانس پھول گئی ہے مگر وہ خاموشی سے رخصت ہو گئے۔ میں نے سفید چادر سے ان کے جنازے کو ڈھک دیا تھا اور روتی ہوئی ماسٹر صاحب کی بیوی کو چھوڑا، تجہیز و تکفین کے لیے مسجد جا کر خبر کی تھی پھر علاقہ کے پی سی او سے ماسٹر صاحب کے شاگردوں کو فون کرنے چلا گیا تھا۔

دو گھنٹے بعد جب میں واپس آیا تھا تو میں نے دیکھا تھا ماسٹر صاحب کے گھر کے سامنے ایک

بڑا سا شامیانہ لگا ہوا تھا۔ ایک طرف خواتین اور دوسری جانب مرد قرآن خوانی کر رہے تھے۔ اندر جیسے سکوت کا عالم تھا۔ کبھی کبھی ماسٹر صاحب کی چھوٹی بیٹی کے رونے کی آواز آتی تھی۔ آنے والوں میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ ان سب میں احمد اپنے موبائل فون کے ساتھ بہت نمایاں تھا لوگوں سے ملنے میں۔ انھیں بٹھانے میں اور ان سے پرساوصول کرنے میں۔

ماسٹر صاحب کی آخری خواہش شیشے کی طرح چکنا چور ہو کر بکھر گئی تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ تعصب اور سوگ کب تک ایک ہی شامیانے تلے رہیں گے۔
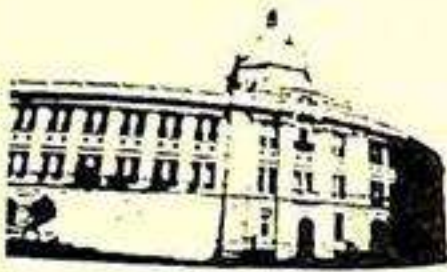
ٹھنڈا پانی

جوڑیا بازار میں دریا لال اسٹریٹ کے بعد بھگوان داس بلڈنگ میں نظامانی صاحب رہتے تھے۔
بہت دوستی تھی ہماری نظامانی صاحب کے خاندان سے۔ وہ سانگھڑ کے رہنے والے تھے اور نہ
جانے کب سے کراچی میں رہ رہے تھے۔ جب سانگھڑ سے ان کا خاندان کراچی آیا تو شروع میں
آکر کھارادر میں رہنے لگا تھا۔ میمن مسجد کے پیچھے بمبئی بازار کے بعد کھارادر کی پرانی بلڈنگوں میں
سے ایک بلڈنگ میں نظامانی لوگوں کے بھی گھر تھے۔ انھیں میں انھوں نے زندگی شروع کی تھی۔
کسی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ انھوں نے سانگھڑ کیوں چھوڑا۔ خاندان کے لوگ ابھی بھی
سانگھڑ میں رہتے تھے۔ ان کے باپ اور ماں کی قبریں وہیں تھیں۔ ابھی بھی بھائی وہاں رہتے تھے'
ایک بہن بھی سانگھڑ میں رہتی تھی۔ ہمارے اباجی نے بھی ایک دن پوچھا تھا مگر نظامانی چاچا بات
ٹال گئے تھے۔ کوئی بات تھی ایسی کہ وہ سانگھڑ کی بات کرنا نہیں چاہتے تھے۔ شاید زمینوں کا کوئی
مسئلہ ہوگا۔ شاید باپ کے مرنے کے بعد دولت کے بٹوارے کے مسئلے پر بھائیوں سے کوئی رنجش
ہوگئی ہوگی یا پھر کسی عورت کا چکر ہوگا۔ موہنجوڈارو کے زمانے سے آج تک زن زر زمین کے
چکر نے انسانوں کو چکر میں رکھا ہے۔ یہ میرے اباجی کا خیال تھا مگر وہ نظامانی صاحب سے پوچھ
نہیں سکتے تھے۔ ان کے بڑے احسانات تھے ہمارے خاندان پر۔ اباجی نے مرتے وقت بھی یہی کہا
تھا بیٹے نظامانی صاحب کا خیال رکھنا' بڑے بُرے وقت پر کام آئے تھے ہمارے۔
وہ بُرا ہی وقت تھا۔ ابا جان نے جب الٰہ آباد چھوڑا تھا تو آسانی سے نہیں چھوڑا تھا۔ کون
چھوڑتا ہے اپنے پرکھوں کی جگہ کو۔ جہاں آباواجداد کے قبرستان ہوں' جہاں بچپن گزرا ہو' جہاں
جوانی کے نازک لمحے جوانی کے برسوں میں بدلے ہوں۔ وہ پاکستان آکر بھی الٰہ آباد کو نہیں
بھولے تھے۔ میں کبھی بھی الٰہ آباد نہیں گیا تھا مگر مجھے الٰہ آباد کی باتیں اس طرح سے یاد ہیں جیسے
ان گلیوں میں خود گھوما ہوں۔
ابا جان کو جاسوسی ناولوں سے کبھی بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر ہمارے گھر میں ابنِ صفی کی

عمران سیریز اور جاسوسی دنیا پابندی سے صرف اس لیے آتی تھی کہ ابنِ صفی الٰہ آباد کے رہنے والے تھے۔ جواہر لعل نہرو کا سارا خاندان ابا جان کی نظر میں مسلمان دشمن اور پاکستان دشمن تھا، مگر اچھی بات صرف یہی تھی کہ ان کا تعلق الٰہ آباد سے تھا۔

پاکستان بننے کے بعد جب لُٹی پٹی ٹرین ہم بچوں کے ساتھ اباجی کو لے کر کراچی پہنچی تھی تو ہمارے پاس کچھ نہیں تھا۔ ٹوٹے ہوئے صندوقوں میں تھوڑے بہت کپڑے، ہم بہن بھائی، اماں بی، خالہ جان اور ابا جان۔ کچھ پتا نہیں تھا کہاں جائیں گے، کدھر رہیں گے، کیا کریں گے؟ ابا جان بتاتے ہیں بڑے خراب دن تھے وہ اور کراچی تو الٰہ آباد کے مقابلے میں صحرا سا تھا۔ صاف ضرور تھا مگر کہاں وہ بات الٰہ آباد کی۔

مہاجر کیمپ میں ہم مہاجروں کے پڑاؤ کے بعد گزرنی شروع ہوئی تھی۔ مہاجر کیمپ کا تو بُرا حال تھا۔ گرمی، چٹائیوں کی چھت۔ میں چھوٹا تھا مگر مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ شروع شروع میں تو آگ لگ جاتی تھی اگر تھوڑی سی بھی بداحتیاطی کی جائے۔ اماں بی نے بڑی محنت کی تھی سرکار کی طرف سے کچھ امداد مل رہی تھی اسی کی بنیاد پر گھر چل رہا تھا۔ ڈھنگ کے چولہے تھے نہ باورچی خانہ نام کی کوئی چیز۔ کبھی لکڑیاں جلا کر کھانا پکتا تھا تو کبھی مٹی کے تیل کے چولہوں سے کام چلایا جاتا تھا۔ ابا جان کو ابھی تک نوکری نہیں ملی تھی، امید تھی، مگر کچھ ہوا نہیں تھا۔

ایسی ہی کسی دوپہر کی دھوپ میں اباجان لی مارکیٹ میں مسجد سے نماز پڑھ کر نکل رہے تھے کہ مسجد کے دالان میں نظامانی صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ ابا جان بتاتے تھے کہ بہت پیار اور عزت و احترام سے نظامانی صاحب نے ان سے بات کی تھی اور باتوں باتوں میں ابا جان نے بتایا تھا کہ وہ مہاجر کیمپ میں خاندان کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ پھر نہ جانے کیا ہوا تھا کہ نظامانی صاحب مہاجر کیمپ آئے تھے۔ گھوڑا گاڑی میں ہمارا سامان لادا گیا تھا اور کھارادر میں ہی مندر سے تھوڑی دور مہندر لال میٹھامل بلڈنگ کی پہلی منزل کے کشادہ فلیٹ میں ہمارا گھر بن گیا۔

جب پاکستان بننے والا ہو گیا تھا تو کھارادر میٹھادر، رام سوامی، برنس روڈ، رتن تلاؤ، جوڑیا بازار، سولجر بازار میں رہنے والے ہندو آہستہ آہستہ شہر چھوڑنے لگے۔ کھارادر میں نظامانی صاحب کی ہر ایک سے ہی دوستی تھی۔ صنوبر لال سے، ارجن کمار سے، کشی کپور سے، مہندر داس سے، کرم چند سے اور نہ جانے کن کن ہندو گھرانوں سے۔ سالہا سال سے وہ لوگ وہاں ساتھ رہ رہے تھے، ساتھ کھا رہے تھے، ساتھ پی رہے تھے۔ چھوٹا شہر تھا، اچھے برے حالات میں زندگی کے سکھ دکھ میں ایسے ہی گزارا ہوتا ہے۔ وہ بھی کہتے تھے کہ پاکستان بننا چاہیے۔ گو یہ تو انھوں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ پاکستان بنے گا تو ہندو کراچی چھوڑ جائیں گے اور ہندوستان کے دوسرے

شہروں سے آگرہ سے الہ آباد' سے پٹنہ سے مسلمان کراچی آئیں گے۔ یہ سب تو ہو گیا تو پھر اندازہ ہوا تھا کہ کیا ہو گیا ہے۔

جب یہ سب ہونا شروع ہوا تھا تو نظامانی صاحب کے ہندو دوستوں نے اپنے اپنے گھروں کو بند کیا تھا۔ موٹے موٹے لوہے کے قفل ڈالے تھے اور چابیاں نظامانی صاحب کو دے دی تھیں کہ گھروں کا خیال رکھیں' اگر حفاظت کر سکیں تو کریں۔ اگر سب کچھ ٹھیک ہو گیا اور ہماری واپسی ہو گئی تو ٹھیک ورنہ جو بھگوان کرے گا اچھا ہی کرے گا۔

بھگوان نے اچھا نہیں کیا تھا۔ شاید اچھا ہی کیا ہو' کون کہہ سکتا ہے۔ کراچی سے اجڑ کے سندھی ہندو دہلی' ہانگ کانگ اور نہ جانے کہاں کہاں چلے گئے تھے۔ لوگ کہتے ہیں سندھیوں کی سب سے بڑی آبادی بمبئی میں رہتی ہے یونائیٹڈ سندھی ایسوسی ایشن کے نام سے ان کی بڑی آرگنائزیشن ہے اور جس طرح سے لالو کھیت میں رہنے والے مہاجر ہر فن مولا ہیں اسی طرح سے یونائیٹڈ سندھی ایسوسی ایشن کی کالونی میں رہنے والے سندھی بھی ہر فن مولا ہیں۔

نظامانی صاحب نے کھارادر کے کئی مکانات جن کی چابیاں ان کے پاس تھیں ایک ایک کر کے ہندوستان سے آنے والے مہاجروں کو دی تھیں بغیر کسی تخفیف کے' صرف ایک شرط لگاتے تھے اور وہ بھی زبانی۔ نہ کوئی لکھت نہ کوئی پڑھت۔ شرط یہ تھی کہ اگر کبھی بھی اس مکان کا ہندو مالک واپس آیا تو مکان خالی کرنا پڑے گا۔ اس وقت تو یہی خیال تھا کہ جب امن و امان ہو جائے گا تو مالکان بھی واپس آجائیں گے۔ تھوڑے دنوں کے لیے بھی اگر چھت مل جائے تو پناہ مل جائے گی' کچھ وقت مل جائے گا' اس عرصے میں ہر کوئی کچھ نہ کچھ کر لے گا۔ نظامانی صاحب نے سارے مکانات مہاجروں کو ہی دے دیے تھے نہ کسی سومرو کو نہ کسی جتوئی کو اور نہ ہی کسی جوکھیو کو اور سچی بات تو یہ ہے کہ کسی ایسے نے مانگا بھی نہیں تھا۔

پھر ابا جان کو کراچی پورٹ ٹرسٹ میں نوکری مل گئی تھی۔ وہ پڑھے لکھے تھے' الہ آباد کے گریجویٹ۔ اس زمانے میں گریجویٹ تھے ہی کتنے۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ میں اچھی نوکری کے ساتھ اچھا سا سرکاری بنگلہ رہنے کو مل گیا تھا۔ اور ہم سب لوگ وہاں چلے گئے تھے۔ ابا جان کہتے تھے کہ اس نوکری کا بھی نظامانی صاحب نے ہی انھیں بتایا تھا اور پورٹ ٹرسٹ میں کام کرنے والے ایک پارسی فریدون کانڈا والا سے ان کی ملاقات کرائی تھی۔ ابا جان مرتے دم تک نظامانی صاحب کا یہ احسان نہیں بھولے تھے۔ نہ صرف یہ کہ نہیں بھولے تھے بلکہ گاہے بگاہے ہم لوگوں کو بتاتے بھی رہتے تھے۔

ہم لوگ نئے بنگلے میں منتقل ہوئے تھے اور نظامانی صاحب جوڑیا بازار میں دریالال اسٹریٹ

بھگوان داس پاکستان سے جاتے جاتے تمام عمارت نظامانی صاحب کے حوالے کر گیا تھا۔ وہ نظامانی صاحب کا پرانا دوست تھا۔ اس نے باضابطہ کارروائی کر کے بلڈنگ ان کے نام کر دی تھی اور طے یہ ہوا تھا کہ جب حالات درست ہو جائیں گے تو نظامانی صاحب سوائے اپنے فلیٹ کے باقی ماندہ فلیٹ بیچ کر رقم بھگوان داس کو بھجوا دیں گے۔ انھوں نے کیا بھی یہی تھا۔ وہ بلڈنگ اچھی جگہ پر واقع تھی۔ آہستہ آہستہ سارے فلیٹ بک گئے تھے اور بھگوان داس کو رقم بمبئی پہنچا دی گئی تھی۔ یہ اتنا مشکل کام نہیں تھا۔ ابھی ہندوستان پاکستان میں تعلقات خراب نہیں ہوئے تھے، جنگ نہیں چھڑی تھی۔ سرحدوں نے زمین کو بانٹ دیا تھا۔ دلوں کو تقسیم کر دیا تھا مگر دل بند نہیں کیے تھے لوگ ابھی بھی ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔

جب ہم لوگ کیماڑی میں کے پی ٹی کے بنگلے میں منتقل ہوئے تھے تو ابا جان نے کھارادر کے مکان کو اچھی طرح سے صاف کرا کر چابی نظامانی صاحب کو دی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ چابی دینے کا کیا فائدہ ہے۔ اب وہ لوگ تو نہیں آئیں گے یہ فلیٹ آپ ہی اپنے پاس رکھیں۔ کے پی ٹی کی سرکاری نوکری ہے اور سرکاری بنگلہ ہے، کل آپ ریٹائر ہوں گے تو کہاں رہیں گے۔

"اللہ کچھ نہ کچھ کرے گا۔ یہ تو آپ کی امانت ہے۔ برے وقت میں بہت کام آئی ہے اب مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اباجی نے ان سے کہا تھا۔ نظامانی صاحب نے چابی نہیں لی تھی بلکہ مشورہ دیا تھا کہ فلیٹ کسی اپنے جاننے والے ضرورت مند کو دے دیں اس وعدے پر کہ جب کبھی ضرورت پڑے گی تو وہ لوگ خالی کر دیں گے۔

ابا جان نے یہی کیا۔ بہار سے آنے والے ایک مہاجر کنبے کو اسی وعدے پر اس فلیٹ میں آباد کر دیا تھا۔ انھوں نے وعدہ بھی کیا تھا اور نظامانی صاحب کے کہنے کے مطابق ایک تحریری معاہدہ بھی کیا تھا مگر جب دو سال کے بعد ابا جان کے ایک چچازاد بھائی کو ضرورت پڑی تھی تو ان لوگوں نے خالی نہیں کیا تھا بلکہ وعدے وعید کرتے رہے تھے اور ایک دن خاموشی سے ایک پنجابی خاندان کو ہزاروں میں بیچ کر چلے گئے تھے۔ اس دن نظامانی صاحب ہمارے گھر پر بیٹھے بہت دیر تک افسوس کرتے رہے تھے۔ انھیں اس بات پر دکھ نہیں تھا کہ فلیٹ پہ قبضہ ہو گیا ہے انھیں اس بات کا دکھ تھا کہ لوگوں کو نہ وعدوں کا پاس ہے نہ اصولوں کا لحاظ ہے۔ انھوں نے اس دن بہت دکھ سے بتایا تھا کہ سوائے اباجی کے سب ہی لوگوں نے فلیٹوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ حقیقت میں تو جو جن فلیٹوں میں رہ رہا تھا وہ اسی کا ہو جانا تھا کہ اب ہندو کہاں واپس آئیں گے مگر لوگوں نے خاموشی سے پیسے کھلا کر جھوٹے سچے کلیم داخل کرا کر فلیٹ اپنے نام

کرالیے ہیں، یہاں تک کہ اخلاقاً" بھی انھیں نہیں بتایا ہے۔ وہ دونوں بہت دیر تک اسی قسم کی
باتیں اور افسوس کرتے رہے تھے۔

وقت نہ تھمتا ہے نہ رکتا ہے۔ کراچی کی آبادی بڑھتی گئی تھی، شہر، شہر سے جنگل بنا گیا
تھا۔ خالہ جان کی شادی ہوگئی تھی۔ بڑے بھائی صاحب کو پاکستانی فوج میں کمیشن مل گیا تھا۔
دوسرے بھائی کو انجینئرنگ کالج میں داخلہ مل گیا تھا اور میں بی کام کر کے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بننے جا
رہا تھا۔ دونوں بہنوں کو میڈیکل کالج میں داخلہ ملا تھا۔ وہ ڈاکٹر بن گئی تھیں۔ ایک کی شادی ڈاکٹر
سے ہی ہوئی تھی اور نارتھ ناظم آباد میں اپنی کلینک چلا رہی تھی۔ دوسری کی شادی اسی کے
کلاس فیلو انجینئر سے ہوئی تھی اور وہ ان کے ساتھ سعودی عرب چلی گئی تھی جہاں دونوں میاں
بیوی کام کر رہے تھے۔

سب کچھ ٹھیک ہی چل رہا تھا۔ والد صاحب ریٹائر ہونے والے ہی تھے کہ ایک دن ان کا
ایکسیڈنٹ ہوگیا اور بڑی تیزی سے انھوں نے زندگی سے موت کا فاصلہ طے کرلیا۔ جناح ہسپتال
پہنچنے تک وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

موت تو ایک یقینی امر ہے۔ جب سے کائنات بنی ہے، دنیا وجود میں آئی ہے، لوگ پیدا ہو
رہے ہیں اور لوگ مرتے بھی رہیں گے۔ مگر ابا جان کی موت کا حادثہ اور یکایک بن دیکھے بغیر بات
کیے مرجانا میرے لیے ناقابلِ فراموش سانحہ ہوگیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ مجھ سے بہت
زیادہ قریب تھے یا میں نے کافی وقت ان کے ساتھ گزارا تھا۔ شروع میں تو میں روزانہ ہی ان
کے قبر پر چلا جایا کرتا تھا، ہر وقت ان کی کمی محسوس ہوتی تھی، لگتا تھا کہ وہ آس پاس موجود ہیں،
ابھی یکایک کہیں سے آجائیں گے اپنے مہربان چہرے کے ساتھ۔ ان کے مرنے کے بعد مجھے
احساس ہوا تھا کہ ان کا سایہ کتنا گہرا تھا، کتنا پکا تھا۔ ایسے میں مجھے نظامانی صاحب نے ہی سہارا دیا
تھا۔ شروع میں تو وہ روز ہی ہمارے گھر آجاتے تھے۔ میرے ساتھ قبرستان جاتے تھے۔ وہاں سے
مجھے اپنے گھر لے آتے۔ وہاں میں ان کے گھر والوں کے ساتھ ہی کھانا کھاتا تھا۔ ان سے گھنٹوں
اباجی کی باتیں کرتا تھا اور گھر چلا آتا تھا۔ آہستہ آہستہ کچھ ان کے سہارے سے کچھ مصروفیات کی
بنا پر کچھ اماں بی کی وجہ سے میں اس دنیا میں واپس آگیا تھا جہاں ابا جان کے بغیر رہنا تھا۔ ابا جان
نے کے پی ٹی میں کام کرتے ہوئے ہی گلشنِ اقبال میں ایک مکان بنوا لیا تھا جس کے بعد کیماڑی
سے ہم لوگ وہاں منتقل ہو گئے تھے۔ شروع شروع میں تو نظامانی صاحب بھی آتے رہے۔ میں
بھی ان کے گھر جاتا تھا مگر آہستہ آہستہ یہ آنا جانا ختم ہوگیا تھا۔ زندگی مصروف تھی اور وہ بوڑھے
ہوگئے تھے۔

میری شادی ہو گئی' میرا انجینئر بھائی امریکا چلا گیا تھا اور وہاں ہی اس نے ایک پاکستانی لڑکی سے شادی بھی کرلی۔ بھائی جان زیادہ اپنی فوج کی مصروفیت کی وجہ سے پنجاب ہی میں تعینات رہتے تھے۔

میں اکاؤنٹنگ کی ایک فرم میں اچھے عہدے اور اچھی تنخواہ پر کام کر رہا تھا اور زندگی مناسب ہی گزر رہی تھی کہ نہ جانے شہر کو کیا ہو گیا۔ ہنگامے شروع ہو گئے۔ کبھی پٹھان مہاجر کا جھگڑا' کبھی شیعہ سنی کا فساد' کبھی اردو اور سندھی کا مسئلہ' کبھی پنجابی مہاجر کی تکرار اور کبھی سندھی مہاجر کی جنگ۔ ایسا ہوگا' کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔ عمر کے اس مرحلے پر پاکستان کے ٹکڑے ہونے کے بعد تو ہمیں کافی عقل آجانی چاہیے تھی۔ ہم سب چاہتے تھے کہ یہ سب کچھ نہ ہو مگر یہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ شہر کو جیسے اندر سے ہولے ہولے دیمک کھا رہی تھی۔ چپکے چپکے آہستہ آہستہ سب کچھ ختم ہوتا جا رہا تھا۔

مجھے وہ دن یاد تھے جب میں چھوٹا تھا' بہت چھوٹا۔ ابا جان کے ساتھ سٹی اسٹیشن سے نکل کر مہاجر کیمپ پہنچا تھا اور شدید گرمی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی مگر کیمپ میں لوگوں کے جوش و خروش اور گرم جذبات نے ماحول کو خوب صورت بنا رکھا تھا۔ وہ سارے چہرے میری نظروں کے سامنے ایک کے بعد ایک کرکے آتے تھے۔ کیا ہو گیا تھا لوگوں کو' ان کے بچوں کو مہاجروں کو کراچی میں رہنے والے دوسرے لوگوں کو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کون ہے ذمہ دار؟ کون ہے ذمہ دار؟ میں اور میرے جیسے لوگ کراچی میں یہی سوچتے رہے ہیں اور شاید سوچتے رہیں گے۔

اس دن شام کو میں بہت دنوں کے بعد نظامانی صاحب سے ملنے جوڑیا بازار چلا گیا تھا۔ دریا لال اسٹریٹ سے آگے بھگوان داس بلڈنگ میں خاموشی سی چھائی ہوئی تھی۔ ایک غیر معمولی سی خاموشی۔ دوسری منزل پر ان کے فلیٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہلکا ہلکا سا اندھیرا ہو رہا تھا۔ میں دروازے کو دھکا دے کر اندر چلا گیا' پہلا کمرہ خالی تھا' دوسرے کمرے میں نظامانی صاحب ان کی بیوی اور بیٹی زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔

مجھے دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے۔ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ گلے سے لگایا' مجھے ایسا لگا' جیسے ان کی عمر ایک دم سے دوگنی ہو گئی ہے۔ کپکپاتے ہوئے ہاتھ۔ مجھے افسوس ہوا تھا کہ کیوں اتنے دنوں کے بعد آیا ہوں۔ وقت نے انھیں بہت بوڑھا کر دیا تھا۔ کمرے میں عجیب طرح کی خاموشی تھی۔ میں سمجھ نہیں سکا تھا کہ کیا ہو رہا ہے' مجھے غیر معمولی پن کا تو احساس ہو گیا تھا مگر مجھے اندازہ نہیں تھا کہ بات کیا ہے۔

نظامانی صاحب مجھے غور سے دیکھ رہے تھے' دیکھتے رہے تھے' ان کی بیٹی نے میری طرف دیکھا تک نہیں تھا' جب کہ عام طور پر بہت اخلاق سے مجھے بھائی کہہ کر ملتی تھی۔ اس نے نظامانی صاحب کے ہاتھوں کو پکڑ کر دبایا اور آہستہ سے کچھ کہا تھا اور اندر چلی گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد خود ہی نظامانی صاحب آہستہ سے بولے تھے۔ ''معلوم ہے مہاجروں کی پہلی ٹرین لاہور' ملتان بہاولپور سے گزر کر جب کراچی کے سٹی اسٹیشن پہنچی تھی تو میں نے کیا کیا تھا؟ میں نے برف خریدی تھی اور بالٹیوں میں پانی بھر کر اپنے دوست خدا بخش سومرو کے ساتھ مہاجروں کو ٹھنڈا پانی پلانے گیا تھا۔ اور آنے والے لُٹے ہوئے لوگوں کو پانی پلایا تھا ہم لوگوں نے۔ ہم غریب تھے۔ کچھ نہیں تھا ہمارے پاس۔ ایک ایک دو دو پیسے جمع کر کے برف کے لیے پیسے کیے تھے ہم لوگوں نے۔ پر ہمیں ایسا لگا تھا جیسے اندر ہمارے دلوں کے اندر ٹھنڈک پڑ رہی ہے۔ وہ اچھا دن ابھی تک یاد ہے مجھے۔ پھر تمہارے ابا جان سے ملا تھا۔ ہیرا جیسا آدمی تھا تیرا باپ۔'' ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ میں نہیں سمجھا کہ وہ یہ سب کیوں کہہ رہے ہیں۔

پھر وہ رک رک کر بولے۔ ''میں نے کبھی بھی برا نہیں کیا تھا کسی کے ساتھ۔ پھر ایسا کیوں ہو گیا میرے ساتھ۔ کیوں ہو گیا؟''

ان کے چہرے پر سفید داڑھی کو تر کرتے ہوئے آنسو گر رہے تھے۔ ''ان لوگوں نے میرے دونوں بیٹے مار ڈالے۔ میرے دونوں جوان بیٹے مار ڈالے۔ کسی نے میرے پلائے ہوئے پانی تک کا پاس نہیں کیا۔ جن کو سلگتی دھوپ میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پانی پلاتا رہا تھا۔ جن کے سروں کے سائے کے لیے بے قرار رہا تھا ان کے بچوں نے مجھے بے سایہ کر دیا ہے' بے گھر کر دیا ہے۔ میرے بچے مار ڈالے' میرے بچے مار ڈالے ___________ ''

یکایک میرے پورے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی تھی اور دماغ پر جیسے ہزاروں بجلیاں ایک ساتھ چمکی تھیں۔ میری نظر کے سامنے دو دن پہلے کے اخبار یکایک کوند کر آئے تھے۔ عوام - قومی اخبار - جنگ۔ دو سندھی بھائیوں کو اغوا کر کے تشدد کے بعد ہلاک کر دیا گیا تھا۔ دونوں کی نعشیں ریل کی پٹڑی کے ساتھ ملی تھی، جسم پر تشدد کے نشان تھے اور سر پر سوراخ۔

مجھے ایسا لگا کہ وہ نعشیں ریل کی پٹڑی کے بجائے میرے سامنے پڑی ہیں اور ان کے سر کے سوراخ میں سے پانی نکل رہا ہے' برف کی طرح ٹھنڈا پانی۔ جو میرے پورے وجود کو یخ بستہ کر رہا ہے۔

ریگِ ساحل

اس کے دو بچے پہلے ہی مر چکے تھے، پیدا ہونے سے قبل، جب کچے ہی تھے۔ ایک حمل کے اٹھارویں ہفتے میں اور دوسرا بائیسویں ہفتے میں۔ "نہ جانے ہماری قسمت میں کیا ہے" اس نے تقریباً روہانسا ہو کر کہا تھا۔ "ڈاکٹر صاحب جو بھی علاج ممکن ہو سکے، کیجئے گا۔ میں بڑی امیدیں لے کر آیا ہوں۔ مجھے آپ کے دوست رفیق نے بھیجا ہے۔"

اسے رفیق نے ہی بھیجا تھا۔ رفیق کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن کے محکمہ مالیات میں کام کرتا تھا اور وہ کے ایم سی میں ہی چپراسی تھا۔ اس نے رفیق کو بتایا تھا کہ دو دفعہ اس کی بیوی کو حمل ٹھہرا اور اچھا خاصا وقت گزر گیا مگر پانچویں چھٹے مہینے میں بچے کچے ہی تھے تو ضائع ہو گئے۔ اب پھر سے اس کی بیوی کو حمل ٹھہر گیا ہے اور آنے والے خوف سے وہ پریشان تھا۔ رفیق نے اسے اپنا کارڈ دے کر میرے پاس بھیج دیا تھا۔

وہ دونوں میاں بیوی میرے پاس ساتھ ہی آئے تھے۔ وہ ڈھائی ماہ کے حمل سے تھی اور پریشان تھی۔ پریشانی اس کے چہرے پر صاف عیاں تھی اور ایسی صورتِ حال میں مریضوں کا پریشان ہونا کوئی غیر معمولی بات تھی بھی نہیں۔ میں نے انھیں تسلی دی تھی۔ سمجھایا تھا کہ انھیں اب میرے پاس ہر دو ہفتے بعد آنا ہو گا۔ جب حمل کو چودہ ہفتے گزر جائیں گے تو پھر فیصلہ کریں گے کہ کیا کرنا ہے۔

اس نے بتایا کہ وہ دوسرے ڈاکٹر کے پاس گئے تھے اور ان ڈاکٹر صاحبہ نے کچھ گولیاں اور انجکشن لگانے کو کہا تھا۔ وہ انجکشن بہت مہنگے تھے مگر پھر بھی ان لوگوں نے دو انجکشن لگوائے

تھے۔

ایسے مریض کو سمجھانا بہت مشکل ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر حمل کے اولین زمانے میں کسی بھی قسم کی کوئی بھی دوا نہیں کھانی چاہیے یہاں تک وٹامن اور آئرن کی گولیوں کی بھی ضرورت نہیں ہے اور ہوتا یہ ہے کہ اس قسم کے مریض جن کے پہلے ہی دو دو تین تین حمل ضائع ہو چکے ہوں دواؤں اور دعاؤں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ہر قسم کے پیر، عجیب قسم کے فقیر، دعا کرنے والی مائیاں، تعویز لکھنے والے بابے، روحانی علاج کرنے والے بزرگ، بچہ دینے والے مزار، پانی پھونک کر دینے والے مولوی صاحب اور محلے کی نام نہاد دائیاں جو ہر قسم کے زنانے امراض کا علاج کرتی ہیں، کے پاس یہ لوگ اپنے علاج کے لیے جاتے ہیں۔

میرے پاس آنے سے پہلے یہ لوگ بھی ایسی جگھوں پر گئے تھے۔ زمان کی ماں کا خیال تھا کہ اس کی بہو پر کسی قسم کا سایہ ہے جو حمل ضائع کرا دیتا ہے جس کے لیے وہ نئی کراچی میں ایک پیر صاحب رہتے ہیں، ان سے جا کر ملی تھیں اور تعویز لے کر آئی تھیں۔ یہ تعویز کالے دھاگے میں پرویا ہوا اس کے پیٹ پر بندھا ہوا تھا۔ اس کی ماں سیہون سے برکت والے کڑے لے کر آئی تھی جو حمل کے آخر تک اس کو داہنے ہاتھ میں پہننے تھے۔ محلے میں رہنے والی بوا نے بھی پانی والے بابا سے پھونکا ہوا پانی لا کر دیا تھا جو ہر جمعرات کو عصر اور مغرب کی نماز کے دوران پینا تھا۔ روحانی علاج کرنے والے بزرگ نے فی الحال عمل سے منع کر دیا تھا کیوں کہ ان کے علاج کے ساتھ دوسرے قسم کے علاج کا الٹا اثر ہو جاتا تھا۔

میرے پاس آنے سے قبل جس ڈاکٹر صاحبہ کے پاس یہ لوگ گئے تھے انھوں نے بھی بجائے مریض کو یہ باتیں سمجھانے کے الٹا مہنگی دوائیں لکھ دی تھیں جن کی فی الحال کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے دونوں کو سمجھایا کہ اب مزید دوائیں کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان دواؤں کے کھانے سے دوا بنانے والی کمپنی کے علاوہ کسی کا بھی فائدہ نہیں ہے۔ میرے خیال میں تو تعویز، پانی والے بابے کا پانی اور روحانی علاج سب ہی بے کار تھا، مگر مریض کو یہ بتانا اس سے بھی زیادہ بے کار ہے کیوں کہ یہ تو مریض کے اعتقاد کا مسئلہ ہے اور جس کا اعتقاد ہے میں اس میں کون بولنے والا ہوتا ہوں، لہٰذا اس سلسلے میں خاموش ہی رہا تھا۔

وہ لوگ دو ہفتے بعد پھر آئے تھے، ویسے ہی پریشان - میں نے ان کا خود اپنی مشین پر الٹرا ساؤنڈ کیا۔ زمان اور اس کی بیوی کو بچہ دانی میں تیرتے، گھومتے ہوئے بچے کی تصویر دکھائی، پھر انھیں دکھایا تھا کہ بچہ کا دل بن چکا ہے اور الٹرا ساؤنڈ کی اسکرین پر زور زور سے اوپر نیچے جھکولے لے لے کر دھڑک رہا ہے۔ میرے خیال میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا اور یہی امید کی جاتی ہے

کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی ہو گا۔ میں نے پہلی دفعہ اس لڑکی کے چہرے پر اطمینان کا ایک سایہ سا پڑتا ہوا دیکھا۔ ایسا لگا جیسے وہ سوچ رہی ہے کہ اس کی شادی بچ گئی ہے۔ زندگی بچ گئی ہے۔ اسے سب کچھ مل گیا ہے۔

جاتے جاتے زمان نے بڑی عقیدت سے میرا ہاتھ پکڑا تھا اس کا بس چلتا تو شاید وہ چوم بھی لیتا۔ میں نے اب ان دونوں کو چار ہفتے کے بعد بلایا تھا۔

چار ہفتوں کے بعد وہ لوگ پھر آئے تھے۔ میری کلینک بھری ہوئی تھی' مریضوں کے اژدہام میں میں پھنسا ہوا تھا۔ ان کی باری آنے پر میں نے انھیں دیکھا' بظاہر ہر بات درست تھی۔ اس کا وزن بھی بڑھا تھا۔ بلڈ پریشر بھی ٹھیک تھا اور خون پیشاب کے ٹیسٹ میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی کہ پریشان ہوا جاتا۔ میں نے دوبارہ الٹرا ساؤنڈ کیا تھا جس میں مجھے احساس ہوا تھا کہ بچہ دانی کا منھ جس کو سختی کے ساتھ بند ہونا چاہیے وہ اتنی سختی سے بند نہیں تھا۔ الٹرا ساؤنڈ پر ہی مجھے پتا لگ گیا تھا کہ ہونے والا بچہ لڑکا ہے۔

پہلی والی بات ذرا بُری خبر تھی۔ سولھویں سترھویں ہفتے میں بچہ دانی کے منھ کا اس طرح سے کھلنا مناسب نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جب بچے کا وزن بڑھے گا تو اس کے بوجھ سے بچہ دانی کا منھ مزید کھل جائے گا اور شاید حمل چالیس ہفتے مکمل ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے جس کا نتیجہ وقت سے پہلے پیدا ہونے کی صورت میں نکلے گا اور بچہ نہیں بچ سکے گا۔

دوسری بری خبر یہ تھی کہ ہونے والا بچہ لڑکا تھا۔ لڑکیاں سخت جان ہوتی ہیں خاص طور پر اگر نوزائیدہ ہوں۔ اور وقت سے پہلے پیدا ہونے والے بچوں میں لڑکیوں کے بچنے کی زیادہ امید ہوتی ہے۔ وہ زمانے کے سرد و گرم سہنے کو تیار ہوتی ہیں۔ بظاہر نرم و نازک مگر حقیقت میں مضبوط' برداشت کرنے کو تیار۔ لڑکے اور خاص طور پر یہ نوزائیدہ اور کچے تو بہت کمزور ہوتے ہیں۔ میرے لیے پریشانیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔

میں نے دونوں کو سمجھایا تھا کہ کیا مسئلہ ہے اور صابرہ سے میں نے کہا کہ ہفتے کے دن اسے آنا ہوگا تاکہ آپریشن تھیٹر میں اسے بے ہوش کر کے اس کی بچہ دانی کے منھ پر ٹانکے لگا دیے جائیں تاکہ اگر منھ کھلنے والا ہو تو نہ کھلے۔ وہ دونوں پریشان ہو گئے۔ بات تو پریشانی ہی کی تھی۔

جاپان' آسٹریلیا' یورپ اور امریکا میں تو چھبیس اور اٹھائیس ہفتوں کے بچے بھی بچ جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بڑا مسئلہ ہے۔ سوائے چند ایک پرائیویٹ ہسپتالوں کے' ان کچے بچوں کا کہیں اور علاج نہیں ہو سکتا ہے۔

ہفتے کے دن صابرہ ہسپتال میں داخل ہو گئی خاندان کے بیس پچیس آدمی ساتھ ساتھ تھے۔

میری ساری کوششیں ناکام ہو رہی تھیں۔ زمان نے کہا تھا کہ اس کے بچے کو آغاخان ہسپتال ہی بھیج دیں، وہ روپوں کا انتظام کرے گا۔ قرض لے گا۔ زیور بیچے گا۔

میں نے حبیب میڈیکل سینٹر فون کر کے بات کی شہر کے اس ہسپتال میں کبھی کبھی غریبوں کے نوزائیدہ بچوں کا ڈاکٹروں کی سفارش پر فری میں بھی علاج ہو جاتا تھا مگر ان کی بھی ساری مشینوں پر پہلے سے بچے موجود تھے اور فوری طور پر کسی بھی رس پائی ریڑ کے خالی ہونے کی امید نہیں تھی۔ آغاخان ہسپتال میں ایک مشین خالی تھی۔ میں نے ہسپتال کی ایمبولینس میں اپنے ہسپتال کی نرس کے ساتھ بچے کو وہاں بھیج دیا تھا۔

پھر وہی سب کچھ ہوا جو ایسے حالات میں ہوتا ہے۔ ایسے بچے کمزور ہوتے ہیں ان کے جسم میں مدافعت نہیں ہوتی، زندہ رہنے کی خواہش ہوتی ہے، وہ کوشش بھی کرتے ہیں مگر ماحول انھیں ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے، دھیرے دھیرے۔ اس بچے کو بہت کچھ ملا تھا مہنگے ترین انجکشن، پھیپھڑوں کو سنبھالنے کے لیے دوا، پھر انفیکشن سے لڑنے کے لیے مہنگی ترین اینٹی بائیوٹک دوائیں۔

زمان نے پہلے قرض لیا، پھر بیوی کے زیورات بیچے۔ بارہ دن کے علاج میں ان کے گھر کا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ پھر بچے کے پھیپھڑوں سے مشین نکال لی گئی تھی۔ وہ کمزور تھا مگر اب خود سانس لے رہا تھا۔ زمان کے پاس بھی سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ بچے کو اب صرف نرسری کی ضرورت تھی۔ آغاخان ہسپتال سے مجھے فون آیا تھا کہ میں اسے اپنے ہسپتال کی نرسری میں رکھ لوں، تھوڑے دنوں کے بعد بچہ اس قابل ہو جائے گا کہ گھر پر ماں کے پاس رہ سکے۔

صابرہ اور زمان دونوں ایمبولینس میں بچے کے ساتھ آئے تھے۔ صابرہ کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ زماں کے بڑھے ہوئے شیو والے چہرے پر تھکن نمایاں تھی، کپڑوں میں ملفوف بچے کو اس نے بڑی احتیاط سے بڑے پیار سے اپنے سینے سے لگایا ہوا تھا۔

اس نے بڑے خلوص و عقیدت سے مجھ سے ہاتھ ملایا تھا۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ میں نے بچے کو بچایا ہے۔ حالاں کہ بچہ تو ان مشینوں نے بچایا تھا، ان مشینوں پر کام کرنے والی نرسوں نے ڈاکٹروں نے بچایا تھا اور ان مہنگی ترین دواؤں نے بچایا تھا۔ ان چیزوں کے لیے زمان کے خاندان نے اپنا کافی کچھ بیچ دیا تھا۔ زیور بیچ دیے تھے، قرض لیا تھا اور نہ جانے کتنی تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ راتیں جاگ کر روئے تھے اور دن اضطراب میں کاٹے تھے۔ میں نے بچے کو نرسری میں داخل کرلیا تھا۔

مجھے یاد ہے بدھ کا دن تھا، صبح تین بجے مجھے ہسپتال سے فون آیا۔ نیند میں، میں نے ریسور

اٹھایا تھا مجھے کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا صرف گرم سیسے کی طرح الفاظ میرے کانوں میں گھسے تھے۔ بے بی زمان مر گیا ہے۔

میں جب ہسپتال پہنچا تو وہ دونوں میاں بیوی باہر ہی کھڑے ہوئے تھے' بار بار ہاتھ مل رہے تھے۔ وہ بالکل ٹھیک تھا' ڈاکٹر صاحب نہ جانے کیا ہو گیا' کیسے مر گیا۔ وہ دونوں بے یقینی کی کیفیت میں کبھی مجھے دیکھ رہے تھے' کبھی نرسری کے شیشے کی دیوار کو دیکھ رہے تھے۔

بچہ بالکل ٹھیک تھا مگر رات کو کسی وجہ سے الٹی ہوئی جو نرس رات ڈیوٹی پر تھی وہ بارہ بجے کے بعد بچے کے پاس بیٹھنے کی بجائے کرسیاں جوڑ کر سو گئی تھی۔ بچے نے الٹی میں جو کچھ نکالا تھا اسے سانس کے ساتھ پھیپھڑے میں لے لیا تھا اور آہستہ آہستہ نیلا پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر ایک اور نوزائیدہ بچے کو لے کر نرسری میں آئی تھی تو دیکھا تھا کہ نرس سو رہی ہے اور بچہ نیلا پڑ گیا ہے۔

مجھے ایسا لگا تھا جیسے میرا دل رک جائے گا۔ "بچہ مرا تو نہیں تھا صرف نیلا ہی پڑا تھا' تم نے اسے سنبھالا کیوں نہیں آکسیجن' کیوں نہیں دی' تم تو سمجھ دار ڈاکٹر ہو۔" میں غصے سے چیخ پڑا۔

وہ ڈاکٹر تھوڑی دیر خاموش رہی تھی' نظر نیچے کیے ہوئے' میں دوبارہ چیخنے والا تھا کہ وہ بولی "میں نے آکسیجن دیا تھا سر' مگر آکسیجن ختم ہو چکی تھی۔ سارے سلنڈر خالی تھے۔"

وہ بچہ نرس کے سونے اور آکسیجن کے نہ ہونے کی وجہ سے مر گیا تھا۔

میں زمان کو کبھی بھی بچے کے مرنے کی وجہ نہیں بتا سکا۔ اس سے بات کرتے وقت میرے گلے میں جیسے پھندہ پڑ گیا تھا۔ میں اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں کہہ سکا تھا کہ خدا کی مرضی تھی زمان' خدا کی مرضی تھی۔ اندر' میرے بہت اندر مجھے پتا تھا کہ خدا کی مرضی نہیں تھی لیکن اس کے علاوہ میں کچھ اور کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

وہ دونوں چھوٹے سے بچے کی نعش سینے سے لگائے روتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ میرے سامنے سے چلے گئے۔

کئی ہفتوں بلکہ کئی مہینوں کے بعد ایک دن پھر مجھے بہت سویرے سویرے ہسپتال جانا پڑ گیا تھا۔ میں گاڑی کھڑی کر کے نیچے اترا ہی تھا کہ سامنے بنچ پر وہ بیٹھا ہوا نظر آیا۔ صبح ہونے سے پہلے کے ہلکے ہلکے اندھیرے میں۔ میں نے فوراً ہی اسے پہچان گیا۔ "تم یہاں اتنے سویرے سویرے کیسے خیریت تو ہے زمان؟" میں نے پوچھا تھا۔

اس نے مجھے اسی تشکر بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ "آج بدھ ہے نہ۔ اسی وقت منا یہاں مر گیا تھا' میں نے اسے اپنی گود میں اٹھایا تھا' سینے سے لگایا تھا اور اس کی لاش کو گھر لے گیا تھا۔ اس

جگہ تھوڑی دیر پتھر کے اس بنچ پر میں اور صابرہ بیٹھ کر روئے تھے' پھر چلے گئے تھے یاد ہے ناں آپ کو۔ میں تو ہر بدھ کی صبح یہاں آتا ہوں منّے کو یاد کرنے۔ وہ مجھے بہت یاد آتا ہے ڈاکٹر صاحب۔ اسی پتھر کے بینچ پر بیٹھ جاتا ہوں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ آہستہ آہستہ میری گریبان کے بٹنوں کے درمیان سے گزر کر میرے سینے کے بالوں کو دھیرے دھیرے چھیڑ رہے ہیں۔ میں اسے اٹھا کر چومتا ہوں اپنے سینے سے لگا کر بھینچتا ہوں' اپنے گالوں کو اس کے پھول جیسے نرم نرم گالوں پر رکھ لیتا ہوں۔ میرے سینے میں جیسے ٹھنڈک پڑ جاتی ہے اور دل زور زور سے دھڑکتا ہے جیسے کہہ رہا ہو میرا منّا' میرا منّا۔

میں پھر سے ساکت ہو گیا تھا کسی نے میرے سر پر ہتھوڑے مارے تھے شن شن شن - آکسیجن' آکسیجن' آکسیجن - شاید مجھے بھی آکسیجن کی ضرورت تھی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نہ چاہتے ہوئے بے ساختہ پوچھ لیا تھا کیوں' آخر کیوں؟

"بہت سکون ملتا ہے مجھے یہاں پر قبرستان سے بھی زیادہ۔ ہر چیز مجھے منّے کی یاد دلاتی ہے۔ ہسپتال کی دیواریں' نرسوں کی آوازیں' ڈاکٹروں کا غصہ' نرسری کی روشنی اور صبح ہونے سے پہلے کا ہلکا ہلکا اندھیرا۔" اس نے آنکھیں بند کر لیں تھیں۔ کھڑکی سے چھن چھن کر آنے والی روشنی میں اس کا چہرہ پُرسکون تھا' میرے اندر کے سیلاب سے ناآشنا۔
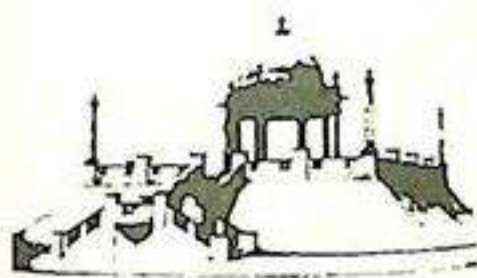
وعدہ تو کیا ہوتا

میں شراب پیتا تھا' یہی ایک خرابی تھی مجھ میں۔ ہمارے گھر میں کوئی بھی نہیں پیتا تھا بلکہ اٹھتے بیٹھتے سگریٹ اور شراب کے خلاف ہی بات کی جاتی تھی۔ شاید میں بھی نہیں پیتا اگر کراچی یونیورسٹی میں میری ملاقات شبیر سے نہیں ہوتی۔ ہم دونوں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کیا تھا۔ کراچی یونیورسٹی کے ہاسٹل میں شراب سے ہمارا تعارف ہوا تھا۔ میں اور شبیر دونوں ہی ہاسٹل میں سلیم سے ملنے گئے تھے۔ سلیم کے کمرے کے ساتھ ہی اگالا وکالی کا کمرہ تھا۔ وکالی نیروبی سے پڑھنے کراچی آیا تھا۔ سلیم کی سارے غیر ملکی طالب علموں سے دوستی تھی۔ وہاں پر ایک شام وکالی اور سوڈان کے لڑکے سلیم کے ساتھ بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ سلیم نے شبیر کو بھی ایک گلاس پکڑا دیا۔ ہم دونوں نے چاہتے نہ چاہتے ہوئے آہستہ آہستہ گھونٹ لینے شروع کیے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ مزا خراب ہونے کے باوجود مجھے اچھا لگا پھر ہم لوگ یونیورسٹی کی اس خفیہ جماعت میں شامل ہو گئے تھے۔ کبھی کبھار ہاسٹل آنا اور آکر پینا ایک معمول سا بن گیا تھا۔ ایسا معمول کہ شراب کو ہم برا سمجھتے ہی نہیں تھے۔

غیر ملکی طالب علموں میں بھی دو گروپ تھے۔ ایک گروپ مذہبی قسم کے طالب علموں کا تھا جو اسلامی جمعیت طلبا کے حامی تھے۔ دوسرا گروپ آزاد خیال قسم کا تھا جو اپنے آپ میں مست رہتے تھے۔ کبھی پروگریسو کی حمایت کر دی کبھی نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کو ووٹ دے دیا۔ ہم دونوں کا تعلق کسی بھی قسم کی سیاست سے تو تھا نہیں' تھوڑا بہت پڑھائی کے بعد آزاد خیال غیر ملکیوں کے ساتھ گھومتے رہتے تھے۔

بھٹو صاحب نے شراب پر جو پابندی عائد کی' اس کے بعد شراب بند تو نہیں ہوئی تھی مہنگی ضرور ہو گئی تھی۔ ہاسٹل میں لڑکوں نے شراب کشید کرنا شروع کر دیا تھا۔ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کشمش' خمیر' شکر اور پانی ملا کر بڑی بڑی بوتلوں میں رکھ دی جاتی تھی اور ان کو اس طرح سے بند کیا جاتا تھا کہ اندر کی گیس تو باہر نکل سکتی تھی مگر باہر کی ہوا اندر نہیں جا سکتی تھی۔ ایک

عربی لڑکے نے ایک دفعہ بوتل پوری کی پوری مکمل طور پر سیل کر دی تھی۔ تھوڑے دنوں کے بعد بوتل کی تہہ میں سے بلبلے نکلنے لگے تھے اور شاید دسویں یا گیارہویں دن بوتل ایک دھماکے سے پھٹ گئی، پھر شراب بنانے والوں کی سمجھ میں آیا تھا کہ غلطی کہاں ہوئی تھی۔

وہ یونیورسٹی کے اچھے دن تھے، میں نے اور شبیر نے تو بڑی بھرپور زندگی گزاری۔

ایم اے کرنے کے بعد شبیر کو پی آئی اے میں نوکری مل گئی تھی اور میں بھی تھوڑے دن بے روز گار رہنے کے بعد ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں ملازم ہو گیا۔ میری زندگی کے اوائل میں ہی جب میں نے کام کرنا شروع کیا تھا تو میں نے اس ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں بہت کچھ سیکھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ میری ٹریننگ ہی یہاں پر ہوئی تھی۔ مجھے ایک اسسٹنٹ کے طور پر لیا گیا تھا۔ ملک کی کئی قومی اور بین الاقوامی کمپنیوں نے ہماری ایجنسی کی خدمات حاصل کی ہوئی تھیں۔

ہماری ایجنسی کے مالک بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کے کلاس فیلو، ان کے آشنا، ان کے والد کے دوست، ان کے بھائی کے جاننے والے، ان کی بیوی کے قدر دان اور ان کے سسرال کی رشتہ داریاں سب نے مل کر ایجنسی کو چار چاند لگا دیے تھے۔ پارٹیاں ایک معمول سا تھیں۔ وہ خود بھی بڑی محنت کرتے تھے اور ہم سب بھی ایک طرح سے ان کی شخصیت کے جال میں الجھے ہوئے تھے۔ ان کی خاص بات یہ تھی کہ کوئی بھی ان سے ناں نہیں کر سکتا تھا۔ ان میں کام لینے کی زبردست صلاحیت تھی۔ انھوں نے میری ٹریننگ میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ ان کی ساری اچھی باتیں سیکھ لوں اور میں نے سیکھی بھی تھیں۔ صرف شراب ان کی ایسی برائی تھی جس کو پہلے دن سے میں نے اپنا لیا تھا۔ پانچ سال میں نے اس ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام کیا۔ اس کے بعد ایک امریکن کمپنی میں ایک اچھی جگہ مل گئی اور میں نے وہ کمپنی جوائن کر لی تھی۔ یہ لوگ پاکستان میں تیل اور گیس تلاش کر رہے تھے۔ کچھ جگہوں پر تیل کی تلاش میں کامیابی کے بعد کھدائی بھی شروع ہو چکی تھی۔ اسی کمپنی کا ایک دوسرا حصہ تھا جو پاکستان میں غربت کے خلاف اور ماحول کو آلودگی سے بچانے کے لیے کام کر رہا تھا۔ مجھے اس دوسرے حصے کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے رکھا گیا تھا۔

شبنم بھی یہی کام کرتی تھی۔ اس نے لاہور کے لمس (LUMS) سے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ڈگری لی تھی اور اس کمپنی میں ملازم ہو گئی تھی۔ دوسرے ہفتے میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ بہت ہی جاذبِ نظر تھا چہرہ اس کا۔ اس کو گورا نہیں کہا جا سکتا تھا مگر کوئی بات تھی اس میں۔ لانبے اور گھنے بال۔ درمیانہ قد، کتابی چہرہ اور بہت بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ اس کے چہرے پر نظر

نہیں رکتی تھی، اس کی آنکھوں پر نظر رکتی تھی اور پورے وجود میں جیسے گھنٹیاں سی بجنے لگتی تھیں ٹن ٹن ٹن ٹن۔

اس دن یہ گھنٹیاں ہی بجی تھیں اور میں بے اختیار ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ نہ ہمارا کوئی جھگڑا ہوا تھا، نہ اس نے مجھ سے کوئی بدتمیزی کی تھی، نہ میں نے اس کو خوش آمدید کہا تھا، ہم نئے تھے اور نہ جانے کیوں ایک دوسرے کو پسند آگئے تھے۔ وہ مجھے اچھی لگی تھی اور میں بھی اسے اچھا لگا تھا اور ایک معصوم سی دوستی کا یکایک آغاز ہو گیا تھا۔

پھر تو ہم روز ہی ملتے تھے۔ کبھی وہ کافی پینے میرے کیبن میں آجاتی تھی، کبھی میں چائے پینے اس کے کمرے میں چلا جاتا تھا اور لنچ تو ہم لوگ تقریباً روز ہی ساتھ کیا کیا کرتے تھے۔ وہ اندر سے بھی بڑی خوب صورت تھی۔ بہت ذہین اور بے انتہا سمجھ دار۔

ہماری دوستی آہستہ آہستہ چاہت میں بدلتی گئی تھی۔ مجھے وہ بہت اچھی لگی تھی، خاص طور پر اس کا آزاد رویہ، اس کا اپنے پر بلا کا اعتماد۔ وہ نارتھ ناظم آباد سے روزانہ اپنی ٹویوٹا اسٹارلٹ پر میکلوڈ روڈ آتی تھی اور کراچی کے اس جنگل میں جہاں لڑکیوں کو لوگ عجیب عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں، وہ بلا کی خود اعتمادی کے ساتھ خود ہی ڈرائیو کرتی تھی۔

ایک دن مجھے وہ سخت غصے میں ملی۔ میں نے پوچھا "ارے بھائی اتنی لال بھبو کا کیوں بنی ہوئی ہو؟" وہ غصے کے باوجود مسکرا دی تھی۔ "نہیں کوئی بات نہیں ہے، بس غصہ آتا ہے۔ کس شہر میں پیدا ہو گئی ہوں۔ کہنے کو مسلمان ہیں مگر سارے کمینے ہیں اندر سے۔"

مجھے اس کی بات سے کوئی خاص اختلاف تو نہیں تھا لیکن پھر بھی میں پوچھ بیٹھا "ارے کیا ہو گیا ہے، آخر بات کیا ہوئی ہے؟"

"ارے بات کیا ہوئی ہے روز کا چکر ہے۔ آج پھر گاڑی ٹریفک میں پھنس گئی تھی اور کوئی بھی راستہ دینے کو تیار نہیں تھا۔ یہاں تک کہ پیدل چلنے والے لوگ بھی میرے سامنے آرہے تھے اور کم بخت دیکھتے تو ایسے ہیں جیسے کھا جائیں گے۔ لڑکی کا گاڑی چلانا تو عذاب ہی ہے۔ اگر بس چلے تو شیشے توڑ کر مجھے اغوا ہی کرلیں، کچھ اور تو کر نہیں سکتے ہیں ہر کوئی گزرتے ہوئے گاڑی پر ہی اس طرح سے ہاتھ پھیرتا ہے جیسے میں اس کے قابو میں آگئی ہوں۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ "ارے، تم ہنس رہے ہو، یہ ہنسنے کی بات ہے۔ یہ شرم کی بات ہے۔" بات تو شرم کی ہی تھی مگر روڈ پر چلنے والے ان بے شمار لوگوں کو کیا کہا جاسکتا تھا۔ سارا شہر فرسٹریشن کا شکار تھا۔ ہر قسم کی فرسٹریشن تھی لوگوں کو اور ہر کوئی اپنے طریقے سے اس فرسٹریشن کو مٹا رہا تھا۔ کوئی دیواروں پر الٹے سیدھے نعرے لکھتا ہے، کوئی بسوں کو جلاتا ہے، کوئی سڑکوں

کی روشنیوں کو توڑتا ہے' کوئی گاڑی چلانے والی لڑکی کی گاڑی پر ہاتھ پھیرتا ہے' میں نے اسے سمجھایا تھا۔

تھوڑی دیر میں اس کا غصہ ختم ہو گیا تھا مگر ہم دونوں ہی سوچ رہے تھے' بہت کچھ۔ وہ ایک لڑکی ہونے کے ناتے اور میں ایک مرد ہونے کے حوالے سے۔

ایک دن اس کی گاڑی کے چاروں پہیوں کی ہوا کسی نے نکال دی تھی حالاں کہ گاڑی محفوظ جگہ پر کھڑی ہوتی تھی مگر نہ جانے کیوں کسی نے یہ شرارت کی تھی۔ وہ تو یہ کہیے کہ میکلوڈ روڈ پر ہمارے آفس کے قریب میں ہی پنکچر والے کی دوکان تھی' اسے میں بلالیا تھا' اس نے جیک لگا کر چاروں پہیے ایک ساتھ اتار لیے تھے اور اپنی دوکان سے ہوا بھر دی۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا مگر وہ بے انتہا ٹینشن کا شکار ہو گئی تھی۔ شاید کچھ خوف زدہ بھی۔ میں نے کہا تھا' گاڑی آفس میں ہی چھوڑ دو میں تمھیں چھوڑ آتا ہوں۔ کل صبح تمھیں تمھارے گھر سے لیتا ہوا آجاؤں گا' گلشن سے فاصلہ ہی کتنا ہے۔ اس نے شدید غصے میں کہا تھا۔ ''ٹھیک ہے۔ شاید غصے میں کوئی حادثہ ہی کر بیٹھوں گی۔''

اس دن میں نارتھ ناظم آباد میں فائیو اسٹار ہوٹل کے پاس اس کے گھر گیا تھا جہاں اس کے ابو' امی اور بھائی سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ لوگ بڑے سلیقے کے لوگ تھے۔ اس کے ابو حبیب بینک میں منیجر تھے' ماں ایک اسکول میں پڑھاتی تھیں اور بھائی این ای ڈی میں انجینئرنگ پڑھ رہا تھا۔ میں بہت دیر تک ان کے گھر بیٹھا گپ شپ لگاتا رہا تھا۔ مجھے ایسا ہی لگا تھا جیسے میں اپنے ہی گھر میں بیٹھا ہوا ہوں۔

اس رات میں نے اپنی امی کو کہہ دیا تھا کہ میں نے لڑکی تلاش کر لی ہے اب عنقریب آپ کو ان کے گھر جانا ہو گا۔ ہمارے گھر میں بھی خوشی کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔

پھر دسمبر کا مہینہ آگیا۔ نئے سال کی پارٹیوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ ہمارے آفس کے کنٹری منیجر نے اپنے گھر پر ایک دعوت رکھی تھی جہاں آفس کے ہم کچھ لوگ مدعو تھے۔ کافی اچھی دعوت تھی۔ میں اور شبنم ساتھ ہی پہنچے تھے۔ اس نے بہت ہی خوب صورت' نئے انداز کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور اپنی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں کے ساتھ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ دعوت میں شراب بھی مل رہی تھی اور میں نے بھی اپنی پسند کی بیئر پی لی تھی۔ خوب صورت پارٹی' خوب صورت انداز سے شروع ہو کر خوب صورت انداز سے ہی ختم ہو گئی تھی۔

زندگی گزر رہی تھی' آفس کا روزانہ کا کام' ماحول کی بڑھتی ہوئی آلودگی کے بارے میں شہریوں کی بے حسی' اس بے حسی کو دور کرنے کی ہماری ناکام کوششیں۔ غربت کو دور کرنے کے

لیے حکومت کے مختلف اداروں کو دیے جانے والے ہمارے مشورے اور فنڈ جو حکومت کے افسران اپنی امیری کو بڑھانے میں صرف کر رہے تھے۔ شہر کی بگڑتی ہوئی حالت' ابلتے ہوئے گٹر اور روزانہ بجلی کے چلے جانے کا عمل اس میں سوائے ڈپریشن کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس بے رنگ تصویر میں صرف شبنم کی رنگینی تھی اس کی فلسفیانہ باتیں' اس کا عورتوں کے حقوق کے لیے جہاد' زندگی میں ہونے والے حادثات پر اس کا ردِ عمل' اس کے ساتھ گزرے ہوئے لمحے' وقت خوب گزرتا تھا مزے سے۔ ساتھ ساتھ وہ اب میری کمزوری بھی بن گئی تھی۔

پھر ایک دن میں نے اس سے پوچھ ہی لیا تھا کہ کیا ارادے ہیں' مجھ سے شادی کرو گی یا بغیر شادی کے اس طرح سے بور کرتی رہو گی۔ وہ یکایک ہنسی تھی پھر سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"ہاں کر سکتی ہوں' مگر ایک شرط ہے۔"

"شرط ہے' کیسی شرط' ہمالیہ پہاڑ سے جا کر سونے کے انڈے لانے کو مت کہنا۔"

"نہیں' اس سے بھی آسان ہے" اس نے ہنس کر کہا تھا۔ "اگر مانو گے تو بولوں گی۔"

"جب پتا ہی نہ ہو تو ماننے کا کیسے وعدہ کر سکتا ہوں۔ بڑی بے وقوفی کی بات کر رہی ہو۔" میں ہنس دیا تھا۔

نہیں ہامی تو بھرو۔ پھر میں ایسی کون سی شرط رکھوں گی کہ تم مان نہیں سکتے ہو۔" اس نے پھر ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"اچھا بابا! بولو۔ ماننے والی بات ہوئی تو مان لوں گا۔ تمھارے لیے بہت کچھ کر سکتا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"وعدہ؟"

"وعدہ"۔

"اچھا تو پھر شراب پینا چھوڑ دو۔" اس نے رک رک کر بہت سنجیدگی سے کہا تھا۔

"ارے' میں روز تھوڑی پیتا ہوں' یہ کیا شرط ہوئی" میں نے احتجاج کیا تھا۔ "مجھے پتا ہے تم روز نہیں پیتے ہو مگر میں چاہتی ہوں کہ تم کبھی بھی نہ پیو۔" اس نے پھر اسی لہجے میں کہا تھا۔

"مگر یہ میری ذاتی آزادی میں تمھاری دخل اندازی ہے۔ تم یہ کیسی شرط رکھ رہی ہو۔" میں نے پھر احتجاج کیا تھا۔

"دیکھو یہ تو ہمارے مذہب میں بھی منع ہے اور ایسی کون سی بڑی بات ہے۔" اس نے کہا۔

"لیکن میں مذہبی نہیں ہوں۔ تمھیں پتا ہے' اچھی طرح سے معلوم ہے۔" میں نے بھی ذرا سختی سے کہا تھا۔

"تم خدا کو مانتے ہو؟" اس نے پوچھا تھا۔

"ہاں مانتا ہوں۔" میں نے تھوڑا غصے سے کہا تھا۔

"رسول کو مانتے ہو؟" اس نے پھر پوچھا تھا۔

"ہاں مانتا ہوں۔ مگر یہ کیا سوال ہے؟" میں نے احتجاج کیا تھا۔

"تم نماز پڑھتے ہو؟" اس نے پھر پوچھا تھا۔

"عید، بقر عید پر پڑھ لیتا ہوں۔" میں نے جواب دیا تھا۔ "پڑھتے تو ہو نا؟ یہ کافی ہے۔" اس نے اسی لہجے میں کہا تھا۔ "خدا کو مانتے ہو، رسول کو مانتے ہو، نماز پڑھتے ہو تو شراب بھی چھوڑ دو۔"

مجھے غصے کے باوجود ہنسی آ گئی تھی۔ "کیسی بے وقوفی کی بات کر رہی ہو۔ تمھیں پتا ہے میں کتنا مسلمان ہوں اور جتنا ہوں اتنا ہی رہنا چاہتا ہوں۔ ہمارے تعلقات میں ان چیزوں کو نہ لاؤ تو بہتر ہے۔" میں نے سمجھانے کے انداز میں کہا تھا۔

"تم میرے لیے ایک چھوٹا سا وعدہ بھی نہیں کر سکتے ہو؟ اس نے بڑے عجیب انداز سے مجھ سے پوچھا تھا۔ کچھ التجا تھی، کچھ شکوہ تھا، کچھ نصیحت سی تھی اور کچھ حکم تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے پاس جواب دینے کے لیے الفاظ ہی نہ ہوں مگر پھر میں بولا تھا۔ "دیکھو اگر میں وعدہ کر لوں گا تو پھر مجھے زندگی میں کبھی بھی نہیں پینی ہوگی اور شاید میں ایسا نہیں کر سکوں۔ مجھے شراب اچھی لگتی ہے۔ کبھی کبھی مجھے پینا اچھا لگتا ہے۔ کبھی کبھار مہینے دو مہینے میں ایک بار دوستوں میں بیٹھ کر تھوڑی سی پی لیتا ہوں۔ تھوڑا سا ہنس لیتا ہوں تو ایسی کون سی برائی ہے۔ میں شرابی نہیں ہوں، کبھی کبھار پی لیتا ہوں اور شاید پیتا رہوں گا۔ آج اگر میں تم سے وعدہ کر لیتا ہوں اور پھر وعدہ نہیں نبھا سکا تو پھر تم سے جھوٹ بولوں گا۔ مجھے یہ جھوٹ بولنا منظور نہیں ہے۔ تم مجھ سے یہ وعدہ نہ لو بہتر ہے بلکہ اس چکر میں ہی نہ پڑو۔"

اس نے فوراً ہی مجھ سے پوچھا تھا "تو کیا تمھاری ماں کو پتا ہے کہ تم شراب پیتے ہو۔؟"

"نہیں شاید نہیں پتا۔" میں نے جواب دیا تھا۔

"کیوں نہیں پتا ہے۔ تم نے ان سے جھوٹ بولا ہے ناں؟" اس نے مسکرا کر پوچھا تھا۔

"نہیں، میں نے جھوٹ نہیں بولا ہے۔ میں نے یہ ڈس کشن کی ہی نہیں ہے، اس موضوع کو چھیڑا ہی نہیں۔ وہ ایک چیز سے لاعلم ہیں، انھیں لاعلم ہی رکھوں گا، اگر کبھی کسی نہ کسی وجہ سے شراب کا ذکر آیا بھی تو ٹال دوں گا۔ میں جھوٹ اور سچ بولے بغیر بھی رہ سکتا ہوں۔ خدا کے لیے اس چیز کو درمیان میں مت لاؤ۔"

وہ مجھے دیکھتی رہی، پھر بولی "نہیں اقبال تمھیں وعدہ کرنا پڑے گا۔ تمھیں شراب چھوڑنی ہوگی۔ جب تم یہ وعدہ کرو گے تو پھر بات آگے بڑھے گی۔ تم سوچو، خوب سوچو اور سوچ کر مجھے بتانا۔ تمھارے فیصلے کے بعد میں کوئی فیصلہ کروں گی۔"

یہ اس کا ایک دوسرا رخ تھا۔ میں نے سمجھنے کی کوشش کی تھی، نہیں سمجھ سکا تھا۔ میری ماں کی نسل اور تھی، ہماری نسل اور ہے۔ میں اپنی ماں سے شاید جھوٹ بول کر مطمئن رہ سکتا تھا مگر اس سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ ایک نسل کا فاصلہ تھا۔ میری ماں سہگل اور ملکہ پکھراج کے گانے سنتی تھی ہم لوگ وٹنی ہیوسٹن۔ ڈیوڈ بوری پروس، اسپرنگ میڈونا اور ایلٹن جان سنتے تھے۔ ہماری دلچسپیاں مختلف تھیں، ہم مختلف ادوار میں تھے، میں سوچ سوچ کر بھی نہیں سمجھ سکا تھا کہ ہماری چاہت کے اس رشتہ میں شراب کہاں سے آجائے گی۔

معمولی سی بات بڑھتی چلی گئی۔ مجھے پتا تھا کہ وہ بھی مجھے اتنا ہی چاہتی ہے جتنا میں چاہتا ہوں مگر اس ایک شرط نے ہمیں ایک دوسرے سے دور کر دیا۔ میں جھوٹا وعدہ کرنے پر راضی نہیں تھا اور وہ اپنی بات پر اڑ گئی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے یکایک بہت دور ہو گئے تھے۔

میرے لیے اس جگہ کام کرنا مشکل ہو گیا تھا اور مجھے جلد ہی ایک اور امریکن کمپنی میں نوکری مل گئی تھی۔ پھر مجھے شبنم کی شادی کا کارڈ ملا، کسی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سے اس کی شادی ہو رہی تھی۔ میں نے بڑے کرب کے ساتھ اس کی شادی میں شرکت کی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ اسد اس کے شوہر کا نام تھا۔ اسٹیج پر وہ دونوں اچھے لگے تھے۔

میری بھی شادی حنا سے ہو گئی، میری ماں نے ہی اسے پسند کیا تھا۔ شبنم کے بعد میری پسند ناپسند ختم ہو گئی تھی۔ حنا ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ عام بیویوں کی طرح سے شوہر کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار۔ وہ کافی مذہبی لڑکی تھی مگر اس نے مجھ سے میرے بارے میں نہ کوئی سوال کیا تھا اور نہ میں نے اپنی طرف سے ان سوالوں کا جواب دیا تھا جو پوچھے ہی نہیں گئے تھے۔

مجھے پتا لگا تھا کہ شبنم نے نوکری چھوڑ دی ہے بلکہ شوہر نے چھڑوا دی ہے۔ مجھے یقین نہیں آیا تھا کیوں کہ اسے تو ہمیشہ کام کرنے کا شوق تھا۔ مجھے پھر بعد میں پتا لگا تھا کہ وہ اسد کے ساتھ سعودی عرب چلی گئی ہے۔ اس کا بھی مجھے افسوس ہوا تھا کیوں کہ وہ اکثر باتوں میں کہتی تھی کہ سعودی عرب عمرہ حج کے لیے صحیح ہے، میں کبھی وہاں کام نہیں کروں گی کوئی بات ہے کہ عورت گاڑی تک نہیں چلا سکتی وہاں۔

میں زندگی کے چکروں میں الجھا رہا تھا مگر گاہے بہ گاہے کبھی کبھار اس کی یاد آجاتی تھی۔ میں حنا کے ساتھ خوش تھا مگر وہ میری زندگی کا ہی ایک حصہ رہی تھی۔ بہت سی باتیں کی تھیں

ہم نے۔ کچھ وعدے کیے تھے اور کچھ وعدے نہیں کیے تھے۔ کئی سال اسی طرح سے گزر گئے پھر ایک دن وہ نظر آئی تھی۔

میں شاہراہِ فیصل کے عوامی مرکز میں حنا کے ساتھ کچھ خریداری کرنے گیا تھا۔ وہ اندر کچھ سامان اکٹھا کر رہی تھی کہ سفید برقعے میں ملبوس ایک عورت مجھے نظر آئی تھی۔ سرتاپا جسم کا ہر حصہ چھپا ہوا تھا اس نے ہاتھوں پر بھی دستانے پہنے ہوئے تھے۔ صرف آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہی بڑی بڑی سیاہ سوچنے والی شریر آنکھیں۔ میں پہچان گیا تھا' شبنم تھی وہ۔ وہ بھی آہستہ آہستہ میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھی۔

"اقبال کیسے ہو؟" اس نے اسی لہجے میں' اسی پیار سے پوچھا تھا۔ میں ٹھیک ہوں' بالکل ٹھیک' یہ تم نے کیا کر لیا ہے اپنے ساتھ۔ ٹھیک تو ہو ناں خوش تو ہو ناں؟" میں نے بے اختیار ہو کر سوال کر لیا تھا جو شاید مجھے نہیں کرنا چاہیے تھے۔

میں وہ مجھے تھوڑی دیر تک دیکھتی رہی تھی آنکھوں میں وہی جذبہ تھا' وہی پیار کا سمندر تھا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ بولی تھی۔

"تم اگر ایک جھوٹا وعدہ کر لیتے تو تمہارا کیا جاتا' کیا بگڑتا' ایک چھوٹی سی بات تھی' ختم ہو جاتی۔ اچھا نہیں کیا تم نے۔" یہ کہہ کر وہ بڑی تیزی سے میرے سامنے سے چلی گئی۔ میں بے تاب ہو کر اس کی طرف بڑھا کہ اسے روکوں اور کچھ اور بات کروں کہ سامنے سے حنا آگئی۔

"میں یہاں ہوں آپ ادھر کہاں جا رہے ہیں؟" اس نے زور سے آواز دے کر کہا تھا۔

اب بھی کبھی کبھی راتوں کو میری آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ بڑی بڑی سیاہ اور شریر' سوچنے والی اداس آنکھیں مجھے بے قرار کر جاتی ہیں۔

باہر کی دُنیا

''کتے کے بچے' خنزیر کی اولاد'' یہ کہہ کر انھوں نے میرے منہ پر مکا مارا۔ میں زمین پر گر گیا۔ گرتے گرتے میرا سر دیوار سے ٹکرایا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے میرا سر دو پہاڑوں کے درمیان کچلا جا رہا ہے۔ مولوی صاحب کا چہرہ کہیں کھو گیا تھا اور مجھے میرے باپ کا چہرہ نظر آیا۔ میرے دل نے جیسے زور زور سے چیخ چیخ کر کہا ایسے باپ سے تو میں بن باپ ہی اچھا رہتا۔ مجھے پیچھے بہت پیچھے مولوی صاحب کے خوف ناک چہرے اور باپ کی کرخت شکل کے بھی پیچھے' چادر میں لپٹی ہوئی ماں کی مہربان صورت نظر آئی جس کا چہرہ میرے خون سے تر تھا۔ سرخ سرخ آنسو آنکھوں سے نکل کر چہرے پر پھیلتے جا رہے تھے۔

سر کے شدید درد کے احساس کے ساتھ مجھے ہوش آیا تھا۔ میرے پاؤں میں زنجیر پڑی ہوئی تھی اور یہ زنجیر چارپائی کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ درد اتنا شدید تھا کہ میں حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ کر آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تھی کہ میرے کانوں میں مولوی صاحب کی آواز آئی۔ ''دیکھو حرام زادے کو ہوش آیا ہے کہ نہیں۔ اگر ہوش آجائے تو بھی کھانے پینے کو کچھ مت دینا۔'' میں درد کو بھول کر دوبارہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہی مولوی صاحب کی صورت' وہی باپ کی شکل' وہی خون کے آنسو والا میری ماں کا چہرہ' سائیں سائیں دھم دھم سائیں سائیں دھم دھم دھم دھم------

میرا دل اسکول میں نہیں لگتا تھا۔ اردو اور عربی تو میں پڑھ ہی نہیں سکتا تھا۔ ہر روز اسکول جانا میرے لیے دنیا کا سب سے مشکل کام تھا۔ میرے دونوں بھائی' میری چھوٹی بہن' سب ٹھیک تھے' سب کو پڑھنے کا شوق تھا' سب اسکول سے گھر آکر پڑھائی کرتے تھے اور میں کھیلتا رہتا تھا۔ کبھی گھر میں کبھی گھر کے باہر محلے کے بچوں کے ساتھ۔

آٹھ نو سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ میں ایک ہی کلاس میں کئی دفعہ فیل ہوا۔ ٹیچر کی مار' باپ کی ڈانٹ اور ماں کا پیار' ان سب کے باوجود پڑھائی میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ میرا دل کرتا تھا

کہ اپنے ماموں کے ساتھ بڑھئی کا کام کروں اور خوب صورت خوب صورت چیزیں بناؤں، کرسیاں الماریاں، ٹیبل پھر گاڑیاں بنانے کا کام سیکھ لوں۔ ہوائی جہازوں کو اوپر سے گزرتے دیکھ کر لگتا تھا کہ میں ہی انھیں چلا رہا ہوں۔ مگر یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ نہ میرے گھر والوں کو نہ اسکول کے ٹیچروں کو، نہ ہی ہمارے سارے رشتہ داروں کو۔

ایک دن میرے باپ نے مجھے بلا کر بہت ڈانٹا اور مارا بھی تھا اور یہ فیصلہ سنا دیا تھا کہ مجھے ملتان سے باہر جو دینی مدرسہ ہے وہاں داخل کیا جائے گا۔ سب کا فیصلہ تھا کہ مجھے حافظِ قرآن بننا چاہیے۔ ایک میرے حافظِ قرآن بننے سے ہمارے ساتھ آگے پیچھے کی سات نسلیں جنت میں چلی جائیں گی۔ اور ویسے بھی میں اسکول کے کام کا تو تھا نہیں، میرے ساتھ کے بچے مجھ سے بہت آگے جا چکے تھے۔

مجھے نہ جنت میں جانے کا شوق تھا، نہ اسکول جانے کا شوق تھا اور نہ ہی مدرسے میں جانے کا شوق تھا۔ میں بہت رویا تھا، اپنی ماں کے گلے لگ کر کہ مجھے مدرسے نہ بھیجیں میں نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ اب میں پڑھوں گا، اسکول میں ہی پڑھوں گا مگر کسی نے میری بات نہیں سنی۔ مجھے مدرسے میں مولوی صاحب کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

پہلے دن وہ مجھ سے بہت اچھے طریقے سے پیش آئے تھے۔ اپنے پاس پیار سے بٹھایا تھا اور مدرسے کے اصول سمجھائے تھے۔ صبح سے لے کر اگلی صبح تک کا ایک دستور تھا۔ نماز کا وقت، کھانے کا ٹائم، کھیلنے کا وقت، درس اور عبادت کا وقت وغیرہ وغیرہ۔

مگر مجھے وہاں نہیں رہنا تھا۔ میری حالت ایک ایسی چڑیا کی تھی جسے باندھ دیا گیا ہو یا پر کتر کر پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ دوسرے دن ہی صبح کو میں کسی کو بتائے بغیر وہاں سے نکل گیا تھا۔ مدرسے سے نکل کر بڑی سڑک پر آیا تھا اور ایک بس کو رکوا کر اس پر بیٹھ گیا۔ میرے پاس کرائے کے بھی پیسے تھے۔ ملتان میں بس کے اڈے سے گھر آنا اتنا مشکل نہیں تھا۔

گھر میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ میری ماں مجھے دیکھ کر بے انتہا خوش ہوئی تھی مگر اس نے کہا تمھارا باپ آئے گا تو تمھیں واپس جانا ہوگا۔ دوپہر کو میرا باپ اور میرا چچا مجھے دوبارہ مدرسے لے آئے تھے۔ مجھے ڈانٹا تھا، دھمکیاں دی تھیں، سمجھایا تھا پیار سے بھی، غصے سے بھی۔

مولوی صاحب نے بھی مجھے سمجھایا تھا، بہت دیر تک بتاتے رہے تھے کہ دینی تعلیم سے کتنا فائدہ پہنچتا ہے۔ دین دنیا میں ترقی ہوتی ہے اور آخرت میں جب باقی سب کا منہ کالا ہوگا اس وقت ہم لوگ مومنوں کی قطار میں سب سے آگے ہوں گے۔

مجھے مومنوں اور ان کے قطار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی مجھے ان کی اگلی قطار میں

رہنے کا شوق تھا۔ مجھے تو مدرسے میں بھی نہیں رہنا تھا مگر مجھے مدرسے میں رہنا پڑ گیا تھا۔

مولوی صاحب نے میرے پیچھے ایک اور شاگرد کو لگا دیا تھا۔ وہ مجھ سے بڑا تھا اور بہاولپور سے آیا تھا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی ابھی نئی نئی اگی تھی اور مدرسے کے ان بہتر شاگردوں میں تھا جن کا چناؤ افغانستان کے لیے کر لیا گیا تھا۔ افغانستان سے مجاہدوں کا ایک گروپ آنے والا تھا جن کے ساتھ وہ جہاد کے لیے جانے والا تھا۔ اس کا نام عمر تھا۔ اس مدرسے میں عمر ہی واحد آدمی تھا جو مجھے اچھا لگا تھا۔ مجھے یاد ہے اس کی عمر پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی مگر داڑھی اور اس کے ساتھ پگڑی باندھ کر وہ بڑا لگتا تھا۔

مجھے اس نے بڑے پیار سے سمجھایا تھا کہ اس مدرسے میں کیا نہیں ہے' قرآنی تعلیم کا انتظام ہے' رہنے کی جگہ ہے' اچھا کھانے پینے کو ملتا ہے اور پیار کرنے والے' درس دینے والے استاد ہیں یہاں سے کیوں جانا چاہتے ہو؟

عمر کے والدین کسان تھے۔ وہ گھر کا سب سے بڑا بچہ تھا اور اسے بچپن ہی سے دینی تعلیم کا شوق تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی اس کے باپ کے ساتھ کھیتوں پر ہی کام کر رہے تھے۔ ابھی اس کی دینی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی مگر اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ افغانستان کی جنگ میں مجاہدوں کی طرف سے لڑے گا۔ اس نے شہیدوں کے بارے میں ایسی اچھی اچھی باتیں بتائیں تھیں کہ مجھے بھی شہید ہونے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ ایک دن میں نے اس سے کہا تھا کہ عمر بھائی میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا مجھے بھی لے چلو۔ یہاں تو مجھ سے نہیں رہا جاتا ہے۔ میں یہاں نہیں رہوں گا۔

اس نے بتایا تھا کہ ابھی میں نہیں جاسکوں گا کیوں کہ مدرسوں میں بہتر بہتر کی تعداد میں مجاہدوں کی بھرتی ہوئی ہے۔ مجاہد یہاں سے پشاور یا کوئٹہ جاتے ہیں' وہاں ان کی ٹریننگ ہوتی ہے اس کے بعد وہ قندھار' جلال آباد' کابل یا جہاں جہاں مجاہدوں کے ساتھ لڑنے کی ضرورت ہوتی ہے' پہنچ جاتے ہیں۔ عمر کو مولوی صاحب کی طرح سے پورا یقین تھا کہ روس کی دہریہ طاقت کو جو شکست ہوئی ہے اس کے بعد اسلام کا سورج افغانستان سے طلوع ہو گا اور ساری دنیا پر چھا جائے گا۔ امریکا' یہودی' ہندو' انگریز سب کے سب فنا ہو جائیں گے۔ اس وقت ساری دنیا مسلمانوں کے خلاف سازش کر رہی ہے نہ صرف یہ کہ غیر مسلم بلکہ نام نہاد مسلمان سلمان رشدی کی صورت میں امت کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ افغانستان کی کامیابی اور خاص طور پر روس کے لامذہب بن مانسوں کی شکست کے بعد اب ہمارا راستہ صاف ہو گیا ہے۔ عمر کے یقین میں میرا یقین بھی شامل تھا۔ لیکن پھر بھی میں مدرسے میں تو نہیں رہنا چاہتا تھا۔

اس دن عمر بھائی اپنے گاؤں گئے تھے اپنے والدین سے ملنے اور ان کے جانے کے فوراً بعد میں بھی مدرسے سے بھاگ نکلا تھا۔ میں تیز تیز روڈ کی طرف دوڑتا ہوا جا رہا تھا کہ یکایک مجھے آواز آئی تھی یاسین بھاگو مت ہم نے دیکھ لیا ہے۔ عمر بھائی میرا چارج ناظم کو دے کر آئے تھے اور وہ مدرسے کے کچھ اور لوگوں کے ساتھ میری تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ بڑی سڑک کے آنے سے پہلے میں پھر پکڑا گیا تھا۔ وہ لوگ مجھے پکڑ کر مولوی صاحب کے پاس لے آئے تھے۔ اس وقت مولوی صاحب کے پاس دو گورے آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے بعد میں پتا لگا تھا کہ یہ انگریز تھے اور بی بی سی کے کسی پروگرام کے لیے مولوی صاحب کا انٹرویو لے رہے تھے۔ مولوی صاحب نے مجھے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا تھا۔ مجھے اپنے پاس پیار سے بٹھا لیا تھا اور پھر بولے تھے "بیٹے مت بھاگو باہر کی دنیا بہت خراب ہے۔ کہاں جاؤ گے۔ تمہارے باپ نے مجھے تمہارا باپ بنا دیا ہے اب جو بھی ہو گا میری مرضی سے ہو گا۔ تم میری ذمہ داری ہو اب اگر تم بھاگے تو بہت برا ہو گا۔" یہ دھمکی بھی انھوں نے بہت پیار سے ہی دی تھی۔

میں دوبارہ چار دیواروں میں قید ہو گیا تھا۔ مجھے اپنے باپ پر غصہ آیا تھا' شدید غصہ۔ مجھے اپنے بھائی یاد آئے تھے' دونوں بہنیں یاد آئی تھیں جن کے ساتھ میں لڑتا تھا' دادی جان یاد آتی تھیں جو مجھے پیسے دیا کرتی تھیں اور ماں کا چہرہ نظروں کے سامنے آگیا تھا' نماز کے وقت تک میں اپنے بستر پر پڑا آہستہ آہستہ روتا رہا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد عمر بھائی واپس آگئے تھے۔ ان کے گھر والوں اور گاؤں والوں نے انھیں بہت سے تحفوں کے ساتھ واپس بھیجا تھا۔ وہ بہت خوش تھے' ان کے گھر والے بھی بہت خوش تھے۔ ان کے باپ نے گاؤں میں ہر گھر پر جا کر اپنے مولوی بیٹے کو ملایا تھا۔ سارا گاؤں خوش تھا کہ وہ ان بہتر لوگوں میں شامل ہیں جو جہاد کے لیے چلے جائیں گے۔

عمر بھائی کا جانا میرے لیے دوسرا صدمہ تھا۔ وہ مجھے سمجھتے تھے' مدرسے کے جنگل میں وہ میرے سب کچھ تھے' مجھے سمجھاتے رہتے تھے اور آہستہ آہستہ میں نے اپنے آپ کو مدرسے میں رہنے کے لیے آمادہ کر لیا تھا۔ ان کا جانا میرے لیے ایک طرح کا حادثہ تھا۔ ان کے جانے کے باوجود میں نے مدرسے سے بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں عربی پڑھنے میں اور قرآن شریف رٹنے میں بالکل بھی اچھا نہیں تھا۔ میں مدرسے کے دوسرے کاموں میں زیادہ لگا رہتا تھا۔ مسجد کی صفائی' چیزوں کی مرمت' گاڑیوں کی دیکھ بھال وغیرہ وغیرہ۔

تین مہینے میں ایک دفعہ ہم لوگوں کو گھر جانے کی اجازت تھی۔ میں جب بھی گھر جاتا تھا میرا دل واپس آنے کو نہیں کرتا تھا لیکن میں اپنے باپ سے یہ آزادی مانگنے کو تیار نہیں تھا۔ میں ان

سے بات تک نہیں کرتا تھا۔ مجھے ان سے آہستہ آہستہ شدید نفرت ہو گئی تھی۔ مدرسے میں کبھی کبھار عمر بھائی کے خط آتے تھے اور پتا لگتا رہتا تھا کہ وہ افغانستان کے جہاد میں لگے ہوئے ہیں۔ میں نے بھی مولوی صاحب کو آمادہ کر لیا تھا کہ مجھے بھی جہاد پر بھیج دیں۔ انھوں نے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ ناظرہ کے دو سال کے بعد سوچیں گے۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ مجھے درسِ نظامی کا کورس کرنا چاہیے۔ بڑی مشکل سے میں نے ایک سال کا قاعدہ دو سال میں کیا تھا۔ ناظرہ جو ڈیڑھ سال میں ہونا چاہیے تھا اس میں مجھے وقت لگ رہا تھا۔ اس کے بعد تین سال میں مجھے قرآن حفظ کرنا تھا۔ درس نظامی کے سولہ سالہ کورس کے بعد میں عالم دین بن سکتا تھا۔ وہ تو سمجھتے تھے کہ میں عالمِ دین بن کر بہت کچھ کر سکوں گا لیکن میں افغانستان کے جہاد میں جانا چاہتا تھا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا کہ جہاد ختم تو نہیں ہو جائے گا' انھوں نے کہا تھا نہیں۔ ابھی تو جنگ جاری رہے گی کیوں کہ کوئی حل نہیں نکلا ہے۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ سوال نہیں آیا تھا کہ اگر روس کے دہریے ہار کر چلے گئے ہیں تو پھر کس سے جنگ لڑی جا رہی ہے اور کن کے خلاف جہاد ہو رہا ہے؟

پھر ایک بُری خبر آئی۔ افغان مجاہدین کا ایک وفد یہ خبر لے کر آیا تھا ایک ماہ قبل تین سو سے زائد مجاہدین کا قتل قندھار کے پاس ہوا تھا اور لاشوں کو وہیں دبا دیا گیا تھا اس میں ہمارے مدرسے کے بھی بہت سے طالب علم تھے۔ عمر بھائی بھی شہید ہونے والوں میں تھے۔ میں سوچتا رہا کہ انھیں کس نے مارا تھا۔ روسیوں نے' دہریوں نے' افغانستان کے کسی اور مسلمان دستے نے۔ یہ کیسی شہادت تھی' یہ کون سی جنت ہوگی۔

دُوسرے دن جمعے کی نماز کے ساتھ ان شہیدوں کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی گئی تھی۔ تقریر میں بتایا گیا کہ عمر اور سارے شہید اب جنت میں ہیں۔ افغانی مجاہد اور مولوی صاحب نے بڑی ولولہ انگیز تقریر کی تھی۔ مولوی صاحب نے کہا تھا کہ اسلامی جنگ کے لیے ہمارے پاس اور مجاہد تیار ہیں۔ ملک کے سارے مدرسے اس جنگ میں شامل ہیں اگر پاکستانی فوج جو امریکیوں کی فوج ہے اس جنگ میں نہیں جائے گے تو نہ جائے ہمارے مجاہد یہ جنگ لڑیں گے اور اس وقت تک لڑیں گے جب تک اسلام کا جھنڈا ساری دنیا میں نہیں لہرائے گا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ سعودی عرب والوں نے خاص طور پر اس مدرسے کے شہید ہونے والے شاگردوں کے والدین کو اس حج میں سعودی عرب کا مہمان بنا کر بلایا ہے۔ عمر بھائی کے والدین بھی اس دفعہ حج کرنے جائیں گے۔

افغانستان کی یہ جنگ میرے لیے کشش کھو چکی تھی۔ مجھے اپنے والد کو حج کرانے کا شوق

بھی نہیں تھا نہ ہی شہید ہونے کا اور نہ ہی اس جنگ کو لڑنے کا جس میں عمر بھائی شامل نہیں رہے تھے۔ میں نے پھر بھاگنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اس دفعہ ریلوے اسٹیشن جا کر لاہور کی ٹرین پر بیٹھ جاؤں گا۔

میں بچ کر نکل گیا' مگر صبح سویرے ٹرین نہیں پکڑ سکا۔ میں اس چھوٹے سے اسٹیشن پر چھپا ہوا بیٹھا اگلی ٹرین کا سوچ رہا تھا کہ گھر سے واپس آنے والے ایک طالب علم نے مجھے دیکھ لیا تھا اور جب مدرسے میں میری تلاش ہوئی تو اس نے بتا دیا تھا کہ میں اسٹیشن پر ہوں۔

مجھ پر یکایک حملہ ہوا تھا۔ ریل کے آنے سے دس پندرہ منٹ قبل ناظم' مدرسے کے پانچ اور لوگوں کے ساتھ آیا تھا اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر مجھے سامان کی طرح ٹرک میں پھینک دیا۔ جب میری پیشی مولوی صاحب کے سامنے ہوئی تھی تو میں پہلے ہی آدھا مر چکا تھا۔

جب دوسری دفعہ میری آنکھ کھلی تھی تو رات کا اندھیرا ہو رہا تھا اور چاروں طرف خاموشی تھی۔ عشا کے درس کے بعد سب لوگ سو چکے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کیے فیصلہ کیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے مجھے اس جہنم سے بھاگنا ہے۔

میرے ہاتھوں میں زنجیریں بندھی ہوئی تھیں اور ناظم دوسری چارپائی پر سو رہا تھا۔ میں سوچتا رہا تھا پھر فیصلہ کر کے میں نے ناظم کو آواز دی تھی۔ ناظم مجھے پیشاب لگا ہے۔ خدا کے لیے پیشاب کرنے دو ورنہ یہیں خطا ہو جائے گا۔

ناظم آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا تھا۔ طاق پر سے چابی اٹھائی اور مجھے آزاد کر دیا تھا کہ میں پیشاب کر لوں۔ وہ اٹھ کر میرے ساتھ ساتھ دالان کے باہر تک آیا تھا۔ اقامت گاہ میں سخت سناٹا تھا میرے جسم میں ہر طرف درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں لیکن میرے اندر کا درد اتنا شدید تھا کہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج کی رات یہاں سے نکل جاؤں گا یا پھر اپنی جان دے دوں گا۔ پیشاب خانے جاتے ہوئے میں نے دیکھ لیا تھا کہ لوہے کا ہتھوڑا دروازے کے ساتھ ہی پڑا ہوا تھا جو کہ میں نے ہی ٹھونکنے پیٹنے کے کام کے لیے اپنے پاس رکھا تھا۔ نہ جانے مجھ میں کہاں سے اتنی طاقت آئی تھی۔ میں واپس آیا اور نظام سے کہا تھا کہ مجھے دوبارہ زنجیر سے باندھ دے ورنہ صبح مولوی صاحب ناراض ہوں گے۔ اس نے جواب دیا تھا کہ وہ یہی کرنے جا رہا ہے اور جیسے ہی وہ زنجیر اٹھانے کے لیے مڑا' میں نے ہتھوڑا اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ اس کی آواز تک نہیں نکلی اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر گیا۔ اس کی جیب میں تین سو ستر روپے تھے - میں نے روپے نکال لیے تھے۔ اپنی خون آلود شلوار قمیض بھی اتار کر کمرے میں پھینک دی تھی اور ٹین کے بکسے سے نئی شلوار قمیض نکال کر پہنی تھی اور دعا مانگی میرے مالک' میرے اللہ یا تو مجھے یہاں

سے نکال دے یا پھر موت دے دے پھر آہستہ آہستہ مدرسے کی حدود سے باہر نکل گیا تھا۔ تقریباً" آدھا میل کتوں کے بھونکنے کے خوف سے آہستہ آہستہ چلتا رہا تھا۔ تھوڑا فاصلہ پورا ہونے کے بعد میں اپنی تمام طاقت سے درد اور تکلیف کو بھول کر دوڑ پڑا تھا۔ بڑی سڑک پر پہنچتے پہنچتے میری سانس بُری طرح سے پھول گئی تھی اور میں روڈ کے کنارے گر پڑا۔ رات کے دو تین بجے ہوں گے۔ ڈامر کی پکی سڑک چاندنی رات میں چمک رہی تھی۔ میں مولوی صاحب کے خوف سے پڑا ہوا سوچ رہا تھا کہ فجر کی نماز سے پہلے پہلے مجھے دور نکل جانا چاہیے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ نہیں، بلکہ سڑک سے دور ملتان اور لاہور کی طرف نہیں، بلکہ کراچی کی طرف۔ یہ میرا آخری موقعہ ہے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دور سے ایک گاڑی کی روشنی دکھائی دی میں تذبذب میں تھا کہ اسے ہاتھ دکھا کر روکوں کہ نہ روکوں کہ گاڑی کی رفتار خود ہی آہستہ ہو گئی۔ یہ ایک ٹرک تھا۔ میں جن جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا اس سے ذرا سا آگے یہ ٹرک آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ دروازہ کھلا تھا اور مجھے آواز آئی تھی کسی نے کہا تھا جلدی کرنا۔ صرف چھوٹا کرنا بڑے کا ٹائم نہیں ہے۔ دوسرے نے ہنستے ہوئے کہا تھا چھوٹا ہی کروں گا۔ گھبرائیں نہ بہت ٹائم ہے۔

ٹرک کا انجن چل رہا تھا اور یکایک میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ ڈرائیور کے پیشاب سے پہلے میں بھاگ کر ٹرک میں سوار ہو چکا تھا۔ اندر بھینس گائے اور بکریاں بندھی ہوئی تھیں۔ جگالی کرتی ہوئی یہ بھینس تھوڑی دیر کے لیے بے کل ہوئی تھیں مگر ٹرک کی حرکت کے ساتھ ہی مجھے بھی انھوں نے ایک مسافر کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ میں نے ایک لمبی سانس لی خوف اور حقارت سے پیچھے رہ جانے والی سڑک کے بھی پیچھے رہ جانے والے مدرسے کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

میں آزاد ہو گیا تھا، آزاد بالکل آزاد!

میں چلتے ہوئے ٹرک کے کونے میں لگا ہوا تھا اور مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ مجھے سخت بھوک لگی ہے اور سخت پیاس بھی اور ساتھ ہی مجھے نیند آگئی تھی۔

مجھے پتا نہیں وہ کون سی جگہ تھی۔ صبح روشنی کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ ٹرک ایک ہوٹل کے سامنے رکا تھا۔ وہاں پر کئی اور ٹرک بھی کھڑے ہوئے تھے۔ ہوٹل کے اندر اور باہر بہت ساری چارپائیاں بچھی ہوئی نظر آئی تھیں اور ٹرکوں کے ڈرائیور کلینزوں کے ساتھ بیٹھے چائے اور پراٹھے کھا رہے تھے۔ ٹرک کے رکتے ہی وہ دونوں کھانستے ہوئے مفلروں سے اپنی گردنوں کو چھپاتے ہوئے نکلے تھے۔ وہ دونوں سیدھے ہوٹل میں چلے گئے تھے۔ ٹرک اس طرح سے کھڑا تھا کہ مجھے نکلنے میں زیادہ مشکل نہیں ہوئی تھی۔ میں اتر کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہوٹل کی طرف گیا

تھا۔ وہاں پر کوئی پیشاب خانہ نہیں تھا۔ ہوٹل کے ساتھ ہی ایک نالہ سا تھا جہاں پر وہ دونوں شاید پیشاب کرنے چلے گئے تھے۔ میں نے ہوٹل کے سامنے رکھے ہوئے مٹی کے بڑے بڑے مٹکوں سے پانی نکالا اچھی طرح سے منہ دھویا بالوں کو صاف کیا تھا۔ گزشتہ دن کے زخم پر پانی لگنے سے جلن سی ہوئی تھی مگر خون کا صاف کرنا ضروری تھا۔ آگے نہ جانے کیا ہوتا ہے۔ اب تو ناظم بھی اٹھ گیا ہوگا۔ اور سب تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہوں گے' مجھے جھرجھری سی آئی تھی۔ نہ جانے کب اور کیسے کراچی پہنچوں گا۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب کبھی بھی اپنے خاندان کو ملتان نہیں آکر ملوں گا۔ میری زندگی وہ نہیں ہوگی جو وہ چاہتے ہیں' وہ ہوگی جو میں چاہتا ہوں۔ میں کیا چاہتا ہوں مجھے پتا نہیں تھا۔

ہاتھ منہ دھو کر میں ان کی ہی چارپائی پر جاکر بیٹھ گیا تھا اور ہوٹل والے کو چائے اور پراٹھے کا بولا تھا۔ وہ دونوں بھی چائے پراٹھا ہی کھا رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر دونوں مسکرائے تھے۔ میں بھی مسکرایا تھا۔ میں نے پوچھا تھا کہاں جا رہے ہیں؟

"قربانی کے جانور لے کر کراچی جا رہے ہیں بادشاہو۔ تسی کہاں جا رہے ہو مولوی صاحب۔"

"میں بھی کراچی ہی جا رہا ہوں۔ مگر جس ٹرک پر آیا تھا وہ یہاں سے میرا بکس لے کر اور مجھے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔" میں نے جواب دیا تھا۔

کوئی گل نہیں ہے۔ تسی ہمارے ساتھ چلو ڈرائیور نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔" جگہ تھوڑی ہوگی مگر فکر کی گل نہیں ہے' ہم آپ کو بغیر کرائے کے لے جائیں گے۔"

اس دفعہ میں ان کے ساتھ ٹرک میں آگے ہی بیٹھا تھا۔ ڈرائیور کا نام سلامت اور کلینر کا نام گلو تھا۔

ٹرک کے چلتے ہی گلو نے چرس سے بھری ہوئی سگریٹ سلگائی تھی اور ڈرائیور کو دے دی تھا۔ ڈرائیور نے چار پانچ لمبے لمبے کش بھرے تھے پھر گلو کو واپس دے دی اور کہا کہ مولوی صاحب کو بھی پلاؤ نہ یار۔

میں نے ہنس کر منع کر دیا تھا۔ وہ دونوں شریف لوگ تھے میری ظاہری شکل و صورت کو دیکھ کر مجھے مولوی ہی سمجھتے تھے اور عزت سے بات کرتے رہے تھے۔ راستے بھر وہ لوگ اپنی باتیں کر رہے تھے۔ ٹرکوں اور پولیس والوں کے قصے۔ سندھ میں ڈاکوؤں کے قصے۔

پھر میں نے ہی ان سے پوچھا تھا کہ کراچی میں رہنے کی جگہ کہاں مل جائے گی۔ مجھے جا کر اپنے ماموں کو تلاش کرنا ہے۔ وہ حبیب بینک میں چوکیدار ہے۔ اس کا پتا بھی میری کاپی میں تھا جو بکسے میں باقی پیسوں کے ساتھ رہ گیا ہے۔

دونوں نے ایک ساتھ ہی بھاگنے والے ٹرک ڈرائیور کو گالی دی تھی۔" خراب زمانہ آگیا ہے مولوی صاحب، خراب زمانہ۔"

میں خاموش رہا تھا۔" تسی گھبراؤ نہیں جناب، کراچی میں ماری پور روڈ پر ٹرکوں کا اڈا ہے، وہاں ہم بھی رہیں گے اور آپ کے لیے بھی اپنے ساتھ انتظام کر دیں گے۔ فکر کی کوئی گل بات نہیں ہے۔"

گیارہ بجے وہ لوگ ایک اور اڈے پر رکے تھے۔ یہاں انھوں نے دو گھنٹے سونے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ میں نے جانوروں کو پانی پلانے اور چارہ دینے میں گلو کی مدد کی تھی۔ ٹرک باہر ہی کھڑا تھا اور وہ دونوں اڈے کے پیچھے ایک بڑے سے کمرے میں جا کر سو گئے تھے۔ جہاں پہلے سے کچھ اور ڈرائیور بھی سو رہے تھے۔ نیند مجھے بھی آرہی تھی میں ان سے پوچھ کر ڈرائیور کی سیٹ پر سو گیا تھا۔ تین گھنٹے تک میں گہری نیند سویا تھا۔ مجھے گلو نے جگایا تھا۔

ہاتھ منھ دھو کر ہم تینوں نے ساتھ ہی کھانا کھایا تھا اور پھر سفر دوبارہ شروع ہو گیا تھا۔

ہم لوگ دوبارہ حیدر آباد سے نکل کر رکے تھے۔ رات کا کھانا کھایا تھا۔ میں نے بہت ضد کر کے اس دفعہ کھانے کے پیسے دیے تھے۔ ان دونوں نے بُرا مانا مگر میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ اب اگر ان پر بوجھ بنوں گا تو پھر آئندہ کے لیے مشکل ہو جائے گی میرا تو کراچی میں یہی لوگ سہارا تھے۔

وہ لوگ سہارا ہی ثابت ہوئے۔ رات گیارہ بجے کراچی سے پہلے ایک جگہ پر انھوں نے سارے جانور اتارے پھر ماری پور کے ٹرک اڈوں کی طرف نکل گئے تھے۔

رات کے وقت کراچی میں جب ٹرک داخل ہوا تھا تو مجھے ایسا لگا تھا کہ اب میں مکمل آزاد ہو گیا ہوں۔ اتنی روشنی میں نے زندگی میں کبھی بھی نہیں دیکھی تھی۔ گلو مجھے بتاتا جا رہا تھا یہ سہراب گوٹھ ہے، یہ عائشہ منزل ہے، یہ لیاقت آباد ہے، تین ہٹی کا پل ہے، یہ گرومندر ہے یہ قائداعظم کی قبر بندر روڈ پر۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں سڑکوں پر پھر رہا ہوں، رات کا وقت تھا اور سڑکیں خالی پڑی ہوئی تھیں۔ ہم لوگ تیرتے ہوئے ماری پور کے ٹرکوں کے اڈے پر پہنچ گئے تھے۔ رات گئے پھر کھانا کھایا تھا اور وہاں ہی ایک اڈے پر ہمیں چارپائیاں مل گئی تھیں جہاں ہم سو گئے تھے۔

سلامت اور گلو سے میری دوستی ہو گئی۔ انھوں نے مجھے کراچی میں جینے کے طریقے بتائے۔ وہیں ٹرکوں کے ایک اڈے پر میں ہوٹل میں کام کرنے لگا تھا۔ صبح سے شام تک۔ اب تو مجھے سال بھر ہونے کو آرہا ہے۔ یہاں بہت سے بچے میری طرح سے ہی کام کرتے ہیں اور

روشنیوں کے اس شہر میں، گلو اور سلامت جب بھی کراچی آتے ہیں مجھ سے ضرور ملتے ہیں۔ انھیں میں نے بتا دیا ہے کہ میرا ماموں مجھے نہیں ملا ہے۔

مجھے مدرسے کی کوئی بات یاد نہیں رہی ہے سوائے مولوی صاحب کی اس بات کے کہ باہر کی دنیا بہت خراب ہے۔ باہر کی دنیا بہت خراب ہے۔ ماری پور روڈ کا یہ ٹرکوں کا اڈا بھی۔ اگر میری چھوٹی سی داڑھی نہیں ہوتی، اگر مجھے سلامت اور گلو نہیں ملے ہوتے تو میرے ساتھ بھی وہی کچھ ہوتا جو یہاں پر کام کرنے والوں بچوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ٹرکوں کے اس جنگل میں ڈرائیور ان لاوارث بچوں کے ساتھ "بہت کچھ" کر گزرتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں نے کتنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو، کام کرنے والے معصوموں کو، وقت سے پہلے بچپن سے روٹھ جانے والے ماؤں اور باپوں کی آنکھ کے تاروں، کو وحشیوں کے ہاتھوں پامال ہوتے دیکھا ہے۔ میں ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو جیسے میرے گلے میں کوئی پھندہ سا پڑ جاتا ہے میرے سر سے لے کر نیچے بہت نیچے ریڑھ کی ہڈی تک ایک کسک سی اٹھتی ہے اور میں خوف سے کانپ کانپ جاتا ہوں۔ مجھے مولوی صاحب یاد آتے ہیں، ان کا مدرسہ یاد آتا ہے اور ان کی باتیں یاد آجاتی ہیں۔

مولوی صاحب کے اس مدرسے میں میرے ساتھ سب کچھ ہوا تھا لیکن "بہت کچھ" نہیں ہوا تھا۔ وہ صحیح کہتے تھے۔ باہر کی دنیا بہت خراب ہے۔ باہر کی دنیا واقعی بہت خراب ہے۔

نیلوفر

پارسی لڑکیوں کو دیکھنے ہم لوگ ماما پارسی اسکول کے سامنے کھڑے ہوجاتے تھے۔ میں اس وقت سندھ مدرسے میں پڑھتا تھا۔ دادو سے میرے والد نے مجھے کراچی پڑھنے بھیجا تھا۔ سولجر بازار میں بھگوان داس بلڈنگ میں ایک فلیٹ میرے دادا نے خریدا تھا۔ علاقے میں مسلمانوں کی بہت زیادہ آبادی نہیں تھی مگر زمین دار خاندانوں کے مسلمانوں کے گھر تھے۔ میں وہاں اپنے تایا زاد بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ ہم دونوں ہی سندھ مدرسہ میں تعلیم حاصل کررہے تھے اور اب ہمارا آخری سال تھا۔ چھٹی کی گھنٹی بجتے ہی ہم لوگ چند دوسرے دوستوں کے ساتھ مل کر محمد علی ٹراموے کمپنی کی ٹرام پکڑ کر این جے ڈی اسکول کے سامنے اتر جاتے تھے۔ ٹراموے کمپنی کے زیادہ تر کنڈیکٹر ہمیں جان گئے تھے۔ کبھی وہ ٹکٹ کے پیسے مانگتے نہیں تھے اور جب مانگتے تھے تو ہم پیسے دے بھی دیا کرتے تھے۔ ایک طرح کی Understanding تھی ہمارے درمیان۔ وہ زمانہ غنڈہ گردی اور بدمعاشی کا زمانہ نہیں تھا۔ کراچی میں قانون کی بڑی پاسداری تھی۔ ہر شہری کی بڑی عزت تھی۔ غریب ہو یا امیر، مسلمان ہو یا پارسی، عیسائی، ہندو، سندھی ہو یا غیر سندھی۔ قانون ایسے تھے کہ اب میں سوچتا ہوں کہ ایسا کیسے ممکن تھا مثلاً" محمد علی ٹراموے کمپنی کے یہاں ٹرام گرمیوں کے زمانے میں ساڑھے پانچ بجے چلتی تھی۔ شہر کی خوب صورت صاف ستھری سڑکوں کے درمیان چار اور پانچ منزلوں والی بلڈنگوں سے ہوتی ہوئی کیماڑی کی طرف جاتی تھی مگر شہر کے قانون کے مطابق سات بجے سے پہلے ڈرائیور کو گھنٹی بجانے کی اجازت نہیں تھی۔ بلڈنگوں میں سوئے ہوئے شہریوں کا اتنا احترام ہوتا تھا، اب تو سڑکوں پر چلنے والے جاگتے ہوئے شہریوں پر دھواں، ہارن اور گالیوں کی بھرمار جس طرح سے ہوتی ہے وہ سب کو سہنا ہے۔ شہر اب شہر نہیں ہے، جنگل ہے جنگل۔

اس وقت کراچی میں فرنگی عورتوں کے علاوہ صرف پارسی لڑکیاں ہی اسکرٹ پہنتی تھیں۔

ماما پارسی اسکول کی عمارت اتنی ہی شان دار تھی جتنی اب ہے۔ یہ لڑکیاں مسکراتی، چھلکتی اور ہنستی ہوئی جب اسکول سے باہر آتی تھیں تو بندر روڈ پر ایک میلے کا سا سماں ہو جایا کرتا تھا۔ کچھ لڑکیاں گھوڑا گاڑیوں پر بیٹھ کر اپنے گھروں کو جاتی تھیں اور کچھ لڑکیاں ٹراموں پہ سوار ہو جاتی تھیں۔ چند ایک لڑکیوں کے لیے گاڑیاں بھی کھڑی ہوتی تھیں۔

ہم لوگ این جے وی اسکول کے سامنے اتر کر آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے وائی ڈبلیو سی اے کی عمارت کے سامنے پہنچ جایا کرتے تھے، جہاں کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے گپ مارتے تھے اور کبھی کن انکھیوں سے، کبھی سر اٹھا کر بالمشافہ اسکول کی ان لڑکیوں کو دیکھا کرتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ٹریفک کا مجمع چھٹ جاتا تھا تو صدر سے آنے والی پریڈی اسٹریٹ کو پار کرتے ہوئے ہم لوگ پلازہ سینما کی جانب چلے جایا کرتے تھے۔ جہاں سے ٹرام پر بیٹھ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے جانے کا ایک معمول سا ہو گیا تھا۔

یہ سارا کام ایک احساسِ جرم اور احساسِ شرمندگی کے ساتھ ہوتا تھا۔ کلاس کے چند اور لڑکوں کو ہمارے اس معمول کا پتا تھا اور وہ لوگ ہمیں بدمعاش سمجھا کرتے تھے۔ ہمارا بھی یہی خیال تھا کہ ہم لوگ کچھ اچھا نہیں کرتے ہیں، مگر کتنی دفعہ سوچنے کے باوجود کہ یہ سب کچھ چھوڑنا ہو گا، ہم یہ عادت نہیں چھوڑ سکے تھے کہ یکایک نیلوفر اس تصویر میں آگئی تھی۔

وہ عام سی پارسی لڑکی تھی۔ گول سا چہرہ جس پر بہت نمایاں دو چمکدار آنکھیں اور پتلی سی ناک۔ وہ اسکول سے نکلتی تھی، چاروں طرف نگاہ ڈالتی تھی اور سڑک کے کنارے دو اور لڑکیوں کے ساتھ کھڑی ہو جاتی تھی۔ ٹن ٹن کرتی ہوئی ٹرام جو سولجر بازار کو جا رہی ہوتی تھی اس پر وہ تینوں بیٹھ جایا کرتی تھیں۔

میں نے اسے پہلے دن سے ہی تاڑ لیا تھا، اور لڑکے کیا کرتے تھے مجھے خیال نہیں ہے لیکن میں بڑی بے چینی کے ساتھ نیلوفر کے آنے کا انتظار کرتا تھا۔ اس وقت تو مجھے اس کا نام پتا نہیں تھا مگر میں نے دل ہی دل میں اس کا نام آنکھوں والی رکھ دیا تھا۔ یہ یک طرفہ عشق خاموشی سے چلتا رہا اور آہستہ آہستہ وہ میرے حواس پہ سوار ہوتی چلی گئی۔ نہ میرا دل پڑھائی میں لگتا تھا اور نہ کسی اور کام کاج میں۔ اسکول بھی میں اسی لیے جاتا تھا کہ پھر اسکول کی چھٹی ہو گی اور پھر ماما پارسی اسکول کے سامنے سے آنکھوں والی کو دیکھوں گا۔

اس دن لائٹ ہاؤس سینما اور سندھ جاگیردار ہوٹل کے سامنے ٹرام رک گئی تھی۔ ایک گھوڑا گاڑی میں گاڑی بان نے ایک زخمی گھوڑا جوتا ہوا تھا۔ نہ جانے کیا ہوا تھا کہ ٹرام کی پٹڑی کے ساتھ ہی وہ یکایک گر گیا۔ گھوڑے بان اور ٹرام کے ڈرائیور کی مدد سے وہ کھڑا ہوا ہی تھا کہ

کے ایم سی کا ایک آدمی آ گیا تھا جس نے زخمی گھوڑا چلانے پر گاڑی بان کا چالان کر دیا۔ جس کے بعد گھوڑا گاڑی کے مسافر تکرار کرتے ہوئے ٹرام میں سوار ہونے لگے۔ گاڑی بان نے گاڑی گلی میں کھڑی کی اور کراچی میونسپل کارپوریشن کے آدمی کے ساتھ گھوڑا لے کر جانوروں کے ہسپتال کی طرف جانے لگا تھا۔ اس تمام کاروائی میں دس پندرہ منٹ لگ گئے ہوں گے، مگر مجھے ایسا لگا تھا کہ آج کی تمام محنت پانی میں مل گئی اور وہ آنکھوں والی تو شاید چلی بھی گئی ہو۔

میں جب وہاں پہنچا تھا تو وہ اپنی جگہ پر کھڑی تھی جیسے میرا انتظار کر رہی ہو۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ مجھے پہلی دفعہ ایسا لگا تھا کہ وہ بھی میرا انتظار کرتی ہے۔ وہ بھی میری راہ دیکھتی ہے، اسے بھی احساس ہے کہ اس کے لیے کوئی کھڑا ہوتا ہے۔ وہ دن ایک خوب صورت دن ثابت ہوا تھا۔ جن لوگوں نے اسکول کی عمر میں محبت کی ہے وہی لوگ اس خوشی، اس مسرت، اس اطمینان کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ اس دن میں بے بات ہنسا تھا اور بے وجہ مسکرایا تھا۔ شام، رات ایسی خوب صورت تھی کہ جیسے پہلے کبھی ہوئی ہی نہ ہو۔

میں نے اس دن اپنے کزن مراد کو بھی یہ بات بتائی۔ وہ جلتا ہوا آدمی تھا۔ اس نے کہا کہ یار آنکھ مچولی اور دیکھنا دکھنا صحیح، لیکن یہ باضابطہ عشق نہیں چلے گا۔ تم مسلمان ہو اور وہ پارسی ہے۔ تمہارا باپ، میرا باپ کبھی نہیں مانیں گے۔ ہم دونوں مسکرا دیے اور دیر تک ہنستے رہے۔ میں نے کہا تھا یار ابھی تو اس نے صرف دیکھا ہے، تم کس دنیا کی بات کر رہے ہو، لیکن مجھے اندر سے پتا تھا کہ میں نے نیلوفر اور اپنے متعلق، بے اندازہ، بہت سارے خواب دیکھے ہیں۔

اسکول چلتا رہا، ٹرام چلتی رہی۔ اس طرح سے ہم دوست ماما پارسی اسکول کے سامنے کھڑے ہو کر پارسی لڑکیوں کو تکتے رہے اور دل کی بے چینی دھیرے دھیرے بڑھتی رہی۔ ہمارے کلاس ٹیچر تھے ماسٹر غنی صاحب۔ ایک دن انھوں نے مجھے اسٹاف روم میں بلالیا۔ پرنسپل کے کمرے کے ساتھ ہی کشادہ سا اسٹاف روم تھا۔ انھوں نے کہا، پڑھنے پر توجہ نہیں دے رہا ہوں۔ کچھ خرابی ہوگئی ہے کہیں پر میرا کام صحیح نہیں ہے۔ وہ بہت شفیق استاد تھے، بہت مہربان۔ بہت دل چاہا کہ دل کھول کر رکھ دوں ان کے سامنے۔ بتادوں کہاں خرابی ہوئی ہے۔ کدھر کام صحیح نہیں ہے، اگر وہ پارسی نہ ہوتی تو شاید بتا ہی دیتا۔ سر جھکا کر ان کی بات سنی تھی اور ان سے جھوٹا وعدہ کیا تھا کہ اب شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔

مراد نے تسلی دی، مگر مشورہ بھی دیا تھا کہ اب یہ کھیل ختم کیا جائے، مگر کھیل ختم نہیں ہوا تھا۔ ایک رات پہلے ہی تو میں نے نیلوفر کے نام خط لکھا تھا اور اسی روز میں لپک کر ٹرام پر

چڑھ گیا تھا، اسی ٹرام پر جس پر نیلوفر بیٹھتی تھی۔ کانڈا والا بلڈنگ کے سامنے، آگے جہاں وہ بیٹھی تھی، میں بالکل اس کے پیچھے پہنچ گیا۔ اس نے مجھے دیکھا، وہ اور اس کی سہیلی دونوں مسکرائے۔ بہت کوششوں اور خواہش کے باوجود عطر سے لگا ہوا وہ لفافہ میں اسے نہیں دے سکا تھا۔

چار پانچ دن ایسے ہی گزر گئے تھے۔ اس دن نہ جانے کیا بات ہوئی کہ ٹرام بالکل خالی تھی۔ میں اور مراد دو تین اور آدمی پیچھے کی طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نیلوفر کو دیکھ کر مسکرایا۔ وہ بھی مسکرائی اور وہ مڑا تڑا ہوا لفافہ میں نے اس کے پیروں پر ڈال دیا اور اس نے مسکرا کر کچھ گھبرا کر اسے اٹھالیا۔

پھر خطوں کے تبادلے شروع ہو گئے۔ وہی دنیا جہان کی باتیں، جو محبت کرنے والے لکھتے ہیں۔ وعدے، قسمیں، ساتھ نبھانے کی باتیں اور نہ جانے کیا کیا۔

نیلوفر کے والد امیر نہیں تھے۔ وہ ایک پارسی وکیل کے آفس میں سیکریٹری کا کام کرتے تھے اور پارسی کالونی کی ایک بلڈنگ میں رہتے تھے۔ نیلوفر کی زندگی سادہ زندگی تھی، مگر اس کا حسن سادہ نہیں تھا۔ اس کا انداز پیچیدہ تھا، اس کی ادائیں قاتل تھیں اور اس کا لہجہ ختم کردینے والا تھا۔ اس سے بات کرنے سے قبل، بہت قبل، صرف خطوں کے تبادلے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ میرے لیے ہی بنائی گئی تھی۔ ہم دونوں وقت کے ساتھ ساتھ محمد علی ٹراموے کمپنی کی ٹرام پر سفر کرتے کرتے زندگی کے سفر میں ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔

پھر سب کچھ یکایک ہو گیا تھا۔ کئی سال پرانا واقعہ مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے جیسے کل کا واقعہ ہو۔ رات دیکھی ہوئی کوئی فلم، ابھی کسی کی سنائی ہوئی کہانی۔ ہوا یہ کہ نہ جانے کیوں میں نے یکایک فیصلہ کرلیا کہ نیلوفر سے کورٹ میرج کرلیتا ہوں۔ یہی سارے مسائل کا حل نظر آتا تھا۔ اسکول سے فارغ ہو کر میں نے سوچا تھا کہ قانون پڑھوں گا، مگر میرے والد کا خیال تھا کہ مجھے پہلے بمبئی جا کر کچھ پڑھنا چاہیے۔ اس کے بعد چاہے میں انگلینڈ چلا جاؤں۔ مجھے نہ بمبئی جانے کا شوق تھا اور نہ ہی انگلینڈ جانے کی تمنا۔ میں تو کراچی میں رہنا چاہتا تھا۔ نیلوفر کے آس پاس۔ جن دو دوستوں سے مشورہ کیا، پہلے تو ان کی سمجھ میں ہی کچھ نہیں آیا مگر جب میں نے اپنی بات سمجھائی تو دونوں کا یہی مشورہ تھا کہ اگر نیلوفر راضی ہے تو کورٹ میرج کرلو۔ ایک دفعہ یہ ہو جائے گا تو دونوں خاندانوں کو راضی ہونا پڑے گا۔ مراد بھی راضی ہو گیا اور طے یہ ہوا کہ میں نیلوفر سے بات کرکے اسے اپنے فلیٹ میں لے آؤں گا، پھر کراچی کے سول کورٹ میں سب کچھ طے ہو جائے گا۔ چمن لال جو میرا بڑا یار تھا اس نے اپنے وکیل ماموں سے بات کی تھی۔ پہلے تو وہ سمجھانے لگ گئے تھے مگر جب انھوں نے مجھ سے بات کرلی اور انھیں اس کا اندازہ ہو گیا کہ میرے جذبے

ہر طاقت سے زیادہ طاقت ور ہیں تو انھوں نے ہر قسم کی مدد کا وعدہ کر لیا، مگر اس شرط کے ساتھ کہ انھیں کسی بھی قسم کی کوئی فیس نہیں دی جائے گی بلکہ عدالت کے جملہ اخراجات بھی وہی اٹھائیں گے۔

پھر سب کچھ پلان کے مطابق ہی ہوا تھا۔ نیلوفر میرے ساتھ اس بلڈنگ کے فلیٹ میں چلی آئی اور دوسرے دن کی صبح کا وقت عدالت میں مقرر بھی ہو گیا، مگر اسی شام میرے والد بھی نہ جانے کیسے پہنچ گئے۔ یہ مجھے جلد ہی پتا چل گیا کہ مراد نے انھیں خبر کی تھی، پھر میں نے کبھی بھی مراد سے بات نہیں کی تھی۔

وہ شام اور رات میری زندگی کی آخری رات ثابت ہوئی تھی۔ میں کمرے میں نیلوفر اور مراد کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور خوش تھا کہ معرکہ سر ہو چکا ہے اور کل صبح کے بعد سب کچھ بدل جائے گا کہ اتنے میں دروازہ کھلا اور میرے والد، میرے دو چچا اور ایک ماموں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ انھوں نے نیلوفر سے کہا کہ دوسرے کمرے میں چلی جائے۔ اس کے بعد مجھے یاد ہے کہ انھوں نے سب کچھ کہا اور ایک وہ تھپڑ تو میں آج تک نہیں بھولا ہوں، سالوں ان پانچ انگلیوں کی جلن میرے گالوں پر ہوتی رہی ہے۔ میری ضد، میرا غصہ، میری چیخ و پکار میرا رونا کسی کا بھی کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔

مجھے میرے کمرے میں بند کر کے میرے دونوں چچا باہر بٹھا دیے گئے اور میرے والد میرے ماموں کے ساتھ چلے گئے۔ جب وہ دونوں نیلوفر کے گھر پہنچے تو وہاں کہرام مچا ہوا تھا۔ نیلوفر کی دوست جینو نے بتا دیا تھا کہ نیلوفر کا سلسلہ کسی مسلمان سے چل رہا تھا اور وہ میرے ساتھ چلی گئی تھی۔ اسے میرے گھر کا تو پتا نہیں تھا، اسے جتنا پتا تھا اتنا ہی اس نے انھیں بتا دیا تھا۔ نیلوفر کے گھر پر نیلوفر کے باپ کے دوست موجود تھے اور یقینی طور پر باتیں ہو رہی تھیں کہ کس طرح سے اس مسئلے کو حل کیا جائے۔ میرا باپ وہاں مجرم کی طرح گیا تھا۔ سر جھکا کر آنکھیں نیچی کر کے میرے کیے پر معافی مانگنے کے لیے۔

رات کے اندھیرے میں میرے ماموں اور باپ کے ساتھ نیلوفر کا باپ اور کچھ رشتہ دار آئے تھے۔ مجھ سے کچھ کہے بغیر، مجھ سے کچھ سنے بغیر، انھوں نے نیلوفر کو اس کے باپ کے حوالے کر دیا اور وہ لوگ خاموشی سے بھگوان داس بلڈنگ چھوڑ کر چلے گئے۔ دوسرے دن ہی مجھے لے کر میرے گھر کا قافلہ دادو واپس آ گیا۔

نیلوفر میرے دل سے نکلتی نہیں تھی اور سب کچھ میری زندگی سے نکل گیا تھا، میرا مستقبل کا پڑھنا، زندگی کے سارے پلان۔ میرا غصہ آہستہ آہستہ مجھے کھا گیا تھا۔ پھر ایک دن مجھے

پتا لگا تھا کہ نیلوفر کی شادی کسی بہرام جی سے ہوگئی تھی۔ پھر پاکستان بن گیا تھا اور تھوڑی سی دیر میں اتنا کچھ ہوگیا تھا کہ وقت کا احساس تک نہیں ہوا۔ چھ سال کے بعد میں پھر کراچی گیا تھا۔

کراچی بہت بدل گیا تھا۔ ہندوستان سے آئے ہوئے بے شمار مہاجروں نے کراچی کو پھیلا دیا تھا۔ نئی نئی کالونیاں بن گئی تھیں۔ عجیب عجیب شکل کے گندے گندے لوگوں نے پان تھوک تھوک کر کراچی کی صاف ستھری سڑکوں کو گندگی کا ڈھیر بنا دیا تھا۔

جہاں جانور پانی پیتے تھے وہاں انسان نہا رہے تھے۔ چھ سال میں کراچی کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا اور کیسا ہوگیا تھا۔ مگر میرا غم ویسا ہی تھا' میری بے قرار نگاہیں نیلوفر کو تلاش کر رہی تھیں۔

ماما پارسی اسکول کے سامنے گھنٹوں کھڑا رہا اور بلڈنگ کو تکتا رہا۔ سڑکوں پہ آوارگی کرتا رہا اور نیلوفر کے بارے میں سوچتا رہا۔ ٹرام پر بیٹھ کر سولجر بازار کے نہ جانے کتنے چکر کاٹے مگر وہ نہ ملی اور نہ ہی نظر آئی۔ دن ڈھلتے رہے اور راتیں بہت درد کی راتوں کی طرح گزرتی رہیں۔ رات کا کیا ہے' رات تو گزر جاتی ہے۔ سسکتی ہوئی' بلکتی ہوئی' بے چین' بے قرار' مجبور اور مجبور کرتی ہوئی۔ میں واپسی کا پروگرام بنا رہا تھا اور کینٹ اسٹیشن سے ٹرین کا ٹکٹ لے کر واپس آرہا تھا کہ صدر میں پارسیوں کی عبادت گاہ سے اسے نکلتے دیکھا تھا۔ وہی چہرہ' وہی قامت' وہی انداز مگر اس کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ میں پاگلوں کی طرح دوڑتا ہوا اس تک پہنچا۔ سڑک پر لمحوں کی وہ ملاقات نہ جانے کتنی طویل صدی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر تھرا گئی تھی۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے سر تاپا کانپ گئی ہو۔ اس کی ڈبڈباتی آنکھوں نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ اس نے بڑے زور سے اپنی بچی کو اٹھا کر سینے سے لگالیا۔ مجھے پتا لگ گیا تھا کہ اب سب کچھ ختم ہوگیا ہے اب کچھ نہیں ہوسکتا۔

وہ رات میری زندگی کی طویل ترین رات تھی۔ اس رات میں نے نیلوفر کھو دی تھی' وہ رات میری کراچی کی آخری رات تھی۔ پھر میں کراچی نہیں آیا۔ چالیس پینتالیس سال گزر گئے مگر میں کراچی نہیں گیا۔ میرا تھا ہی کیا کراچی میں۔

میں نے مزید پڑھا نہیں۔ شادی نہیں کی اور باپ کی زمینوں کو دیکھتا رہا۔ میرے باپ نے کئی کئی بار مجھ سے معافی مانگی تھی۔ میں نے اس تھپڑ کو تو معاف کر دیا تھا مگر نیلوفر سے میری جدائی کا جرم ناقابلِ معافی تھا۔ میرا بوڑھا باپ اس احساسِ گناہ کے ساتھ مر گیا۔

لیکن میں نے اب اسے بھی معاف کردیا ہے۔ مراد کو بھی معاف کردیا ہے۔ اب تو مراد اور زیادہ قابلِ معافی ہوگیا ہے۔ اس حد تک کہ اسے تو مدد کی ضرورت ہے۔ وہ بے چارہ ہے بے چارہ۔ پچھلے فسادات میں مراد کے بیٹے نواز بخش نے حیدر آباد سے ایک مہاجر لڑکی اغوا کرلی تھی۔ اسے محبت کا جھانسا دیا تھا پھر ایک رات اسے لے کر دادو چلا آیا تھا۔ جب مراد کو پتا چلا تو

اس نے کچھ نہیں کیا۔ اس کی زمینوں پر بنے ہوئے مکان میں اس کی مرضی سے نواز اور اس کے دوست اس مہاجر لڑکی کی عزت کو پامال کرتے رہے۔ پھر وہ لڑکی بھاگ گئی اور بھاگتے بھاگتے، چھپتے چھپتے، بچتے بچتے وہ ریل کی پٹڑی تک پہنچ گئی۔ جہاں سے اس کی کٹی ہوئی لاش ملی تھی۔

میں نے اس بچی کے ماں باپ کو دیکھا تھا۔ اخباروں میں ان کی تصویر چھپی تھی۔ ان کے چہرے کا کرب، ان کی زندگی کا درد، ان کے آنکھوں کی چمک، زندہ رہنے کی لگن، وہ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ موہن جوڈرو پر بھی وہ سناٹا، وہ مردنی نہیں ہے جو اس بڈھے کے چہرے پر تھی۔

مجھے پھر نیلوفر کی یاد آئی تھی۔ کراچی میرے سامنے آگیا۔ بھگوان داس بلڈنگ کا وہ فلیٹ۔ اس فلیٹ کے کمرے میں بیٹھی ہوئی نیلوفر۔ وہ ہندو دوست جس نے مجھے منع کیا تھا۔ وہی مراد اور اس کا باپ جو میرے باپ کے ساتھ آکر مجھے دادو لے آئے تھے۔ یہ وہی کراچی تھا، وہی سندھ جہاں میرے پرکھوں نے ایک بچی کو بچایا تھا اور اب وہی کراچی ہے، وہی سندھ۔ جانے کیا ہو گیا ہے لوگوں کو۔ میں اپنے باپ کی قبر پر گیا تھا، ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تھی۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے مجھے نیلوفر مل گئی ہے۔

جنّت نگاہ

گلی کے تیرہویں مکان میں پروفیسر صاحب رہتے تھے۔ اب تو وہ پروفیسر نہیں تھے بلکہ یونیورسٹی میں انتظامی شعبے کے نگراں تھے۔ مگر پروفیسر ان کے نام کا جزو ہو گیا تھا۔ ان کی زندگی اسکول میں تعلیم دینے سے شروع ہوئی تھی۔ اسکول میں پڑھاتے پڑھاتے انھوں نے یونیورسٹی سے ماسٹرز بھی کرلیا تھا اور اس درمیان میں طالب علموں کے لیے کوچنگ سینٹر بھی کھول لیا تھا۔ سرکاری اسکول میں پڑھانا کم لیکن سیاست، سازش اور ساز باز میں ان کا کمال تھا۔ تعلیمی بورڈ میں ان کے بڑے تعلقات تھے۔ کئی سال تک میٹرک کے امتحانات میں فرسٹ ڈویژن دلوانا ان کی ذمہ داری تھی۔ ان کے کوچنگ سینٹر میں پڑھنے والوں کو ایک خاص رقم کے عوض فرسٹ ڈویژن مل جایا کرتی تھی اور زیادہ اچھے نمبروں کے لیے اور زیادہ اچھی رقم کا بندوبست کرنا ہوتا تھا۔ ماسٹرز کرنے کے بعد انھیں یونیورسٹی میں لیکچرر کی نوکری مل گئی تھی اور انھوں نے اسکول چھوڑ دیا تھا۔ یونیورسٹی میں ان کے جوہر خوب کھلے تھے۔ وہ وائس چانسلر کے قریب اور اس طالب علم تنظیم کے ساتھ رہے جسے طاقت کے استعمال کا شوق تھا۔ کتنے ہی طالب علم ان کی مدد سے بغیر امتحان دیے پاس ہوئے تھے۔ بہت سوں کو انھوں نے پوزیشن دلائی تھی۔ جب وہ انتظامیہ کے بااثر رکن بنے تو انھوں نے یونیورسٹی کے کرپشن میں بڑا نام پیدا کیا۔ یونیورسٹی کی ایک لڑکی کے اغوا کے سلسلے میں بھی کافی دنوں تک ان کا نام لیا گیا۔ پروفیسر صاحب یونیورسٹی کی زمینوں کے بیچنے کے اسکینڈل میں بھی شامل تھے جہاں سے انھوں نے کافی پیسہ کمایا' ان کا شمار ماہرینِ تعلیم میں ہوتا تھا۔ وہ نظامِ تعلیم کے ایک مضبوط ستون تھے اور ان کا بڑا سا مکان اور بڑا سا لان اس گلی کے خوب صورت مکانوں میں سے ایک تھا۔

پروفیسر صاحب کے مکان کے سامنے ہی جج صاحب کا گھر تھا۔ جج صاحب نے وکالت شروع کرنے کے تھوڑے دنوں کے بعد ہی ایک لاکھ رشوت دے کر مجسٹریٹ کی نوکری حاصل کی تھی۔ وہ شروع سے ہی بڑے آدمی تھے۔ ہروقت ہر قسم کی مدد کرنے کو تیار رہتے تھے۔ قتل کے ملزم کی ضمانت سے لے کر اغوا اور آبرو ریزی کے ملزمان کی مدد کرنے تک ان کی ایک خاص فیس

تھی۔ انھوں نے کبھی بھی معاوضے کے عوض مدد کرنے سے انکار نہیں کیا تھا۔ یہی ان کی خوبی تھی جس کی بنا پر وہ ترقی کرتے چلے گئے تھے۔ حکومت کے اعلیٰ اہل کاروں نے ان کی خوبیوں کو جان کر اور انھیں پہچان کر ہائیکورٹ کا جج مقرر کر دیا تھا۔ وہ ہر حکومت کے قریب تھے۔ انھوں نے کبھی بھی کسی قسم کا بحران پیدا ہونے نہیں دیا تھا۔ مسائل کے حل کے لیے انھوں نے ایسے ہی فیصلے دیے تھے کہ طاقتوروں کو مزید طاقت ملی تھی۔ ان کی بہت عزت تھی۔ سارے سیاست دان ان سے دوستی رکھتے تھے۔ وہ معاملہ فہم تھے، زمانہ ساز تھے۔ زندگی کا سبق انھوں نے اچھے طریقے سے پڑھا تھا اور ہر ایک کو خوش رکھنے کی ان میں خداداد صلاحیت تھی۔ ہر بااثر اور قابلِ ذکر شخص کے ساتھ ان کے تعلقات تھے۔ شہر کے بڑے بڑے سیٹھ، ساہوکار، اسمگلر اور کالا دھندا کرنے والے ان کا خیال رکھتے تھے۔ ان کے بچے آکسفورڈ اور کیمبرج میں پڑھتے تھے اور آنے والے دنوں میں ان کا تقرر چیف جسٹس یا چیف الیکشن کمشنر کے طور پر ہونے والا تھا۔

جج صاحب کے برابر میں رشید صاحب کا مکان تھا۔ بڑا اور خوب صورت سایہ مکان رشید صاحب کے والد حمید صاحب نے بنایا تھا۔ وہ محکمہ آب پاشی کے سکریٹری تھے۔ ان کا انتقال یکایک ہو گیا تھا۔ رشید صاحب اس وقت ایس ڈی ایم تھے۔ حمید صاحب کے تین اور بچوں میں سے کوئی بھی وہاں نہیں رہتا تھا۔ سب کے سب ملک چھوڑ کر امریکا چلے گئے تھے۔ رشید صاحب اپنی ماں بیوی اور بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ ایک اور سکریٹری صاحب کی بیٹی کے ساتھ۔ شادی میں تحفے تحائف ٹرکوں میں بھر کر آئے تھے۔ سلامی میں ایک سو پانچ کاروں کی چابیاں ملی تھیں۔ حمید صاحب اور ان کے سسر رفیق زماں کے بڑے احسانات تھے لوگوں پر اور ان احسانات کو چکانے کا اس سے اچھا موقع بھی نہیں تھا۔ اب تو رشید صاحب چیف سکریٹری ہونے والے تھے۔ صوبے میں ان سے اچھا بیورو کریٹ تھا ہی نہیں۔ فوج، سیاست دان، قومی جماعتیں، مذہبی جماعتیں، ہر قسم کے لوگ رشید صاحب سے خوش تھے۔ وہ بلا کے باصلاحیت شخص تھے، حکومت کسی کی بھی ہو نظام کو چلانے کا فن انھیں آتا تھا۔

رشید صاحب کے وسیع و عریض گھر کے برابر میں احمد کمال کا گھر تھا۔ احمد کمال نے زندگی فٹ پاتھ سے شروع کی تھی مگر اپنی کمال کی صلاحیتوں کی وجہ سے وہ اس گلی میں پہنچ گئے تھے۔ شروع میں وہ اخبار میں جرائم کی رپورٹنگ کرتے تھے۔ اسی دوران ان کی دوستی چند سیاست دانوں سے ہو گئی تھی۔ پھر انھوں نے اخبارات میں سیاسی کالم لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے کالم میں آنے والے دنوں کے بارے میں صحیح صحیح باتیں لکھی ہوتی تھیں۔ ملک میں موجود مختلف ایجنسیوں کے سربراہوں سے ان کی ذاتی دوستی تھی یا شاید وہ خود ان ایجنسیوں کے ملازم تھے۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ شدید سیاسی انتشار کے زمانے میں انھوں نے عوام سے چندہ جمع کر کے اور

ایجنسیوں کے دوستوں کی مدد سے ایک پریس لگالیا تھا جہاں سے ان کا ہفت روزہ "ضمیر کی آواز" نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ پھر وہ ترقی ہی کرتے چلے گئے تھے۔ ہر صوبے میں ان کی پہنچ تھی۔ ملک کے ہر قابلِ ذکر سیاست دان یا بیوروکریٹ سے ان کی دوستی تھی۔ پھر انھوں نے روزنامہ "اخبار ضمیر" بھی نکالا تھا۔ وہ لوگوں کے ضمیر کو خریدنے میں کمال کا درجہ رکھتے تھے۔ ملک کا ہر بڑا صحافی ان کا ملازم تھا۔ ہر بڑے سیاست دان نے ان سے دوستی رکھی ہوئی تھی۔ ہفت روزہ اور روزنامے کے بعد انھوں نے بچوں اور بڑوں کے دوسرے رسالے بھی نکالے تھے۔ بہت سا روپیہ کمانے کے باوجود وہ اس قابل نہیں ہو سکے کہ لوگوں کو ان کی قرضِ حسنہ کی رقم واپس کر دیتے مگر اس گلی میں انھوں نے یہ مکان خرید لیا تھا۔ خوب صورت مکان۔

رشید صاحب اور کمال صاحب کے مکان کے سامنے کے دونوں پلاٹوں کو ملا کر جو بڑا سا گھر تھا وہ جنرل جمال خان کا تھا۔ جنرل جمال خان کے بہت سارے مکان تھے۔ ہر صوبے کے ہر قابلِ ذکر شہر میں ان کی جائیدادیں تھیں۔ انگلینڈ میں اپارٹمنٹ تھا۔ امریکا میں رینچ فارم اور حال ہی میں انھوں نے اسپین میں ایک وِلا بھی خرید لیا تھا۔ قوم و ملک کے لیے ان کے خاندان نے بڑی قربانیاں دی تھیں۔ پہلی فوجی حکومت کے دوران انھوں نے کمیونسٹوں اور مذہبی انتہا پسندوں سے جم کر مقابلہ کیا تھا۔ کارخانوں کی' مزدوروں کی یونین کو توڑنے میں انھوں نے خاص مہارت حاصل کی تھی' ساتھ ساتھ مذہبی جماعتوں میں بھی اپنا اثر رسوخ پیدا کیا تھا۔ چند ایک کو چھوڑ کر زیادہ تر مذہبی جماعتوں کے سربراہ جنرل صاحب کی مرضی سے ہی بنائے جاتے تھے۔ بیرونِ ملک میں بھی ان کا بڑا نام تھا' امریکا اور برطانیہ کے سیاسی حلقوں میں بھی ان کی پہنچ ہو گئی تھی۔

فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے کئی کارخانوں میں شیئر خرید لیے تھے۔ وہ کئی کارخانوں کے ڈائریکٹر تھے اور ٹریڈ یونین کے خلاف ان کی سرگرمیوں کی وجہ سے انھیں Trouble Shooter بھی کہا جاتا تھا۔ ان کے بیٹے فوج میں تھے۔ ایک داماد نیوی میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور ایک داماد ائیر فورس میں کام کرتا تھا۔

دوسری فوجی حکومت کے دوران انھیں صدر کا مشیرِ خاص بنایا گیا تھا اور ان کی صلاحیتوں سے بہت فائدہ اٹھایا گیا۔ انھوں نے لسانی بنیادوں پر سیاسی پارٹیاں بنوائی تھیں اور شیعہ' سنی' اہلِ حدیث' بریلوی اور دیو بندی ملاؤں کی اپنی اپنی پارٹی بنوانے میں بہت مدد کی تھی۔ وہ ملک کے سیاسی نظام کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کا خاندان بھی سمجھتا تھا۔ وہ اس ملک کے بے تاج بادشاہوں میں سے ایک تھے۔

ان کے مکان کے برابر میں ہی پیر بربوری شریف کا مکان تھا۔ پیر بربوری شریف کا نام تو کچھ اور تھا مگر سب انھیں پیر صاحب کہا کرتے تھے۔ پیر صاحب کے والد کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا

اور یہ گدی نشین ہوئے تھے۔ پورے ملک میں ان کے چودہ لاکھ سے زیادہ مرید تھے۔ پیر صاحب کا یہ بہت موڈرن بنگلہ تھا جہاں مریدوں کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ پیر صاحب یہاں پر اپنی بیویوں اور عورتوں کے ساتھ آتے جاتے رہتے تھے۔ ملک کے تمام شہروں میں ان کی حویلیاں تھیں جہاں وہ گاہے بگاہے اپنے مریدوں کو دیدار کراتے تھے۔ ان کے مریدوں میں سب شامل تھے سیاست دان، حکمران، سرکاری افسران، فوج کے جنرل، تاجر، اسمگلر اور بہت سارے عوام۔ پیر صاحب کی آنکھوں میں بلا کا جلال تھا اور ان کا خاندان جلالی پیروں کا خاندان کہلاتا تھا۔ پیر صاحب کے بزرگوں کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں۔ پیر صاحب کے ایک جدِ امجد نے ایک نگاہ ڈال کر پورے جنگل میں آگ لگا دی تھی۔ پیر صاحب کے بزرگوں کا ایک مرید پیر صاحب کی ایک عورت کو بھگا کر لے جا رہا تھا اور وہ جیسے ہی پیر صاحب سے چالیس میل دور ہوا تھا کہ دونوں ہی جل گئے تھے۔ آج بھی دونوں کا جلا ہوا جسم ایک پہاڑی کے پتھروں سے ملا ہوا موجود ہے۔ کہتے ہیں اس رات علاقے کے سارے پہاڑ جل اٹھے تھے اور اگر پیر صاحب چالیس میل دور نہیں جانے دیتے تو شاید سارے شہر اور گاؤں جل کر خاک ہو جاتے۔ آج تک کسی نے بھی پیر صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھا تھا۔

اس ملک میں ہونے والے ہر قابلِ ذکر واقعے اور حادثے میں پیر صاحب کسی نہ کسی طرح سے ضرور شامل تھے۔ ان کی مرضی سے بہت سارے کام ہوتے تھے اور ان کی ہی مرضی سے بہت سارے کام نہیں ہوتے تھے۔ پیر صاحب کا تمام خاندان پڑھا لکھا تھا، بچے ملک سے باہر پڑھتے تھے مگر پیر صاحب کے دیہاتی مریدوں کو پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ شہر کے مریدوں کی بات اور تھی، ان کے لیے پیر صاحب نے دوسرے قسم کے قوانین بنائے ہوئے تھے۔ پیر صاحب کا اپنا ذاتی جیل خانہ بھی تھا اور یہ جیل خانہ اتنا ہی پرانا تھا جتنی پرانی پیر صاحب کی گدی۔

پیر صاحب کے مکان کے سامنے کھاکھرے بھائیوں کا بڑا سا گھر تھا جسے امریکا کے وائٹ ہاؤس کے طرز پر بنایا گیا تھا۔ کھاکھرے بھائیوں کا بڑا کام تھا۔ کھاکھرے بھائیوں کا باپ بازارِ حسن میں دلالی کا کام کرتا تھا اور شہر کے پرانے علاقے میں چھوٹے سے فلیٹ میں اپنے سات بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اسے ایک رات کسی نے گولی مار دی تھی۔ اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد اس کے گھر پر کسی نے آکر کچھ پیسے دیے تھے اور حمید کھاکھرے کو ملازم رکھ لیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس خاندان کی قسمت بدلتی گئی تھی۔ اس محلے سے وہ لوگ ایک بڑے فلیٹ میں چلے گئے جہاں سے جلد ہی ایک بنگلے میں منتقل ہو گئے تھے۔ حمید کھاکھرے خاندان کو لے کر بہت آگے نکل گیا تھا۔ پانچ بھائیوں اور دو بہنوں کا یہ خاندان بہت کچھ کرتا تھا۔ نگار کھاکھرے کی شادی شہر کی سب سے بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے مالک سے ہوئی تھی۔ کھاکھرے خاندان کے ملاپ سے یہ کمپنی قومی

سے بین الاقوامی بن گئی تھی۔ فاطمہ کھاکھرے کے خاندان نے ہوٹلوں کا کام سنبھال لیا تھا۔ کھاکھرا خاندان ہر کام ہر قیمت پر کرنے کو تیار ہوتا تھا۔ حمید کھاکھرے کو لندن کے ہیتھ رو ایئرپورٹ پر حشیش سے بھرا سوٹ کیس لے جاتے ہوئے پکڑا بھی گیا اور اس نے زندگی کے نو سال لندن کی کسی جیل میں گزارے بھی تھے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اس قسم کے بہت سارے سوٹ کیس اور بریف کیس کھاکھرے خاندان اودھر سے ادھر کر چکا تھا۔ جب کھاکھرے خاندان نے اس گلی میں مکان بنایا تھا اس وقت حمید کھاکھرے لندن کے جیل میں تھا اور نثار کھاکھرے نے سارا کام سنبھال لیا تھا۔ نثار کھاکھرے نے اپنا نام بینک کے کام میں کیا تھا۔ اس کی شراکت میں چلنے والا انویسٹ منٹ بینک عربوں کے لیے بڑا کام کرتا تھا۔ عرب شیخوں کے لیے آرام دہ محل بنانا' دنیا میں کہیں بھی کبھی بھی جوا کھیلنے کا انتظام کرنا' شکار گاہوں میں شکاری باز سے لے کر شکار کا اہتمام کرنا' اونٹوں کی دوڑ کے لیے چھوٹے بچوں کی خریداری سے لے کر گاؤں دیہاتوں سے محلوں کی زیبائش کے لیے لڑکیوں کی خریداری تک بینک ہر کام میں یکتا تھا اور بڑی خوبیوں کا مالک تھا۔ دنیا کے بہت سارے پرانے بینکوں کے مقابلے میں کھاکھرے بینک نے ترقی میں کمال کر دیا تھا۔ کھاکھرے خاندان کی قومی خدمات کا ہر کوئی معترف تھا وزیر اعظم' صدر مملکت' چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر' سارے بڑے اخبار' تمام قومی لیڈر' ملک کے نظام میں اس خاندان کا بڑا عمل دخل تھا۔ لندن سے رہا ہونے کے بعد حمید کھاکھرے کو یہودیوں کے خلاف بہادری سے کام کرنے کے عوض قومی اعزاز سے بھی نوازا گیا تھا۔

کھاکھرے بھائیوں کے مکان کے برابر میں دو پلاٹ خالی تھے۔ یہ دونوں پلاٹ جرنیل صاحب کے تھے مگر نہ جانے کیوں انھوں نے انھیں خالی چھوڑا ہوا تھا۔ اونچی سی باؤنڈری وال والے خالی پلاٹ کسی مکین کا انتظار کر رہے تھے۔ ان خالی پلاٹوں کے سامنے ایک اور مکان تھا۔ یہ مکان مولوی صاحب کا تھا۔ مولوی صاحب بہت پہلے ایک چھوٹی سی مسجد کے امام ہوا کرتے تھے۔ اس محلے کی ایک خوب صورت سی لڑکی کو جرنیل صاحب کے چھوٹے بیٹے نے اغوا کر لیا تھا۔ کہانی تو بہت بڑی ہے مگر جاننے والوں کے لیے اتنا کافی ہے کہ لڑکی کے عزت دار ماں باپ سب کچھ خاموشی سے برداشت کرنے کو تیار تھے مگر نہ جانے کہاں سے محلے کا ایک نوجوان آگیا تھا اور تمام معاملہ ایک چھوٹے سے رسالہ میں چھپ کر کورٹ تک پہنچ گیا تھا۔ مولوی صاحب نے بڑی مدد کی تھی، عدالت میں حاضر ہونے سے پہلے جرنیل صاحب کو پچھلی تاریخوں کا بنا ہوا نکاح نامہ دے دیا اور مقدمہ عدالت سے خارج ہو گیا تھا۔ اس لڑکی نے ڈی ڈی ٹی پی کر خودکشی کر لی تھی اور محلے کا وہ نوجوان کئی سال جیل میں رہ کر جب رہا ہوا تھا تو پاگل ہو گیا تھا۔ شہر کی سڑکوں پر اور مسجدوں کے سامنے کبھی کبھی وہ "نکاح نامہ جعلی ہے" کے نعرے لگاتا ہوا نظر آجاتا ہے۔ جرنیل

صاحب مولوی صاحب کو نہیں بھولے۔ ان کی مسجد کی تعمیر کے لیے انھیں بڑی مدد ملی تھی۔ مسجد کے ساتھ پارک کے لیے مختص زمین پر دارالعلوم کھل گیا تھا۔ جہاں دنیا بھر کے بچے دینی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ دارالعلوم کی شاخ دوسرے شہروں میں بھی کھل گئی۔ مولوی صاحب سعودی عرب اور مصر کے جامعہ اظہر کے دورے کے بعد سے فتویٰ بھی دینے لگے تھے۔ مفتی و مولوی صاحب کے چاروں طرف عالموں کی ایک بھیڑ سی لگی رہتی تھی۔ جرنیل صاحب نے مولوی صاحب کی خدمات کے اعتراف کے طور پر انھیں بھی اس گلی میں ایک پلاٹ الاٹ کرا دیا تھا۔ مولوی صاحب کے اس کشادہ سے مکان پر بڑے جلی حروف میں ''اللہ جسے چاہتا ہے اسے عزت دیتا ہے'' کے الفاظ ایک مرید نے کندہ کرائے تھے۔

مولوی صاحب کے مکان کے برابر ملک کے کرکٹ کے سب سے کامیاب کھلاڑی حفیظ کا مکان تھا۔ حفیظ کو یہ پلاٹ ایک اہم کرکٹ میچ جیت کر قوم کے لیے اعزاز حاصل کرنے کے صلے میں ملا تھا۔ حفیظ سب سے بڑا اور سب سے عمدہ کھلاڑی نہیں تھا مگر سب سے کامیاب ضرور تھا۔ وہ نئی نسل کا ہیرو تھا اور کرکٹ کے اعلیٰ حکام سے اس کی بہت دوستی تھی۔ اپنی مرضی کی ٹیم بنوانے میں اور ابھرتے ہوئے ایسے کھلاڑی جو اس کے لیے چیلنج بن سکتے تھے انھیں نیچا دکھانے میں حفیظ کو کمال حاصل تھا۔

ملکی اور غیر ملکی صحافیوں سے حفیظ کی بڑی دوستی تھی۔ اخباروں میں اسے بڑی عزت دی جاتی تھی۔ ملک کی فلمی ہیروئنوں کے ساتھ اس کا نام لیا جاتا تھا اور غیر ملکی ماڈل لڑکیوں کے ساتھ اس کی تصویریں خوب بکتی تھیں۔ وہ کرکٹ کا ہر فن مولا تھا۔ بہت ہی کم عمری میں اس نے بڑا نام پیدا کر لیا تھا۔ کہتے ہیں ہالی ووڈ والوں نے اسے فلم میں کام کرنے کی بھی آفر کی تھی اور ملک کی تمام سیاسی جماعتیں اسے لینے کو تیار تھیں۔ ایک دفعہ ایک میچ جیتنے پر مذہبی جماعتوں نے اسے مجاہدِ اسلام بھی قرار دیا تھا۔ اس گلی کے اس پلاٹ پر مکان بنانا آسان نہیں تھا۔ مگر حفیظ نے کرکٹ کے میچوں میں سٹے بازوں کی مدد کی تھی، روپوں پیسوں کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہ خوب صورت مکان اس نے بہت چاؤ سے بنایا تھا۔ کچھ میچوں کا سودا کر کے، کچھ کھیلوں کو بیچ کر۔

حفیظ کے مکان کے سامنے راؤ صاحب کا گھر تھا۔ راؤ صاحب کی بیوی برازیل کی تھی۔ راؤ صاحب نے تمام زندگی فارن سروس میں گزاری تھی۔ جب وہ بلجیم میں سفیر تھے تو ان کی ملاقات برازیل کی اس خاتون سے ہوئی تھی۔ پھر ان کی بیوی نے انھیں چھوڑ دیا اور راؤ صاحب نے اس سے شادی کر لی۔ راؤ صاحب بہت کامیاب آدمی تھے۔ فارن سروس میں آنے کے بعد سے جہاں جہاں انھوں نے کام کیا تھا وہاں وہاں انھوں نے خوب فائدے اٹھائے تھے۔ لندن میں ان کا مکان تھا۔ ملک میں بڑی جائیدادیں، حکمرانوں سے بہت دوستی تھی ان کی اور خاص طور سے فوج

میں بڑا اثر و رسوخ تھا ان کا۔ فوجی ساز و سامان کی خریداری سے لے کر ہوائی جہازوں اور بحری جہازوں کی خریداری تک میں وہ شامل تھے اور اس قسم کی خریداری میں سب لوگوں تک کمیشن ایمان داری سے پہنچانا ان کا ہی کام تھا۔ یہ کام انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا تھا۔ ان کا نہ کوئی نام تھا اور نہ کوئی مشہوری۔ وہ اپنی برازیلین بیوی کے ساتھ خاموش پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ خاموشی میں تلاطم اس وقت ہوتا تھا جب ان کے گھر میں پارٹی ہوتی تھی اور یہ پارٹیاں ہوتی ہی رہتی تھیں۔ اور ملک کے بہت سارے لوگ، بڑے لوگ فیصلے کرنے والے لوگ ان پارٹیوں میں نظر آتے تھے۔

پروفیسر صاحب کے مکان سے پہلے کے ایک مکان میں ایک ٹھیکیدار تھا جس کے سامنے ہی ایک پراپرٹی ڈیلر کا بنگلہ تھا۔ ان دونوں نے مل کر شہر کی ہر خالی جگہ پر فلیٹ، دوکان، مکان بنا دیے تھے۔ بہت سے پارکوں میں مسجد بنا کر پارکوں پر قبضہ کیا تھا پھر مسجد کے چاروں طرف فلیٹوں کا جنگل بنا دیا تھا۔ ان دونوں کی دوستی گہری تھی، کام میں شراکت اچھی تھی۔ محکمہ جنگلات، بلدیات، کسٹم اور لینڈ ڈپارٹمنٹ کے قابلِ ذکر افسران پر ان کا احسان تھا۔ ان کے بچوں کی فیسوں سے لے کر ان کے گھومنے پھرنے کا انتظام ان کے ہی ہاتھ میں تھا۔ شہر کے مختلف مجرموں کے گروہوں سے ان کی شناسائی تھی۔ ان کے راستے میں کوئی بھی پتھر نہیں آتا تھا جو آتا تھا اسے ہٹا دیا جاتا تھا۔ ان دونوں کو اس دنیا میں جینے کا ڈھنگ آتا تھا۔ ان کے خیال میں ہر آدمی، ہر شخص، ہر نظریہ، ہر خیال، ہر جج، ہر وکیل، ہر وزیر، ہر پروفیسر، ہر اعلان خریدا جا سکتا تھا اور جو بکتے نہیں ہیں مرتے ہیں، جو مرتے نہیں انھیں توڑ دینا چاہیے اور اس اصول پر ان لوگوں نے بڑی ایمان داری سے عمل کیا تھا۔

گلی کے اس طرف ہی کچھ اور مکان تھے۔ ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا کہ یہ لوگ کون ہیں۔ یا تو بہت ہی شریف لوگ تھے، جو اپنے کام سے کام رکھتے تھے، یا پھر ایسے لوگ تھے جن کے کام کا کچھ پتا نہیں تھا۔ ان سب کے مکانوں کے آخر میں میرا مکان تھا۔ میں سرجن تھا شہر کے ایک میڈیکل کالج میں اپنے ڈپارٹمنٹ کا انچارج بھی تھا۔ اس گلی میں پہنچنے کے لیے مجھے بہت کچھ کرنا پڑا تھا۔ انگلستان سے آنے کے بعد میرے گھر والوں نے میری شادی سکریٹری ہیلتھ کی بیٹی سے طے کرا دی تھی۔ شادی سے پہلے ہی میرا اپائنٹمنٹ میڈیکل کالج میں ہو گیا تھا۔ میرے سسر زمانہ ساز آدمی تھے۔ مجھے زندہ رہنے کے اصول انھوں نے ہی سمجھائے تھے۔ گورنر ہاؤس سے وزیرِ اعلیٰ کے گھر تک بیمار پڑنے والے ہر شخص کو مجھے دیکھنا پڑتا تھا۔ میں ان کے داخلے کا انتظام کرتا تھا۔ اگر آپریشن کی ضرورت ہو تو وہ بھی کرتا تھا یا کراتا تھا۔ باہر کے علاج کی

صورت میں بھی میری ہی بات مانی جاتی تھی۔ ججوں سے لے کر بڑے بڑے سرکاری افسروں تک اور پولیس کے اعلیٰ حکام سے لے کر فوج کے بڑے افسران تک نہ جانے کتنوں کو میں نے جھوٹے سرٹیفکیٹ بنا کر علاج کے لیے حکومت کے خرچ پر باہر بھجوایا۔ ہر ایک نے اپنی حیثیت اور اختیار کے مطابق مجھے بھی نوازا۔ میں محکمہ صحت کا بہت بااثر افسر ہوں۔ حکومتیں آتی ہیں چلی جاتی ہیں، اوپر کے چہرے بدل جاتے ہیں مگر نظام چلتا رہتا ہے۔ ہر حکومت کے لوگوں کو میڈیکل کالجوں میں داخلے کرانے ہوتے ہیں۔ میں ان کی مدد کرتا ہوں، راستہ بتاتا ہوں، راہ سمجھاتا ہوں۔ ہر حکومت کے اربابِ اختیار کو میڈیکل کالجوں کے امتحانات میں اپنے بچوں کو پاس کرانا ہوتا ہے میں ان کا ایک ذریعہ ہوں۔ ہر پروفیسر سے میری یاد اللہ ہے۔ ہر کوئی مجھ سے ڈرتا ہے اور میں لوگوں کے کام آتا ہوں۔ اب تو یہ صورتِ حال ہو گئی ہے کہ ملکی اور غیر ملکی دواؤں کے کارخانوں کے مالکان بھی مجھ سے ہی رجوع کرتے ہیں اور میں درمیان کا آدمی بن کر محکمہ صحت اور ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ کے توسط سے ان کے کام کراتا ہوں۔ میرے پاس جو بھی آتا ہے اس کا کام ہو جاتا ہے۔ میرے سسر کے ریٹائر ہونے کے باوجود حکومت میں میری بہت اچھی پہنچ ہے۔ ہسپتال میں میرا وارڈ میرے نائب چلاتے ہیں۔ وہاں کے بڑے گھٹیا مسائل ہیں۔ ہسپتال میں کچھ ہوتا ہی نہیں ہے۔ نہ دوا، نہ سامان، نہ سہولتیں، وہاں اتنی پریشانی ہوتی ہے کہ اب تو میں نے ہسپتال میں کام کرنا ہی بند کر دیا ہے۔ وہاں جا کر فون پر لوگوں سے بات چیت کرتا ہوں۔ کچھ لوگوں سے مل لیتا ہوں اور میرے نائب کسی نہ کسی طرح سے ہسپتال چلاتے رہتے ہیں۔ کبھی مریض کو دوائیں ہسپتال میں لانی پڑتی ہیں اور کبھی مریض باہر کے ہسپتال میں چلے جاتے ہیں۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ صرف سرجری کر کے اور میڈیکل کالج کے لڑکوں کو پڑھا کر مجھے کیا ملتا؟ شاید میں مشکل سے ایک بنگلہ بنالیتا۔ ایک چھوٹی سی گاڑی خرید لیتا۔ میری زندگی کے مسائل اس سے زیادہ سنگین ہیں۔ میری ضروریات بہت زیادہ ہیں۔ میں غریب آدمی کا بیٹا ضرور ہوں مگر داماد ایک سکریٹری کا ہوں اور میری بیوی کا بھائی شہر کا سب سے بڑا کار ڈیلر ہے۔

اس گلی میں میرا یہ مکان باہر سے خراب اور اندر سے بہت خوب صورت ہے۔ میرے بچپن کا کوئی دوست یہاں نہیں آتا ہے۔ وہ میرے بارے میں عجیب باتیں کرتے ہیں۔ عجیب لوگ ہیں، یہ جاہل اور جلن سے بھرے ہوئے گنوار لوگ۔

میرے مکان کے برابر میں ہی کریمہ باجی کا مکان تھا۔ وہ خوب عورت تھیں۔ عمر کے درمیانی حصہ میں آ کر بھی ویسی ہی تھیں جیسی جوانی میں رہی ہوں گی۔ ان کے بڑے سے مکان میں بڑی چہل پہل رہتی تھیں۔ کہتے ہیں جوانی کے زمانے میں فوجیوں کی حکومت کے دوران

انھیں جیل میں ایک مذہبی رہنما کو سیدھا کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ وہ کام انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا تھا۔ اس وقت تو وہ ایک معمولی سی طوائف تھیں مگر اس اعلیٰ کارکردگی کے بعد ان کی تو جیسے لاٹری نکل آئی تھی۔ ان کی زندگی کا اصول تھا مناسب قیمت پر دوسروں کے کام آنا۔ بڑے بڑے واقعات ان سے منسوب تھے۔ ایک ایمان دار انکم ٹیکس آفیسر کو بھی ایک سیٹھ نے ان کے ذریعے سے ہی سیدھا کیا تھا۔ ان کے ساتھ اس آفیسر کی ننگی تصویر کے بعد محکمے نے اس بے چارے کو نکال دیا تھا۔ وہ عرب ممالک کے سفارت کاروں میں بڑی مقبول تھیں۔ فوجیوں کے ہاں راتوں کو ہونے والے فنکشن میں سپلائی کا کام بھی انھی کے ہاتھوں سے ہوتا تھا۔ کئی بینک ان کی مدد سے ہی اپنا کام آگے بڑھا رہے تھے۔ حکومتیں بدلتی رہی تھیں کبھی فوجی، کبھی جمہوری، مگر ان کی ضرورت برقرار رہی تھی۔ وہ ہر قسم کی حکومتوں پر یقین رکھتی تھیں۔ اس گلی میں یہ پلاٹ غریبوں کے ووٹوں سے منتخب ہونے والے ایک وزیر اعلیٰ نے انھیں دیا تھا۔ ایک مرسیڈیز ایک فوجی حکمران کا حقیر تحفہ تھا۔ ملک میں موجود کئی کارخانوں میں ان کا حصہ تھا۔ ان کے پاس ہر طرح کی لڑکیوں کا ایک خوب صورت collection تھا۔ وہ اپنی لڑکیوں کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ ان کی کوئی لڑکی انھیں چھوڑ کر بھاگی نہیں تھی۔ جو ان کے پاس آتی تھی اس کی زندگی سنور جاتی تھی۔ ان کی گراں قدر خدمات کو حکومت نے تسلیم کرتے ہوئے انھیں قومی اعزاز بھی دیا تھا۔

کریمہ باجی کے مکان کے ساتھ والے پلاٹ پر جمال صاحب رہتے تھے۔ یہ پلاٹ فوج سے ریٹائر ہونے والے ایک شریف کرنل کا تھا۔ جسے ریٹائرمنٹ کے ساتھ ہی یہ پلاٹ ملا تھا۔ اس کرنل نے اس پلاٹ کو جمال صاحب کو بیچ کر اپنی دو بیٹیوں کی شادی کی تھی اور ایک چھوٹے سے فلیٹ میں منتقل ہو گیا تھا۔ اس پلاٹ پر مکان بنانے کی سکت ایک ایمان دار فوجی میں تو نہیں ہو سکتی تھی مگر جمال صاحب تو سرکاری ملازم تھے۔ انھیں پہلے تو ملک کے خاندانی منصوبہ بندی کے محکمے کے سربراہی ملی تھی۔ غیر ممالک کی امداد سے چلنے والے اس محکمے میں انھوں نے بہت لگ کر کام کیا تھا۔ ملک میں خاندانی منصوبہ بندی تو کامیاب نہیں ہو سکی تھی مگر وہ کامیاب ہوئے تھے۔ نئی حکومت نے ان کی خدمات سے متاثر ہو کر انھیں ملک میں تعلیم پھیلاؤ مہم کا انچارج بنا دیا تھا۔ خاندانی منصوبہ بندی کے محکمے میں ان کے ہی بھرتی کیے ہوئے لوگوں میں سے ایک کو انچارج بنا دیا گیا تھا جس کے بعد اس محکمے کی کارکردگی اور بھی اچھی ہو گئی تھی اور محکمہ میں کام کرنے والے افسروں نے خوب ترقی کی تھی۔ جمال صاحب نے عالمی بینک کے دیے ہوئے قرضے سے ملک میں عام تعلیم پھیلانے کا مربوط پروگرام بنایا تھا جس کے بعد انھوں نے ملک کے ہر قابلِ ذکر اہم افسر اور سیاست دان کے بچوں کو کسی نا کسی بہانے سے اعلیٰ تعلیم کا اسکالرشپ

دلوا کر امریکا اور انگلینڈ بھجوایا تھا۔ عالمی بینک کمپیوٹر پر چھپی ہوئی خوب صورت رپورٹوں سے بہت متاثر ہوا اور قرض مزید بڑھا کر دیا گیا تھا۔ جمال صاحب کی کامیابی کی بنا پر انھیں قومی پلاننگ کمیشن کا چیئرمین بنا دیا گیا تھا۔ اس حیثیت میں انھوں نے بہت ہی قابلِ ذکر خدمات انجام دی تھیں۔ ملک میں ہونے والے ہر بڑے کام میں کسی نہ کسی طرح سے ان کا بھی حصہ ہوتا تھا۔ ان کے لاتعداد مکانات تھے۔ دنیا کے کئی بڑے شہروں میں ان کا کچھ نا کچھ ضرور تھا۔ ان کی اولاد شاندار زندگی گزار رہی تھی اور اب تو انھیں بھی احساس نہیں تھا کہ وہ کن کن چیزوں کے مالک ہیں۔ ان کی کامیاب زندگی ہر ایک کے لیے قابلِ رشک تھی۔

جمال صاحب کی ایک بیٹی رحیم سے بیاہی ہوئی تھی اور رحیم کا مکان ان کے مکان کے سامنے تھا۔ رحیم کے بھی کئی مکان اور کئی جگہوں پر تھے مگر وہ سسر کے دیے ہوئے مکان میں رہتا تھا۔ رحیم کے والد کا انتقال ہو چکا تھا مگر انھوں نے بھی زندگی جھونپڑی سے شروع کی تھی اور اس گلی تک پہنچ گئے تھے۔ پہلے تو انھوں نے محلے کے لوگوں کو ملا کر ایک انجمن بنائی تھی جس کا کام غریبوں کی مدد کرنا تھا۔ پھر اس انجمن نے چندہ جمع کر کے میت گاڑی خریدی تھی تاکہ میتوں کے لانے لے جانے میں مدد کی جاسکے۔ چندہ جمع ہوتا گیا تو پھر انھوں نے اسکول کھولنے شروع کر دیے تھے جہاں بھاری فیس لی جاتی تھیں اور شہر میں بڑے بڑے پروگرام کر کے فنڈ جمع کیا جاتا تھا۔ حکومت نے بھی ان کی بڑی مدد کی تھی۔ اسکولوں کے لیے مفت کی زمینیں دی گئی تھیں پھر انھوں نے حکومت کی ہی دی گئی مفت کی زمینوں پر غریبوں کے لیے ہسپتال کھولے تھے جہاں بھاری فیسوں سے علاج کیا جاتا تھا۔ ان کا نام ہر قسم کے رفاہی کاموں سے منسوب تھا۔ افسوس یہ ہے کہ غریبوں کے لیے ان کے دل میں جو درد تھا ملک کے غریب مکمل طور پر اس سے ناآشنا تھے۔ جمال صاحب نے ان کی بڑی مدد کی تھی۔ اس مدد کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے رحیم کی شادی جمال صاحب کی ایک بیٹی سے کی تھی جو ذہنی پسماندگی کا شکار تھی۔

یہ گلی اس محلے کی سب سے اچھی گلی ہے۔ یہ محلّہ اس شہر کا سب سے شاندار محلّہ ہے۔ یہ شہر اس صوبے کا سب سے خوب صورت شہر ہے۔ یہ صوبہ اس ملک کا سب سے بڑا صوبہ ہے اور یہ ملک ساری دنیا کے سارے ملکوں کے درمیان بعض باتوں میں سب سے اوّل ہے۔

مجبوری

"یار، تم سے اتنا سے کام نہیں ہو رہا ہے۔ میرے باپ کی آنکھوں کا آپریشن نہیں کر سکتے ہو۔ کیٹریکٹ ایسی کیا بڑی چیز ہے۔ آدھے گھنٹے کا کام نہیں ہے۔ اتنا بھی فائدہ نہیں ہے تمھارا۔ ایک بڑے میاں نہیں سنبھلتے ہیں تم سے۔" فون کی دوسری جانب دور بہت دور امریکا کے نیویارک سے بھی بہت آگے ٹنی سی کے کسی ہسپتال سے کریم کا فون تھا۔

"ہاں، بڑے میاں نہیں سنبھلتے ہیں مجھ سے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا "یار سب کچھ تیار تھا۔ وہ ہسپتال میں داخل بھی ہو گئے تھے۔ رات اچھی گزاری تھی۔ تمھاری امی بھی ہسپتال میں ہی تھیں۔ صبح آپریشن سے پہلے دینے والی دوائیں بھی انھیں دے دی گئی تھیں میں نے ان کے ٹینشن اور گھبراہٹ کو دیکھتے ہوئے رات سے ہی تھوڑا ڈائی زی پام بھی انھیں دے دیا تھا، صبح ہی ان کا آپریشن تھا۔ وہ آپریشن تھیٹر بھی آئے تھے اور آپریشن ٹیبل پر لیٹ بھی گئے تھے لیکن بس بے ہوشی سے تھوڑا سا پہلے نہ جانے کیا ہُوا تھا کہ وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور آپریشن کرانے سے انکار کر دیا تھا۔ سخت شرمندگی کا شکار تھے۔ وہ بار بار اس طرح مجھ سے معذرت کر رہے تھے کہ مجھے بھی شرم آ گئی تھی۔ وہ تمھارے بغیر آپریشن نہیں کرائیں گے۔" فون کے اس طرف کراچی سے میں نے کریم کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"یار، میں کیسے آسکتا ہوں؟ سر سے پاؤں تک کام میں پھنسا ہوا ہوں۔ ڈیڈ کو میں نے سمجھا دیا تھا۔ انھوں نے اور امی نے بھی کہا تھا کہ میرے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یار ڈیڈ نے تو کمال کر دیا ہے۔ پتا نہیں حکومت کے کام کیسے کرتے رہے ہیں۔ ایک چھوٹا سا آپریشن نہیں کرا سکتے ہیں۔ خود مشکل میں ہیں۔ نہ اخبار پڑھ سکتے ہیں اور نہ دوسرے کام صحیح طریقے سے کر سکتے ہیں مگر آپریشن سے جان جاتی ہے۔ کمال ہے یار، کمال ہے۔" اس نے جھنجھلا کر کہا تھا۔ "اچھا میں پھر فون کروں گا۔"

ایسا پہلی دفعہ نہیں ہوا تھا۔ پہلے بھی دو دفعہ آپریشن کا فیصلہ ہوا تھا اور پھر آپریشن آخر وقت

میں نہیں ہو سکا کیوں کہ وہ تیار نہیں تھے۔ ان کو ڈر تھا' ایک خوف کہ شاید بے ہوش ہو کر ہوش میں نہ آسکیں' میں زبردستی تو آپریشن نہیں کر سکتا تھا۔

میری کریم سے ملاقات لندن میں ہوئی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی ہسپتال میں کام کر رہے تھے میں آنکھوں کے شعبے میں تھا اور وہ سرجری کے شعبے میں کام کر رہا تھا۔ ایک سال تک ہم دونوں نے ساتھ ہی کام کیا تھا۔ میں اپنی تربیت کے آخری مرحلوں میں تھا۔ کریم نے بھی امتحان پاس کر لیے تھے اور امریکا جانے کا امتحان بھی پاس کر کے امریکا جانے کے پروگرام بنا رہا تھا۔ اس کا پاکستان واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ "یار وہ ملک رہنے کے قابل نہیں ہے" یہ اس کا مخصوص جملہ تھا۔

اس کے والد حکومتِ پاکستان میں بڑے بیوروکریٹ تھے' گریڈ اکیس بائیس کے افسر' بہت اچھے انسان تھے وہ۔ جب میں سب کام ختم کر کے پاکستان واپس جا رہا تھا تو کریم نے میرے سامنے اپنے ڈیڈ کو فون کر کے کہا تھا کہ میری مدد کریں۔ انھوں نے مدد بھی کی تھی۔ کراچی پہنچ کر میں انھیں ملا تھا اور میرے سارے کام بڑی تیزی سے ہو گئے تھے۔ لندن سے آنے والا سامان کسٹم سے آسانی سے نکل گیا تھا۔ سرکاری نوکری کے ڈھونڈنے اور ملنے میں انھوں نے مدد کی تھی۔ پھر تھوڑے تھوڑے دنوں میں ان کا سیکریٹری یا ان کے آفس سے فون کر کے کوئی نہ کوئی پوچھتا تھا کہ کوئی کام تو نہیں ہے۔ وہ اور ان کی بیوی بڑے مہربان لوگ تھے۔ پیار سے ملتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح سے کام آئیں۔ میں آخر کریم کا دوست تھا۔

کریم لندن سے امریکا چلا گیا تھا۔ وہاں ٹریننگ مکمل کی' پھر ٹینی سی کے ایک ہسپتال میں کام کر رہا تھا۔ ٹریننگ کے دوران ہی وہ پاکستان آیا اور اس کی شادی اس کے رشتہ داروں میں اس کی ہی مرضی سے ہو گئی۔ اس کی شادی کے دوران میں اور میری بیوی اس کے خاندان کے اور زیادہ قریب آگئے تھے۔

کریم کی ایک بہن بھی تھی' شازیہ۔ اس کی بھی شادی ایک کارڈیولوجسٹ سے ہوئی تھی جس کے ساتھ وہ کینیڈا میں رہتی تھی۔ کریم کی شادی پر وہ لوگ بھی کینیڈا سے آئے ہوئے تھے۔ کریم کے والدین کو اتنا خوش میں نے کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔ زندگی سے بھرپور تھا پورا خاندان۔ اس وقت وہ بڑی پوسٹ پر فائز تھے۔ گھر پر نوکروں چاکروں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ کام کرنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ وہ تین ہفتے جادو کی طرح سے تھے۔

پھر یکایک سب کچھ ویسا ہی ہو گیا تھا۔ پہلے کریم اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ ٹینی سی چلا گیا تھا پھر شازیہ بھی کینیڈا چلی گئی تھیں اور زندگی اپنے معمول پر آگئی تھی۔ کریم جاتے وقت مجھ سے

کہہ گیا تھا کہ کبھی کبھار اس کے گھر کا چکر لگا لیا کروں۔ کریم نہ بھی کہتا تو شاید میں یہی کرتا۔ اس کے والدین تھے ہی ایسے۔ پیار کرنے والے محبت کرنے والے اور خلوص سے بھرے ہوئے۔ بڑی پوسٹ پر ہونے کے باوجود ان میں کوئی بے جا غرور نہیں تھا۔ میری ان دونوں سے بہت دوستی ہو گئی تھی۔

پھر کریم کے ڈیڈ ریٹائر ہو گئے اور ان کی زندگی کے فرصت کے دن شروع ہو گئے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے شروع کے مہینوں کے بعد وہ دونوں کینیڈا امریکا کے دورے پر نکل گئے تھے۔ تین مہینے کینیڈا رہنے کے بعد انھوں نے تین مہینے ٹینی سی میں گزارے تھے اور جب کراچی واپس آئے تھے تو بہت خوش لگ رہے تھے۔

میں ان کے آنے کے دوسرے دن ہی ملنے گیا تھا۔ بہت اچھا وقت گزرا مگر بہت جلد طبیعت اکتا جاتی ہے۔ وہاں پر بوڑھوں کا کوئی کام نہیں ہے‘ وہ کب تک اور کتنا ٹیلی وژن دیکھ سکتے ہیں۔ نہ کوئی ملنے والا ہے اور نہ کوئی بات کرنے والا۔ فون پر کتنا کوئی بات کر سکتا ہے اس کے بعد تو ڈالر لگتے ہیں۔ کینیڈا کی سردی بھی بہت خوف ناک ہے۔ جوانوں کی جگہ ہے آج کی یہ نئی دنیا۔ میں نے ڈیفنس میں ان کے بڑے سے گھر میں ان کے ساتھ چائے پی‘ انھوں نے میری بیوی کے لیے تحفہ اور بچوں کے لیے چاکلیٹ دیا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ ہر دو سال بعد کریم اور شازیہ پاکستان کا چکر مارتے تھے اور یہی دو تین ہفتے ایسے ہوتے تھے کہ ان کے بڑے گھر میں جیسے روشنی سی ہوتی‘ ان کے اپنے بچے نواسے اور پوتے۔ ان دنوں کی تیاری وہ لوگ سارا سال کرتے رہتے تھے۔ دن گن گن کر ان دنوں کا انتظار کرتے رہتے تھے۔

کریم کا واپس آنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ ٹینی سی میں وہ بہت خوش تھا۔ اچھی آمدنی تھی‘ کام سے مطمئن تھا بڑا سا گھر تھا اور روز مرہ کی آسائشیں تھیں۔ وہی سب آسائشیں جو امریکا میں ہوتی تھیں۔

”یار مگر یہ سب چیزیں تو یہاں بھی ہیں۔ تم لوگوں کا ماشاء اللہ سے بڑا سا گھر ہے۔ تم اچھے سرجن ہو یہاں بھی خوب کما کھاؤ گے۔“

”نہیں یار کراچی رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ تم دیکھ ہی رہے ہو‘ حالات خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ گھر سے نکلنے کے بعد پتا بھی نہیں ہوتا کہ واپسی ہو گی کہ نہیں۔ پھر اسکولوں کالجوں کا حال بگڑتا ہی جا رہا ہے۔ ہم لوگ تو گرامر کے پڑھے ہوئے ہیں لیکن اس زمانے میں گرامر کے علاوہ بھی اسکول تھے اب تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں اگر ابھی جاؤں تو میرے بچوں

کے لیے یہاں پر کیا ہے، کچھ بھی نہیں ہے۔ یار کچھ بھی نہیں ہے۔"

میں ہنس دیا تھا اگر حالات پہلے جیسے ہو جائیں تو تم واپس آجاؤ گے؟ میں نے سوال کیا تھا۔

وہ تھوڑی دیر سوچتا رہا تھا پھر بولا تھا شاید نہیں، میں تو اسکول کے زمانے سے امریکا کے خواب دیکھ رہا تھا۔ گرامر اسکول کا ہر بچہ یہی خواب دیکھتا ہے۔ پاکستان میں کون نہیں دیکھتا ہے ہر کوئی دیکھتا ہے چاہے گرامر اسکول کا ہو یا کسی پیلے اسکول کا۔ فرق صرف یہ ہے کہ گرامر اسکول کے بچوں کے خواب پورے ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اس وقت بھی پتا ہوتا تھا کہ امریکا میں فٹ بال اور بیس بال کے چمپئن کون ہیں۔ امریکن چارٹ پر کون سی فلم اور گانا ہے اور سکسٹی منٹ کے پروگرام میں کون سے اسکینڈل زیرِ بحث ہیں۔ ہم لوگ امریکا جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے اور اسی لیے امریکا چلے بھی گئے تھے۔

"پھر حالات کو ذمہ دار ٹھہرانا تو صحیح نہیں ہے" میں نے سوال کیا تھا۔

"ایک طرح سے صحیح ہے۔ لیکن اگر حالات درست ہوتے تو شاید سوچا جا سکتا تھا۔ آخر امی اور ڈیڈی بھی تو یہاں ہی ہے ناں۔ اس نے جواب دیا تھا۔ میں دل میں ہنس دیا تھا۔ کسے دھوکا دے رہے ہو۔ کراچی اپنا مقدمہ ہار چکا ہے۔ کراچی دھوکا کھا چکا ہے۔ کراچی کے بیٹوں نے، کراچی کی بیٹیوں نے شہر سے بے وفائی کی۔ ہر ایک نے کراچی کو توڑا ہے۔ جو کراچی میں رہتے ہیں انھوں نے بھی اور جو کراچی سے بھاگ گئے ہیں انھوں نے بھی۔ پرنس روڈ پر چھابڑی لگانے والے نے بھی اور تین تلوار پر اپارٹمنٹ بنانے والے نے بھی۔ جاہل نے بھی، پڑھے لکھے نے بھی۔ میں نے کچھ کہا نہیں تھا، میں خاموش رہا تھا۔ یہ کراچی کا غم تھا۔ یہ کراچی کی بات تھی۔ یہ کراچی کا درد تھا۔ یہ کراچی کا نوحہ تھا۔ یہ کراچی کا المیہ تھا۔ ٹینی سی میں رہنے والے کو کیا سمجھ میں آئے گا۔ جس دن ڈیڈ مرجائیں گے اس دن ٹینی سی کا یہ رشتہ بھی ختم ہو جائے گا۔

یار تم ہی ڈیڈ کو سمجھاؤ اس نے مجھ سے کہا تھا۔ یہاں کیا کر رہے ہیں، بے کار ہے یہاں رہنا۔ میں نے تو بہت کہا ہے کہ ڈیفنس کا یہ مکان بیچ دیں اور میرے ساتھ ٹینی سی میں رہیں۔ میرے ساتھ، نجمی کے ساتھ اپنے پوتوں پوتیوں کے ساتھ۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا مگر یہ کراچی میں پلے بڑھے تھے یہاں ان کے دوست ہیں، رشتہ دار ہیں، ان کا جانا پہچانا موسم ہے۔ ٹھیک ہے بارش ہوتی ہے اور پانی کھڑا ہو جاتا ہے یہ تو ان کے بچپن سے ہو رہا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ سخت گرمی میں بجلی چلی جاتی ہے اور ائرکنڈیشنر پنکھے بھی بند ہو جاتے ہیں۔ ٹینی سی میں تو ایسا نہیں ہوتا ہوگا۔ یہاں ہوتا ہے یہ تو اس کے عادی ہیں۔ گٹر لائن بند ہو جاتی ہے اور گلی میں پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ کون سی نئی بات ہے اور یہ بھی کچھ عجیب نہیں ہے کہ نلکوں میں پانی آنا بند ہو جاتا

ہے اور ٹینکوں سے پانی منگانا پڑتا ہے۔ یہ سب باتیں کہنا بے کار تھا۔ میں نے یہ کہا بھی نہیں تھا۔ میں نے تو کہا تھا پہلے کراچی میں قتل نہیں ہوتے تھے۔ پہلے کراچی کے بچے پستول نہیں چلاتے تھے۔ پہلے بدمعاش گھروں میں گھس کر عورتوں' لڑکیوں کی عزت پامال نہیں کرتے تھے۔ پہلے کراچی والے رات کے اندھیرے میں بوڑھوں کو مار مار کر انھیں لوٹتے نہیں تھے۔ اب یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ کیوں آپ یہاں رہ رہے ہیں؟ چلے جائیں' کریم کے پاس' شازیہ کے پاس۔ اب کراچی میں آپ کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔

انھوں نے کچھ بھی نہیں کہا تھا' مسکرائے تھے' خاموش رہے تھے۔ کریم پھر چلا گیا تھا اور شازیہ بھی چلی گئی تھی۔

ایک رات میں ان سے ملنے گیا تھا تو میں نے محسوس کیا تھا کہ بڑھاپا ان کے قریب آگیا ہے۔ باتوں باتوں میں کراچی کی بات چل نکلی' حالات اور بھی خراب ہو گئے تھے۔ اب تو ان علاقوں میں بھی گڑبڑ ہو رہی تھی جہاں پہلے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ پل کے اس طرف کلفٹن اور ڈیفنس میں بھی ڈاکے پڑنے لگ گئے تھے۔ وہ بہت دکھ سے بولے تھے "یاد ہے تم نے ایک دن کہا تھا کہ کراچی میں اب کیا نہیں ہوتا۔ ہم جب کراچی آئے تھے تو کچھ نہیں ہوتا تھا۔ سب کچھ اچھا تھا' چھوٹا شہر تھا۔ مگر سب کچھ موجود تھا۔ ہر مذہب کے لوگ' امیر غریب سب رہتے تھے اور ان کو ضرورت کے مطابق چیزیں بھی ملتی تھیں۔ پانی بھی ملتا تھا۔ گٹر لائنیں بند نہیں ہوتی تھیں۔ بارش کا پانی ٹھہرتا نہیں تھا۔ اسکول بند نہیں ہوتے تھے۔ لوگ قتل نہیں ہوتے تھے یہ تو اب ہو رہا ہے' اس لیے ہو رہا ہے کہ کراچی میں ہر فرد نے کراچی سے دھوکا کیا ہے۔ جو پڑھ لکھ گیا ہے وہ کراچی چھوڑ گیا ہے۔ جو ان پڑھ ہے وہ ان کی نقل کر رہا ہے جو قانون توڑ رہے ہیں ٹریفک کے قانون سے بلڈنگ کے قانون تک۔" انھوں نے بہت دکھ سے کہا تھا "کراچی ختم ہو جائے گا۔" میں نے پہلی دفعہ ان کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی دیکھی تھی۔

ایک رات آنٹی کا فون آیا تھا کہ انکل گر گئے ہیں۔ میں فوراً" انھیں دیکھنے گیا تھا۔ وہ ٹھیک تھے کوئی خاص بات نہیں تھی مگر میں نے کہا کہ میں ان کی آنکھوں کا معائنہ کروں گا۔ مجھے لگا تھا کہ جیسے انھیں دیکھنے میں کوئی تکلیف ہو رہی ہے۔

دوسرے دن میں نے ان کا اپنی کلینک میں تفصیلی معائنہ کیا۔ ان کی دونوں آنکھوں میں موتیا تھا۔ انھیں فوری آپریشن کی ضرورت تھی۔ انھوں نے کہا کہ وہ آپریشن کرالیں گے اگر ضروری ہے۔

اسی رات میں نے کریم کو فون کر کے بتایا۔ اس نے کہا کہ میں آپریشن کا پلان کروں' وہ خود

بھی آجائے گا۔ میں نے آپریشن پلان کرلیا مگر کریم نہیں آسکا تھا۔ اس کی مصروفیت تھی۔ آپریشن نہیں ہوسکا تھا۔ دوسری دفعہ بھی یہی ہوا تھا۔ کریم اور شازیہ دونوں کے بچوں کے اسکول کا وقت تھا۔ وہ دونوں نہیں آسکتے تھے۔ آپریشن پھر ملتوی ہوگیا تھا۔

آپریشن اتنا مشکل نہیں تھا کہ ان لوگوں کی موجودگی ضروری تھی۔ میں نے ان کے گھر جاکر انھیں سمجھایا کہ آپریشن کرالیں۔ اگر کریم اور شازیہ نہیں ہیں تو کیا فرق پڑتا ہے، میں تو ہوں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے آپریشن تو میں روز کتنے ہی کرتا ہوں۔ اگر وہ لوگ مصروف ہیں، ان کے بچے اسکولوں میں پھنسے ہوئے ہیں، اگر دونوں میں سے کسی کو بھی چھٹی نہیں ملتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ پریشان ہوتے رہیں۔

میں نے پھر کریم کو فون کر کے بتایا اور اس دن وہ ہسپتال میں داخل بھی ہو گئے، مگر آپریشن تھیٹر تک جانے کے بعد آپریشن سے انکار کر دیا۔ ان کے چہرے پر وحشت عیاں تھی۔ وہ بار بار بیٹھ جاتے تھے۔ انھوں نے سختی سے میرا ہاتھ پکڑا تھا ان کے ہاتھ پسینے میں شرابور تھے۔ انھوں نے بڑی شرمندگی سے کہا تھا کہ نہیں آج آپریشن نہیں کراؤں گا۔ ان کا آپریشن پھر کینسل ہو گیا تھا۔

اسی روز شام کو میں اور نغمہ ان کے گھر گئے۔ گیٹ نوکر نے کھولا تھا۔ ڈیفنس کے اس بڑے سے بنگلے میں ایک عجیب قسم کا سناٹا تھا۔ ہو کا عالم۔ باہر لان میں ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ دروازے کو دھکا دے کر ہم دونوں اندر داخل ہوگئے۔ بڑے سے لاؤنج کے آخری سرے پر کریم کی امی بیٹھی ٹیلی ویژن دیکھ رہی تھیں۔ ہم دونوں کو دیکھ کر وہ کھڑی ہوگئی تھیں، بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ رکھا تھا، نغمہ کو پیار کر کے اپنے ساتھ ہی بٹھالیا تھا۔

انکل کہاں ہیں؟ میں نے سوال ہی کیا تھا کہ وہ لاؤنج کے برابر والے کمرے سے نکلے۔ میں اٹھ کر گیا ان سے ہاتھ ملایا ان کے چہرے پر ابھی تک ایک عجیب قسم کا تاثر تھا جیسے شرمندہ سے ہوں۔ انھوں نے میرا ہاتھ زور سے پکڑ لیا اور بڑی شرمندگی سے دوبارہ بولے "مجھے معاف کردیا ہے ناں۔ تمھیں بہت تکلیف دی ہے میں نے۔ بہت پریشان کیا ہے۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔

مجھے افسوس ہوا تھا۔ تھوڑی سی شرمندگی بھی۔ وہ ایک طرح کے احساسِ جرم کا شکار تھے اور مجھے ایک عجیب قسم کا احساس سا ہو رہا تھا۔ میرا ہاتھ پکڑے پکڑے وہ تھوڑی دیر کچھ سوچتے رہے، پھر آہستہ سے مجھے پکڑ کر اسی کمرے میں لے گئے جہاں سے وہ نکل کر آئے تھے۔

"یہ کریم کا کمرہ تھا اور اس کے برابر میں شازیہ کا کمرہ ہے، شازیہ نے تو چلے ہی جانا تھا۔ اتنی

دور میں نے سوچا نہیں تھا۔ بیٹیاں تو چلی ہی جاتی تھیں، مگر کریم کیوں چلا گیا تھا۔ دیکھو ہم نے یہ کمرہ چھوا تک نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہمیں یقین تھا کہ وہ آجائے گا۔"

میں پہلے کبھی اس کمرے میں نہیں آیا تھا۔ بڑا سا بستر تھا جس کے سرہانے ایک بڑا سا پوسٹر تھا۔ بروس اسپرنگ، پھٹی ہوئی جینز پہنے سر کے گرد رومال باندھے گٹار لیے کھڑا تھا۔ باتھ روم کے دروازے پر ایک چمپینزی کی تصویر لگی ہوئی تھی جس کے ہاتھ میں ٹوتھ برش تھا جس پر وہ پیسٹ لگا رہا تھا۔ بستر کے برابر میں پڑھنے کی ایک چھوٹی سی ٹیبل تھی جس پر کریم کی پرانی کتابیں سلیقے سے سجی ہوئی تھیں۔ ٹیبل کے اوپر "ہیرالڈ" کے کسی پرانے ٹائیٹل کو پھاڑ کر دیوار پر چپکایا گیا تھا۔ ٹائیٹل پر ایک مردہ فاختہ کی تصویر تھی جس کے اوپر امن کا نشان لگا ہوا تھا۔ اس ٹائیٹل کے ساتھ ہی پاکستان کا ایک جھنڈا بھی ذرا سا نیچے کر کے لگا ہوا تھا۔ الٹے ہاتھ کی دیوار پر ایک فریم میں کریم کی بچپن کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ سیدھے ہاتھ کی دیوار پر ایک اور بڑا سا پوسٹر مائیکل جیکسن کا لگا ہوا تھا جس میں اس نے دونوں ہاتھ کریم کی تصویر کی طرف اٹھائے ہوئے تھے یہ اس کی ناچتی ہوئی تصویر تھی۔ پوسٹر کے نیچے موٹا موٹا لکھا ہوا تھا۔ "آئی ایم بیڈ آئی ایم بیڈ" (Iam bad, Iam bad) میں نے یہ کمرہ پہلے نہیں دیکھا تھا۔ بڑے سے گھر کا یہ نیچے کا کمرہ تھا۔ اب تو کریم پہلی منزل کے ایک بڑے سے کمرے میں ٹھہرتا تھا۔ میں چاروں طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ مجھے ان کی چبھتی ہوئی مضبوط سی آواز آئی تھی۔ "کل میں یہ سارے پوسٹر اتار دوں گا۔ یہ کتابیں ردی میں چلی جائیں گی۔ یہ سائیکل جو کونے میں کھڑی ہے مالی کے بیٹے کو دے دوں گا۔ یہ چھوٹی چھوٹی سیپیوں کا ڈھیر جو میں نے اور کریم نے ساتھ ساتھ کلفٹن پر جمع کیا تھا جس کو اس نے کبھی بھی کسی کو ہاتھ لگانے نہیں دیا تھا اسے میں سمندر میں دوبارہ پھینک آؤں گا۔ یہ اس کے اسکول کے زمانے کے ڈاک کے ٹکٹوں کا البم بھی رکھنا بے کار ہے۔ یہ گھر کے پرانے اخباروں اور کاغذوں کے ساتھ بک جائے گا۔ یہ کمرہ اور اس کمرے کی چیزیں اب کوئی معنی نہیں رکھتی ہیں۔ ان سے میرا رشتہ ٹوٹ چکا ہے اور یہ رشتہ ہے جس نے مجھے بار بار تمھارے سامنے شرمندہ کیا ہے۔ تم پرسوں میرا آپریشن رکھ لو۔ کریم کو بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس دفعہ تم پریشان نہیں ہوگے۔ میں وہاں سے نہیں بھاگوں گا۔"

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ صحیح کہہ رہے ہیں۔ انھوں نے بڑے اعتماد سے کہا "آؤ چلو چائے پیتے ہیں۔"

فس ٹیولا

سندھی لڑکیاں کبھی بھی مجھے اپنی طرف متوجہ نہیں کرسکیں۔ مجھے وہ خوب صورت لگتی ہی نہیں تھیں، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ بہت دنوں تک میں یہی سمجھتا رہا کہ سندھی لڑکیوں میں ضرور کوئی خرابی ہوتی ہے۔ کہیں پر کوئی جسمانی نقص ہے یا کچھ ادھوری سی ہیں۔ میں نے کبھی بھی انھیں مکمل یا حسین نہیں سمجھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ سندھ کے بڑے سے بڑے سیاست دان، پیر، وڈیرے یہاں تک کہ متعصب قوم پرستوں نے بھی ایک نہ ایک غیر سندھی عورت گھر میں ضرور رکھی ہوئی تھی۔ یہاں تک کے میرے پڑھے لکھے سندھی دوستوں میں سے آدھوں کی بیویاں سندھنیں نہیں تھیں۔

لیکن موران کو دیکھتے ہی جیسے میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ اتنی خوب صورت عورت! لفظ خوب صورت اس کے حسن کا مکمل طور پر احاطہ نہیں کرسکتا تھا۔ میری نظروں کے سامنے سے کلاڈیا شیفرڈ نوری کیمبل، جیری ہل یاسمین غوری اور مادھوری ڈکشٹ ایک کے بعد ایک گزرتی چلی گئیں مگر اجرک میں چھپی ہوئی یہ لانبی لڑکی مختلف تھی، بہت مختلف۔ اچھی تھی بہت اچھی۔ میں ساکت ہو کر اسے تکتا ہی رہ گیا۔

لانبے قد کے اوپر طویل سی گردن، اس کے پیچھے سے چھپے سر اور گھنے بالوں کے ساتھ جو چہرہ تھا اس میں ایک عجب قسم کا سحر تھا۔ اضمحلال زدہ چہرہ، گہری سیاہ آنکھوں کے ساتھ ایک عجیب طرح کی کشش تھی اس میں۔ وہ ٹھٹے سے آئی تھی۔

ٹھٹے شہر سے ۱۴ میل دور ان لوگوں کا گاؤں تھا۔ چھوٹا سا، جہاں جنم جنم سے اس کا پریوار رہتا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان بنا تو اس کی ماں وہیں پیدا ہوئی تھی۔ اس کی ماں نے بار بار اسے یہی بتایا تھا کہ جب وہ پیدا ہوئی تو موران کی نانی مر گئی تھی۔ پیدا ہونے کے ساتھ ہی اتنا خون بہا تھا کہ گاؤں کی دائی کو کئی سال یاد رہا تھا۔ اس کی ماں دودھ کے لیے روتی رہ گئی تھی اور نانی کے جسم کا خون آہستہ آہستہ بہہ گیا تھا۔ اس کی ماں ان دیکھی، مری ہوئی اس عورت کو نہیں

بھول سکی تھی۔ پھر اس کی بھی شادی ہو گئی اور ۶۵ء کی جنگ کے فوراً بعد موران پیدا ہوئی۔ اس کا باپ اسے ٹھٹھ کے ہسپتال لے کر گیا تھا۔ جہاں اس پر باربار دورے پڑے تھے۔ وہ پانچ دن تک بے ہوش پڑی رہی تھی۔ شاید کئی دفعہ مری تھی۔ گاؤں آنے کے بعد بھی باپ نے بتایا تھا کہ کئی دنوں تک وہ اچھی نہیں رہی' پھر آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ ٹھیک ہو گئی تھی۔ موران کے علاوہ کوئی اور بچہ نہیں تھا اس کا۔ ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ موران کے پیدا ہونے کے بعد سے اس کی بچہ دانی میں کوئی خرابی ہو گئی تھی۔ اس کے باپ نے بھی دوسری شادی کرلی تھی۔

موران کی شادی بخش علی سے ہوئی تھی۔ وہ موران کی طرح سے ہی خوب صورت جوان تھا۔ گاؤں کا پلا ہوا اور کھیتوں میں کام کر کر کے مضبوط جسم کا مالک بنا تھا۔ دیوانوں کی طرح چاہتا تھا موران کو اور چاہتا بھی کیوں نہیں وہ تھی ہی ایسی چاہنے کے قابل اور پوجنے کے قابل۔ اسے پاکر وہ خوش ہو گیا تھا' جیسے زندگی کا مقصد مل گیا ہو۔ وہ بھی بہت خوش ہوئی تھی بخش علی کو پاکر۔ ان دونوں کو راضی خوشی دیکھ کر موران کی ماں بھی بہت سال کے بعد کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ زندگی حسین تھی' دیہات کی تمام تر مشکلات' مجبوریاں' نامحرومیوں کے باوجود صبح ہوتی تھی تو زندہ رہنے کی خواہش کے ساتھ ہوتی تھی اور رات اس امید کے ساتھ کہ کل تو پھر صبح ہونی ہے۔

جیسے ہی موران کے حمل ٹھہرا' چھوٹے سے اس کنبے میں ایسا ہی ہوا تھا جیسے ہزاروں سال کے بعد کسی دیہات میں بجلی آجاتی ہے۔ ہر چیز صاف ستھری اور ایسی نظر آتی ہے جیسے دن کو آتی تھی۔ بخش علی اور موران نے اکٹھے بہت سارے خواب بنے تھے۔ مستقبل کو دور تک دیکھا تھا' کوکھ میں پلنے والی اس ننھی سی روح کے بارے میں نہ جانے کیا کیا سوچ لیا تھا۔ زندگی حسین تھی' خوب صورت تھی' صبح کے سورج کی طرح تازہ دم' ابھرنے کی تمام طاقتوں کے ساتھ رواں دواں ------

موران کی ماں اسے ٹھٹھے کے ہسپتال لے جانا چاہتی تھی' اسے اپنی ماں کی موت یاد تھی جس کے بارے میں اسے بتایا گیا تھا کہ کس طرح سے خون بہا تھا اور کیسے وہ مر گئی تھی۔ اسے موران کا پیدا ہونا یاد تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ موران کے ساتھ بھی ایسا ہو' اس کی زندگی میں تو صرف موران تھی' صرف موران۔ شوہر کی دوسری شادی کے بعد تو وہ اسے ہی دیکھ دیکھ کر زندہ رہی تھی۔

مگر دائی خدیجہ کا خیال تھا کہ موران کا سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا اور موران کے

سسرال والے خدیجہ کے تو جیسے مرید تھے۔ انھیں یقین تھا کہ اگر موران شہر گئی تو آپریشن ہو جائے گا۔ موران بھی آپریشن نہیں کرانا چاہتی تھی۔ کتنی عورتیں ٹھٹے کے ہسپتال میں آپریشن کے دوران یا آپریشن کے بعد مر گئی تھیں۔ خوشی کے اس گھر میں بچے کا جنم دن جیسے جیسے قریب آرہا تھا' ویسے ویسے ایک انجانے خوف کے سائے بھی منڈلا رہے تھے۔

پھر یہی ہوا کہ باوجود موران کی ماں کی کوششوں کے جب موران کے درد اٹھنے شروع ہوئے تو دائی خدیجہ کی ہی بات مانی گئی۔ دو دن تک وہ درد میں تڑپتی رہی اور دائی خدیجہ یہی کہتی رہی کہ بس اب بچہ ہونے والا ہے اور اب بچہ ہوجائے گا۔ مگر بچہ نہ ہوا وہ تڑپتی رہی' سسکتی رہی اور اس کی ماں گھر کے باہر بلکتی رہی اور بخش علی سے الجھتی رہی۔ جب پاکستان بنا تھا تو اس کی ماں مر گئی تھی۔ ۶۵ء کی جنگ کے بعد جب اس نے موران کو جنم دیا تھا تو خود مرتے مرتے بچی تھی۔ بانجھ ہو کر رہ گئی تھی اور اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس کی بیٹی بھی مرجائے گی۔ اس کا اپنا غم تو اسے یاد بھی نہیں تھا۔ اسے ایسا لگا تھا جیسے زندگی ایک طویل کرب سے بھری کراہ ہے۔ جب سب کو یقین ہوگیا کہ موران مرجائے گی تو موہنجو ڈارو کے زمانے کی بیل گاڑی پر اس کو ڈال کر دھیرے دھیرے ہچکولے کھاتے ہوئے چھ گھنٹے میں وہ لوگ ٹھٹہ کے سول ہسپتال پہنچے۔ دوپہر کے بارہ بجے' پتھروں کی اس عمارت کو دور سے دیکھ کر انھیں ایک امید سی پیدا ہوئی تھی۔ ایک آسرا سا ہوا' ایسا لگتا تھا جیسے بہت سارے امید کے دیے جل اٹھے ہیں۔ ہسپتال پہنچ کر بخش علی اور موران کی ماں نے اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر موران کو زچہ وارڈ میں بچہ جننے کے کمرے میں پہنچایا۔ وہاں کوئی بھی ڈاکٹر نہیں تھا۔ اس گندے سے کمرے میں ٹوٹے ہوئے چار بستر نما ٹیبلوں پر عورتیں پڑی ہوئی تھیں۔ دوسرے کمرے میں عورتیں زمین پر لیٹی ہوئی نہ جانے کس کا انتظار کررہی تھیں۔ ڈاکٹر صبح آئی تھی اور گیارہ بجے ایمبولنس لے کر چلی گئی تھی۔ بوڑھی سی نرس جس نے موران کو دیکھا۔ اس نے موران کی ماں کو سمجھایا کہ موران کو لے کر فوراً" کراچی کے سول ہسپتال چلی جائے' کیوں کہ اس کا تو آپریشن ہوگا۔ آپریشن کرنے والی ڈاکٹر آبھی گئی تو بے ہوش کرنے والا ڈاکٹر نہیں ہے اور پچھلے ایک ہفتے سے آکسیجن بھی ختم ہوگئی تھی۔ اس ہسپتال میں ہے کیا انگریزوں کی بنائی ہوئی پتھر کی عمارت' اس عمارت کے پتھر بھی بک جاتے اور سرکاری اہلکار انھیں بھی اپنے گھروں میں لگا لیتے اگر ان کا بس چلتا۔ یہ ہسپتال تھوڑی تھا کچھ لوگوں کے پیدا کرنے کی جگہ تھی۔ ہزاروں سال پرانے ٹھٹہ شہر میں ہزاروں سال سے زمین پر رہنے والوں کے ساتھ جو کچھ ہوتا آیا ہے وہی اب تک ہو رہا ہے علاقے کے ایم این اے' ایم پی اے' کونسلر اور سرکاری اہلکار کے وہ مسائل ہیں ہی نہیں جو موران اور اس کی ماں کے تھے۔ موران کی ماں

کو ایسا ہی لگا تھا جیسے اب اسے بِنا موران کے زندگی کا بقیہ سفر گزارنا ہو گا۔ اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی ایک درد سا ہوا تھا۔ کھلے ہوئے نیلے آسمان کی طرف دیکھ کر اس کے آنسو نکل آئے تھے۔ گڑگڑا کر اس نے دعائیں کی تھیں۔ سہون کا واسطہ دیا تھا۔ ٹھٹہ کے مزاروں کی قسم دی۔ ان پیروں اور شاہوں کو یاد کیا جن کے پاؤں پر اس کے گاؤں کے لوگ سر رکھتے تھے' جن کے کہنے سے ووٹ دیتے تھے' جن کے حکم پر جان دیتے تھے۔ آسمان سے زمین تک' سیہون سے ٹھٹہ کے مزاروں تک سناٹا تھا' خاموشی تھی اور زندگی ایک ایسا سفر تھا جو ختم ہونے سے پہلے چرکے پر چرکا لگا رہا تھا۔

منگھی ٹرانسپورٹ کی بس پر درد سے تڑپتی ہوئی موران نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ گھارو' گجو الے جی' دھابے جی' پیپری' اسٹیل مل' لانڈھی' ملیر' ڈالمیا' سبزی منڈی' تین ہٹی' لسبیلہ اور گارڈن سے ہوتی ہوئی' جھٹکے کھاتی ہوئی موران کی طرح سے ہی تڑپتی ہوئی بس لی مارکیٹ پہنچی۔ ادھ مری موران کو ٹیکسی میں ڈال کر وہ سول ہسپتال پہنچے۔

ڈاکٹروں نے دیکھا اور اسے آپریشن تھیٹر لے کر گئے۔ بخش علی نے خون دیا' نیچے میڈیکل اسٹور سے بھاگ بھاگ کر دوائیں لا کر دیں' بے ہوشی کی دوا' اینٹی بائیوٹک' پیشاب کی نلکی' پیشاب کی تھیلی۔ آہستہ آہستہ روپے ختم ہوتے جا رہے تھے۔ بخش علی کا چہرہ سوکھتا جا رہا تھا اور اس کی ماں کی آنکھوں میں آنسو ختم ہو چکے تھے۔ زندگی صحرا کی طرح خشک بھی تھی اور ویران بھی۔

مری ہوئی بچی پیدا ہوئی تھی۔ موران کی ماں نے سوچا تھا اچھا ہوا مر گئی۔ بچی کے لیے سندھ میں رکھا ہی کیا ہے' وہ غریب بچی گاؤں میں رہنے والی۔ اسے تو صرف موران کی فکر تھی۔ جب وہ آپریشن تھیٹر سے نکلی تھی تو اسے ایسا لگا کہ وہ مر چکی ہے۔ اس کے منہ' ہاتھ' پیٹ اور نہ جانے کہاں کہاں ٹیوب لگے ہوئے تھے۔ خون جا رہا تھا' خون آ رہا تھا۔ بہت دیر تک اس کے خشک حلق میں جیسے سانس اٹک کر رہ گئی تھی۔

دو دن بعد اسے ہوش آیا۔ بخار سے تپا ہوا چہرہ اور بدن۔ اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔ اس کی ماں کو ایسا لگا جیسے اس نے خود آنکھیں کھول دی ہیں۔ جیسے دنیا دوبارہ خود بخود وجود میں آ گئی ہے۔ کائنات رقص کر رہی ہے اور سندھ کے تمام صحرا بارش سے جل تھل ہو گئے ہیں۔

موران کو دس دن ہسپتال میں رہنا پڑا اور دسویں دن جب ڈاکٹروں نے پیشاب کی نالی نکالی تو پیشاب خود بخود آنے لگا تھا۔ وہ پیشاب روک نہیں سکتی تھی۔ وہ لیٹی ہو کہ بیٹھی ہو' کھڑی

ہو کہ چلتی ہو، پیشاب آہستہ آہستہ بہتا رہتا تھا۔

ڈاکٹروں نے دیکھا اور کہا تھا کہ موران کو دس ہفتے کے بعد دوبارہ لانا ہوگا۔ اس وقت ہی اس کا آپریشن ہوگا اور پیشاب رک جائے گا۔

اس دن وہ دس ہفتے کے بعد میرے کلینک میں آئی تھی۔ اس کی ماں اور بخش علی ساتھ تھے۔ اس کا ستا ہوا چہرہ اس کی لانبی لانبی پلکوں کے ساتھ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اس کی طویل گردن اور گھنے بالوں سے بھرا ہوا سر...... وہ اپنی تمام تر خوب صورتی کے ساتھ سندھی لڑکیوں کے بارے میں میرے ذہن میں بسے ہوئے خیال کو نکال چکی تھی۔ اسے فس ٹیولا ہوگیا تھا۔ میں نے اس کے شوہر کو بتایا، اس کی پیشاب کی تھیلی اور بچہ دانی کے راستے کے درمیان سوراخ ہوگیا ہے۔ میں نے ایسے بہت سے مریض دیکھے تھے۔ جب بچہ پیدا ہونے میں دیر لگتا ہے اور اس کا سر کسی وجہ سے پھنس جاتا ہے تو اس سر کے دباؤ کی وجہ سے پیشاب کی تھیلی اور بچہ دانی کے راستے کے درمیان میں یہ سوراخ ہوجاتا ہے۔ پھر پیشاب رکتا نہیں ہے، جتنا بھی پیشاب آتا ہے وہ اس سوراخ سے رستا رہتا ہے۔ موران کا فس ٹیولا بہت بڑا تھا۔

اسے میں نے ہسپتال میں داخل کرلیا تھا۔ اس کا پہلا آپریشن ناکام ہوگیا تھا۔ وہ دس دن ہسپتال میں رہ کر واپس ٹھٹہ چلی گئی۔ سوراخ اتنا بڑا تھا کہ باوجود تمام کوششوں کے مکمل طور پہ بند نہیں ہوسکا۔ اسے میں نے چھ ہفتے کے بعد بلایا تھا۔

چھ ہفتے کے بعد موران اپنی ماں کے ساتھ آئی تھی۔ وہی اداس چہرہ، امید لیے ہوئے سب کچھ وہی تھا۔ موران کی ماں نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے شوہر نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ گاؤں میں کوئی اس سے ملتا نہیں ہے اس کے پاس سے ہر وقت بدبو آتی رہتی ہے۔ اس نے میرے پیروں کو پکڑ لیا۔ اتنی عاجزی سے مجھ سے کہا کہ "ڈاکٹر میری بیٹی کو صحیح کردو، میرا تو کوئی اور ہے بھی نہیں۔" اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو تھام کر میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی سندھی میں کہا تھا۔ "کوشش کروں گا، ضرور کوشش کروں گا۔" اس کے کپکپاتے ہوئے ہاتھ لرز رہے تھے، اس نے بڑے چاؤ سے بڑی محبت سے میرے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے یہ موران کی ماں کے ہاتھ نہیں ہیں بلکہ میری ماں کے ہاتھ ہیں۔ محبتوں سے بھرپور جذبوں سے سرشار، مگر میں کچھ نہ کرسکا، چاہنے کے باوجود۔ چار گھنٹے تک آپریشن کرنے کے باوجود۔ دوسرا آپریشن بھی ناکام ہوگیا۔ میں موران کی ماں سے میں آنکھ نہیں ملا سکا تھا۔

اس کے بعد وہ بہت دنوں کے بعد آئی۔ اس کی ماں اس کے ساتھ تھی۔ اسے وارڈ میں داخل کرکے دو دن کے بعد وہ چلی گئی۔ موران کے لیے میں نے ایک اور آپریشن کرنے کا فیصلہ

کیا تھا۔ ایک سرجن دوست کے ساتھ مل کر ایک نئی پیشاب کی تھیلی بنانے کی کوشش کی تھی۔ پہلے پانچ دن تک اس کا پیشاب آنا بند ہوگیا۔ ہم سب خوش تھے' بڑے پرامید' مگر چھٹے دن پیشاب پھر آنے لگا تھا۔ وہ بڑی پریشان تھی' بالکل پاگلوں کی طرح سے' کبھی ہنستی تھی' کبھی روتی تھی۔ نہ کوئی سوال نہ کوئی جواب۔ کبھی کھایا' کبھی نہیں کھایا۔ میں اسے دیکھتا تھا اور اس کی ماں کا پتھرایا ہوا چہرہ میرے سامنے آجاتا تھا۔ کاش! میں کچھ کر سکتا۔ کاش! میں کچھ کر سکتا۔

انگلستان میں سال ہا سال کام کرتا رہا۔ نہ جانے کیا کیا سیکھتا رہا۔ کینسر کا علاج' بانجھ پن کا مسئلہ' ٹیسٹ ٹیوب بے بی۔ وہاں میں نے ہزاروں عورتوں کو دیکھا تھا مگر کبھی بھی کوئی فس ٹیولا نہیں دیکھا تھا۔ کراچی واپس آکر ہر تھوڑے دنوں بعد کوئی نہ کوئی عورت فس ٹیولا کے ساتھ آجاتی تھی۔ پھر میں آہستہ آہستہ فس ٹیولا صحیح کرنے میں لگ گیا تھا۔ پھر باقی چیزیں بھولتا ہی چلا گیا' مگر موران کا فس ٹیولا اتنا بڑا تھا کہ تمام کوششوں کے باوجود میں ہار گیا۔

تھوڑے دنوں کے بعد ہم لوگوں نے اسے دماغی امراض کے وارڈ میں بھیج دیا۔ مجھے پتا لگا تھا کہ دواؤں نے اس پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ جس کے بعد اسے بجلی کے جھٹکے دیے گئے تھے۔ پھر وہ بولنے لگی تھی' اس کی ماں اس کے ساتھ تھی مگر موران اپنی ماں سے کم بولتی تھی بلکہ اس سے جھگڑا کرتی رہتی تھی۔ گاؤں نے موران کو مسترد کردیا تھا۔ موران کا باپ' شوہر' سسرالی سب سمجھتے تھے کہ اس پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔ گاؤں کے مولوی نے بھی یہی کہا تھا کہ جس لڑکی کا پیشاب بہتا رہے وہ ناپاک ہوتی ہے اور ناپاکوں سے صرف شیطان کی دوستی ہوتی ہے۔ موران کو اپنے شوہر کا غم تھا جس نے قسمیں بھلادی تھیں' وعدے بھول گیا تھا۔ اس پیشاب کے جانے میں اس کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ تو اس آنے والے بچے کی وجہ سے ہوا تھا جو اس کے شوہر کا بچہ تھا۔ ان کی محبت کی یادگار' ان کے خاموش اور ذاتی لمحوں کا تحفہ۔ وہ اسے دیکھتی اور روتی تھی۔ اسے اپنے نامکمل جسم سے آہستہ آہستہ نفرت سی ہوتی جارہی تھی۔ اسے سب نے مسترد کردیا تھا۔ موران کسی کو بھی مسترد نہیں کرسکتی تھی۔ وہ تو صرف اپنی ماں کو ہی مسترد کرسکتی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے اپنی ماں سے نفرت ہوگئی تھی۔ ایک روز میں اس کی ماں کے ساتھ دماغی امراض کے وارڈ اسے دیکھنے گیا۔ وہ وارڈ کے چوکیداروں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور عجیب قسم کا ایک آدمی اور بھی تھا وہاں پر۔ ایسا ہی آدمی جن کو سول ہسپتال میں دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ یہ لوگ چاروں طرف گھومتے رہتے ہیں۔ کبھی دواؤں کے بہانے سے' کبھی خون کے بہانے سے' کبھی کچھ' کبھی کچھ۔ مریضوں کی بیٹیوں' بیویوں' بہنوں اور یہاں تک کے مریضوں کے ساتھ بھی وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں جو کہانیوں میں ہوتا تھا۔ نہ جانے کتنے

معصوموں کو پامال کیا ہے ان لوگوں نے۔ ہم دونوں کو دیکھ کر وہ لوگ فوراً ہی چلے گئے۔ موران بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس نے ایک پشیمانی کی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا اور اپنی ماں پر ناراض ہونے لگی۔ تھوڑی دیر میں میں واپس آگیا۔

دو دن بعد صبح صبح میں اپنے کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ موران کی ماں روتی ہوئی آئی۔ ”ڈاکٹر وہ چلی گئی۔ پتا نہیں کدھر ہے۔“ کل دوپہر کے بعد سے موران وارڈ چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ میرے کمرے کے بنچ پر بیٹھی ہوئی وہ بے سہارا بڑھیا عورت ایک بےکس کی طرح بین کر رہی تھی۔ ”وہ مر کیوں نہیں گئی۔ مجھے چھوڑ کر کہاں چلی گئی‘ موران موران.....“

میں سوچتا رہا‘ ٹھٹہ کا گاؤں‘ ٹھٹہ کا ہسپتال‘ بچہ جننے والی عورت اور سندھ کے وڈیرے‘ جاگیردار‘ پیر‘ فقیر‘ پاکستان کے سرمایہ دار‘ چودھری‘ مولوی‘ امیر و کبیر جو اپنے بچوں کے ٹانسل نکلوانے امریکا جاتے ہیں‘ جو اپنے بچے کے آپریشن کے لیے لندن جاتے ہیں‘ لاکھوں ڈالر‘ لاکھوں پاؤنڈ اور ٹھٹہ کا ہسپتال‘ جہاں نہ ڈاکٹر ہے نہ نرس‘ نہ آکسیجن ہے نہ پانی..... موران ہے موران کی ماں ہے‘ درد بھری زندگی ہے اور فس ٹیولا ہے۔

دو دن تک اس کی ماں پاگلوں کی طرح گھومتی رہی۔ بچوں کی طرح بلکتی رہی‘ کوشش کے باوجود موران کا کچھ پتا نہیں چلا۔ پھر وہ واپس ٹھٹہ چلی گئی۔

کئی مہینوں کے بعد میں کلفٹن میں آغا سپر مارکیٹ کے سامنے اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے اپنے دوست امجد کا انتظار کر رہا تھا کہ میرے سامنے ایک لمبی سی گاڑی رکی۔ جس میں سے ایک گندا سا عرب زور سے ہنستا ہوا اترا تھا اور آغا سپر مارکیٹ میں چلا گیا۔ دروازہ کھلتے ہی خوشبو کا تیز بھبکا میں نے محسوس کیا۔ اندر موران بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ باہر آگئی۔ وہی خوب صورت لڑکی‘ اسی ناک نقشے کے ساتھ‘ وہی چہرہ‘ وہی آنکھیں‘ وہی معصوم صورت‘ حسن کی مکمل مورت‘ کلاڈیا‘ شبنم کا سا انداز‘ یاسمین غوری جیسی سیاہ اور گہری آنکھیں‘ نومی کیمبل کا سا نکلا نکلا لانبا سا بدن‘ جیری ہل کی طویل گردن اور مادھوری ڈکشٹ کے نپے تلے ہوئے قدم‘ بھارت ناٹیم کا رقص۔ وہ دھیرے سے مسکرائی اور میرے قریب آکر عجیب سے انداز سے بولی۔ میری ماں گاؤں چلی گئی تھی۔ میرے پاس کچھ نہ تھا اس کے لیے۔ صرف پیشاب تھا پیشاب۔ اس پیشاب کو چھپانے کے لیے خوشبو میں ڈوبی ہوئی ہوں۔ اس نے اپنی لانبی لانبی پلکوں والی آنکھوں کو اٹھا کر دھیرے سے کہا۔ میں رنڈی بن گئی ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ گندا سا عربی آگیا اور وہ اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے اوپر بہت اوپر ایک بڑا سا فس ٹیولا ہے‘

جہاں سے موران کا پیشاب بہہ بہہ کر آرہا ہے۔ میرے سامنے سندھ کے، پنجاب کے، پاکستان کے، چانڈیو، بگھیو، بھٹو، تالپور، جونیجو، شاہ، پیر، لغاری، مزاری، سومرو، چوہدری اپنی بڑی بڑی پگڑیوں کے ساتھ کھڑے ہیں۔ جن کو تر کرتا ہوا یہ پیشاب پیشانی اور چہروں سے رستا ہوا ٹپ ٹپ کرکے سندھ کی دھرتی پر جذب ہو رہا ہے۔
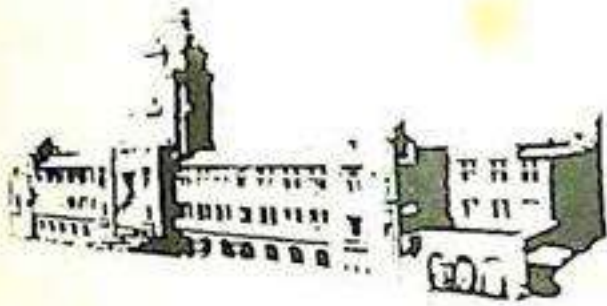
کھیلن کو مانگے چاند

اریزونا۔ ۲۰ر اپریل

ڈیئر امجد!

خط ملا اور تمھارے پروگرام کا پتا لگا۔ پاکستان میں تعلیم پھیلانا تو بہت ضروری ہے۔ تم نے صرف سندھ کی بات کی ہے' میرے خیال میں تو یہ مہم پورے ملک میں چلانی چاہیے کیوں کہ پشاور سے لے کر کیماڑی تک جہالت کا دور دورہ ہے۔ تم اس کام کے لیے پیسے جمع کر رہے ہو یہ تو اچھی بات ہے۔ تمھارا خط اور پروگرام کافی طویل ہے۔ میرے خیال میں تو لوگوں کو ضرور اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہیے۔ میں کوشش کروں گا کہ خود بھی کچھ کروں اور دوستوں سے بھی کچھ مدد لوں۔ میں جلد ہی تم کو خط لکھوں گا۔

فقط ... ۔ رشید

.... ○ ....

نیو جرسی۔ ۲۲ر اپریل

بھائی امجد !

یار تیرا خط ملا ساتھ میں سندھ میں تعلیم پھیلاؤ مہم کی تفصیلات اور تم لوگوں کی اپیل۔ تمھاری یہ بات درست ہے کہ جب امریکن ڈاکٹر بنتا ہے تو تقریباً" دو لاکھ ڈالر کا مقروض ہوتا ہے اور شروع کے چند سال یہ دو لاکھ ڈالر کا قرضہ اتارتا رہتا ہے۔ تقریباً" یہی حال یہاں کے انجینئر' فارمسٹ اور دوسرے پیشہ ورانہ کام کرنے والوں کا ہے۔ ہم لوگوں نے ڈاؤ میڈیکل کالج میں دو سو چالیس روپے سالانہ فیس اور دو سو روپے کراچی یونیورسٹی

کے امتحان کی فیس دی تھی۔ کالج کی لینڈنگ لائبریری سے پہلے سال سے آخری سال تک مفت میں کتابیں لے کر پڑھتے رہے۔ پانچ سال کے عرصے میں مشکل سے ۳ر ہزار روپے فیسوں کی مد میں خرچ کیے گئے تھے۔ پاس ہونے کے فوراً بعد ہی میں بہت سارے پاکستانی ڈاکٹر، انجینئروں، فارمیسی گریجویٹ کی طرح امریکا آگیا تھا۔ تھوڑی سی محنت کے بعد یہاں کے ریزیڈنسی پروگرام میں شامل ہوگیا تھا۔ امریکن بورڈ کا امتحان اور فیلوشپ کرنے کے بعد میری اور بہت سے لوگوں کی طرح پرائیویٹ پریکٹس ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اپنی محنت سے بہت کچھ کما رہا ہوں اور میری طرح سے بہت سے دوسرے پاکستانی بھی محنت کررہے ہیں اور کما رہے ہیں اور خوب کما رہے ہیں۔ چند ہزار خرچ کرکے یہ برا سودا نہیں ہے۔

تمھاری بات بالکل صحیح ہے کہ ہم لوگوں کو پاکستان اور پاکستانی لوگوں کے لیے کچھ کرنا چاہیے اور کچھ نہیں تو اتنا تو کرنا چاہیے کہ پاکستانی قوم کے جو پیسے ہماری تعلیم پر خرچ ہوئے ہیں وہی کسی صورت سے واپس کردینے چاہییں۔ میں نے کوشش کی تھی۔

تمھیں یاد ہے کہ تقریباً اٹھارہ سال پہلے دوسری دفعہ کراچی آیا تھا تو مجھے پتا لگا تھا کہ شاہ فیصل کالونی میں غریبوں کے لیے ایک ہسپتال کھولا جارہا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ شاید میری مدد سے کچھ کام ہوسکے۔ میں خود وہاں گیا تھا اور ٹرسٹ کے کرتا دھرتا ڈاکٹر سے ملاقات کی تھی۔ آٹھ سال تک میں پابندی سے ہر ماہ سو ڈالر بھیجتا رہا تھا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ میرے پیسوں سے غریبوں کا مفت میں علاج ہورہا ہوگا۔ دس سال پہلے جب میری والدہ کا انتقال ہوا تھا تو میں پاکستان آیا تھا۔ واپس آنے سے پہلے میں نے سوچا کہ اس ٹرسٹ کا ہسپتال کو دیکھ لوں اور اپنی ماں کے نام پر کوئی خاص کام کرلوں۔ میں ایک لاکھ ڈالر تک خرچ کرنے پر تیار تھا لیکن جب میں وہ ٹرسٹ ہسپتال دیکھنے گیا تو مجھے اپنے بے وقوف بننے کا شدید احساس ہوا۔ وہ ہسپتال مکمل طور پہ پرائیویٹ ہسپتال تھا اور میرے بھیجے ہوئے پیسوں کا کوئی حساب نہیں تھا۔ غریبوں کے مد میں کسی بھی قسم کا کوئی خرچ نہیں تھا۔ درحقیقت وہ ہسپتال نہیں تھا، لوٹ مار کا ایک اڈا تھا، جس کی تعمیر میں میرے ڈالر بھی خرچ ہوئے تھے۔ تم میرے غصے کا اندازہ کرسکتے ہو۔

میں نے فیصلہ کیا تھا کہ کبھی بھی پاکستان میں کسی ادارے کی مدد نہیں کرنی ہے کیوں کہ اس ملک میں ہمارے جیسے اور تمھارے جیسے لوگوں کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اب تمھارے

اس خط نے مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔ تمھاری مہم تو اصلی مہم ہی ہو گی۔ تمھاری بات اور ہے۔ تم کو میں جانتا ہوں، تمھارے پروگرام سے نہ صرف یہ کہ مطمئن ہوں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت سب سے زیادہ تعلیم کی کراچی میں ضرورت ہے۔ میں تمھاری ضرور مدد کروں گا۔ تمھارے دیے ہوئے اکاؤنٹ نمبر میں میری طرف سے دو سو ڈالر پہنچ جائے گا اور کوشش کروں گا کہ ہر ماہ کچھ نہ کچھ بھیجتا رہوں۔

اسما کا کیا حال ہے۔ کبھی امریکا بھی آنے کا پروگرام بناؤ۔ سارے دوستوں کو میرا اسلام کہنا۔

فقط ... ۔ رحمان

.... ○ ....

لندن۔ ۲۰ر اپریل

ڈیئر امجد

السلام علیکم !

امید ہے کہ بالکل خیریت سے ہو گے۔ تمھارا خط ملا تھا مگر جواب دینے میں دیر ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں کچھ زیادہ ہی مصروف تھا۔ میں نے اصل میں ایک اور دکان بھی کھول لی ہے۔ خدا کے فضل سے اور بزرگوں کے دعاؤں سے کام کافی چل نکلا ہے۔ اگر اسی طرح سے کام بڑھتا رہا تو اور بھی دکانیں کھولوں گا۔ بس دعا کرتے رہو۔ میرا پروگرام ہے کہ انگلینڈ کے ہر شہر میں میری کم از کم ایک دکان ہونی چاہیے۔ جہاں پاکستانی، ہندوستانی، سیلونی اور بنگلہ دیشی کپڑے بک رہے ہوں۔ اس وقت کل ملا کر میری گیارہ دکانیں ہو چکی ہیں۔ اپنے والد صاحب سے کہنا میرے لیے دعا کرتے رہیں۔

تمھارے کام کے لیے دس پونڈ بھیج رہا ہوں۔ مہربانی کر کے رسید بھیج دینا۔

مخلص، تمھارا ... ۔ عبدالکریم

.... ○ ....

مانچسٹر۔ ۲۵ر اپریل

امجد ڈیئر !

تمھارا خط ملا اور سب دوستوں کی خیریت سے آگاہی ہوئی۔ میں یہاں پر بالکل set ہوں۔

میں دو ہفتے کی holidays پر فرانس گیا ہوا تھا۔ پورا سفر بہت enjoyable تھا۔ ہم لوگ پیرس گھومنے کے بعد ایک country-house میں چلے گئے تھے۔ کافی expensive تھا مگر بہت comfortable۔ تم لوگ ضرور کبھی فرانس کا programme بناؤ۔ یہ سفر worth ہے۔

واپس آنے کے بعد روزینہ کافی sick ہو گئی تھی۔ دو دن کے لیے اس کو میرے ہی ہسپتال میں admit کرنا پڑ گیا تھا۔ کوئی خاص بات نہیں تھی، شاید تھوڑا tired ہو گئی تھی۔ اب بالکل fit ہے۔ تم کو اپنے regards دے رہی ہے۔

اور ہاں! فی الحال میں تمھاری help نہیں کر سکوں گا۔ مجھے forgive کرنا۔

Love

کریم

.... ○ ....

اوریگون۔ ۲۵ر اپریل

امجد !

تم کو اور تمھارے پورے خاندان کو سلام ہو اور اللہ تم کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ اللہ کے فضل و کرم سے میں یہاں پر خوش ہوں اور اپنا کام دوسرے کاموں کے ساتھ کر رہا ہوں۔

تم نے اپنے خط میں آخر میں خدا حافظ لکھا ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ تمھیں لفظ خدا، اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ لفظ خدا صرف کافروں نے استعمال کیا ہے۔ امید ہے کہ تم آئندہ احتیاط کروگے۔ مسلمانوں کو ہر وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے۔

اس وقت تمام دنیا میں مسلمانوں کا مسئلہ یہودی اور ہندو ہیں اور یہ دونوں مل کر عیسائیوں کو استعمال کر رہے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف مل جل کر کام کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے شاطر ہندو پاکستان کے خلاف ہر وقت سازشوں کا جال بن رہے ہیں۔ اس کام میں اسرائیل کے یہودی ان کی مدد کر رہے ہیں۔ تم دیکھو کہ کس طرح سے ان لوگوں نے بنگلہ دیش بنایا اور ایک ہندو عورت کی اولاد ذوالفقار علی بھٹو کے ذریعے سے یہ کام کرایا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہی بھٹو کو اس کے کیے کی سزا دلوا دی اور جنرل ضیاء الحق کے ہاتھوں سے دہریوں کی حکومت کا خاتمہ کرا دیا۔ مگر یہ صیہونی طاقتیں ایک دفعہ پھر کامیاب ہو گئیں کیوں کہ یہ لوگ ایران، افغانستان اور

پاکستان میں اسلامی طاقتوں کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ پاکستان کے قابلِ ترین جنرلوں کا ایک ہی بار میں صفایا کردیا گیا۔ یہ امریکن سی آئی اے کا بڑا کمال ہے۔ اگر تم تھوڑا سا بھی غور کرو تو ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک بین الاقوامی یہودی سازش تھی۔ ایک ہی وقت پر ان لوگوں نے امریکا اور انگریزوں کی مدد سے نہ صرف یہ کہ ضیاء الحق کا خاتمہ کردیا بلکہ ساتھ ساتھ بی سی سی آئی کا خاتمہ بھی کردیا۔ یہ بینک دنیا بھر میں یہودی بینکوں کے مقابلے میں زبردست جہاد کررہا تھا۔ اب ان لوگوں نے پاکستان کو بھی توڑنے کا پروگرام بنالیا ہے اور اس سلسلے میں بھٹو کی بیٹی ان کے بہت کام آئے گی اور آہستہ آہستہ پاکستان بھی شاید ختم ہوجائے' جس کی کوشش زور و شور کے ساتھ جاری ہے۔

لیکن ان لوگوں کو شاید یہ بات پتا نہیں ہے کہ قرآن شریف میں واضح طور پر لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب یہودیوں کو تباہ کریں گے تو سب کو ایک جگہ پر جمع کریں گے اور اسی لیے اسرائیل بنوایا گیا ہے۔ امید یہ ہے کہ میں مرنے سے پہلے یہ بھی دیکھ لوں گا۔

جہاں تک تعلیم کے سلسلے میں تمہارا پروگرام ہے' میں اس سے اتفاق نہیں کرتا ہوں۔ مسلمانوں کو تمہاری سیکولر تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں نے پاکستان کو دیا ہی کیا ہے۔ میں تمہاری مہم میں شامل نہیں ہوں بلکہ اس کے خلاف ہوں۔

اللہ تعالیٰ تم کو عقل دے اور حالات کو سمجھنے کا شعور۔ پرانا دوست ہونے کے ناتے سے میں تمہارے لیے دعا کرتا رہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہو۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی پناہ میں رکھے۔

عبدالغفور ... مجبور و مغفور

.... ○ ....

نیویارک۔ ۲۸؍ اپریل

امجد پیارے !

تم اور بھابی خوش رہیں میری تو یہی دعا ہے۔

تمہارا تفصیلی خط ملا تھا اور سارے حالات سے آگاہی ہوئی۔ جب بھی تمہارا خط ملتا ہے ایسا ہی لگتا ہے۔

جیسے صحرا میں چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

جب بھی موقعہ ملے اسی طرح سے خط لکھتے رہا کرو۔ تمھاری بھابی کہتی ہیں کہ تمھارا خط پڑھ کر میں خوش ہو جاتا ہوں گویا کہ

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں بیمار کا حال اچھا ہے

ویسے تم اگر خط نہ بھی لکھو تو

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یہاں پر سب خیر ہے اور اب میرا کام کافی چل نکلا ہے۔ کارڈیالو جسٹ ہونے کے ناتے میں کافی مشہور و مقبول ہوچکا ہوں اور ہر طرح کے لوگ میرے مریض ہیں اور آمدنی کا گراف بڑھتا ہی چلا جارہا ہے۔ پیارے دل کا کام ہی ایسا ہوتا ہے۔ تم کو تو پتا ہے کہ

دل ہے کہ نشور ایک باجا ہے سینے کے اندر تاروں کا
جب چوٹ لگے تھرا جائے جو ٹھیس پڑے جھنکار اٹھے

تم نے جو پروگرام بنایا ہے وہ ایک اچھا پروگرام ہے مگر میں اس میں تمھاری مدد نہیں کرسکوں گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت میں خود ڈالر جمع کررہا ہوں۔ تم کو تو پتا ہے کہ کراچی میں میرے خاندان نے میری تعلیم و تربیت میں کافی توجہ دی تھی۔ پھر تمام محرم مجلسوں میں جانا' یومِ حسین کے فنکشن منعقد کرانا' شام غریباں میں علاماؤں کی باتیں سننا۔ اس تعلیم کا یہ زبردست فائدہ ہوا کہ اس لامذہب ملک میں آنے کے باوجود میں نے علیؓ کا' حسینؓ کا' کربلا کا راستہ نہیں چھوڑا۔

یہاں پر کئی دفعہ لوگوں سے بحث وغیرہ ہوئی لیکن اس وقت کی دینی تعلیم اور شریعت کا علم ہونے کی وجہ سے میں نے بحث کرنے والوں کو ناک آوٹ کردیا۔ گورے تو بحث کرتے نہیں ہیں' صرف معلومات حاصل کرتے ہیں اور اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ لیکن عرب' پاکستان اور ہندوستان کے تبلیغی اور سڑے ہوئے سنّی اکثر بحث میں لگ جاتے ہیں۔ لیکن مولا علی کی مدد سے میں نے ہمیشہ ان کا ناطقہ بند کردیا ہے۔ یعنی مجھے ہے حکمِ اذاں لا الہٰ الا اللہ

اب ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ ہمارے بچے اب عجیب و غریب قسم کے سوال کرتے

ہیں۔ ہر قسم کی باتوں میں سائنس لے کر آجاتے ہیں۔ ہم لوگوں نے بھی سائنس پڑھی تھی، اپنے زمانے میں آئن سٹائن، فزکس، کیمسٹری، سب کچھ پڑھا تھا مگر ہمارے نظام تعلیم کی یہ خوبی ہے کہ کبھی بھی سائنس اور اسلام کا ٹکراؤ نہیں ہوا۔ اگر کبھی کسی نے کرنے کی کوشش کی تو ہمارے علما کے پاس ہر سوال کا جواب بھی ہوتا تھا۔ یار تم لوگوں کے بچے بہت خوش قسمت ہیں، سنّی ہیں تو کم از کم ہر جمعے کو مسجد میں مولوی صاحب کی باتیں سن رہے ہیں۔ ہم شیعہ لوگوں میں تو مجلسوں کی روایت ایسی ہے کہ کوئی بگڑ ہی نہیں سکتا ہے۔ دوسری جانب ٹیلی ویژن، ریڈیو اور اخبارات میں کافی مذہب کے بارے میں چھپتا رہتا ہے۔ یہاں تو عجیب حال ہے۔ اسکولوں میں سائنس، ٹیلی ویژن پر سائنس اور سائنس بھی ایسی کہ ہر بچہ ہروقت سوال کرتا رہتا ہے۔ یہ خود کیوں کہ مناسب عیسائی نہیں ہیں لہٰذا بچوں کے ہر سوال کا جواب بھی سائنسی بنیاد پر دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ چاہے بچہ مذہب ہی کیوں نہ چھوڑ دے۔ میری سیکرٹری مجھ سے پوچھ کر ایک دن اپنی تیرہ سالہ لڑکی کو لے کر آگئی جو ایران اور شیعہ مذہب کے بارے میں سوال کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے عیسائیت سے کافی بھڑکانے کی کوشش کی مگر وہ تو مجھے بعد میں پتا لگا کہ دو ہاتھ کی یہ لڑکی پہلے ہی پھری ہوئی ہے، مگر اسلام کے بارے میں کافی پریشان کن سوال اس نے کر دیے تھے۔ یہ لوگ اتنے مادہ پرست ہوگئے ہیں کہ تم اندازہ نہیں کرسکتے ہو۔ انھیں کیا پتا کہ

خدا بندے سے پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

کا کیا مطلب ہے؟

اسی سلسلے میں ہم لوگوں نے ایک پروگرام بنایا ہے اور ہم سارے شیعہ ڈاکٹر ایک لاکھ ڈالر جمع کررہے ہیں تاکہ اس سال پاکستان سے کچھ شیعہ عالموں کو امریکا بلائیں۔ پروگرام یہ ہے کہ امریکا کے ہر بڑے شہر میں مجلسِ عزا برپا کی جائے گی اور اپنے بچوں کو ہم لوگ موقعہ دیں گے کہ ان عالموں سے سوال کریں اور جواب سنیں۔ اس طرح سے یہ لوگ جو پاکستان اور ہندوستان کی مجلسوں سے فیض یاب نہیں ہورہے ہیں انھیں بھی فیض یاب ہونے کا موقعہ ملے گا۔

اس سارے کام میں کافی خرچہ ہے۔ ابتدائی طور پر ان عالموں سے بات تو ہوگئی ہے، گو کہ ابھی ان لوگوں نے اپنی فیس نہیں بتائی ہے مگر اچھی خاصی رقم انھیں دینا ہوگی۔ کسی نے ہمیں یہ کہا ہے کہ جتنا پاکستان میں کماتے ہیں اس کا ڈبل تو انھیں ملنا چاہیے۔ پھر ہر شہر میں مجلس منعقد کرنے میں بھی اچھا خاصا خرچہ آئے گا۔ یعنی ان لوگوں کی فیس، جہاز کا کرایہ، ہر شہر میں جگہ کا

خرچ۔

اور پھر تقریب۔ تم خود سوچو!

امید ہے کہ تم میرے پروگرام کو سمجھ گئے ہو گے۔

شاید تیرے دل میں میری بات اتر جائے

بھابی کو میرا بہت سلام کہنا اور بچوں کو پیار۔

علی علی

تمھارا... محمد حسین

.... ○ ....

ڈبلن۔ ۲۸ر اپریل

امجد !

سلامتی ...

گرونیا اور میرا پیار قبول ہو۔

ہسپتال سے گھر پہنچا تو تمھارا خط ملا۔ تم کیا کر رہے ہو اس کی تفصیلات کا اندازہ ہوا۔ میرا اور گرونیا کا خیال ہے کہ تم جو بھی کر رہے ہو اچھا کر رہے ہو' اور دنیا کے تمام ترقی پذیر ملکوں میں اگر کسی چیز کی کمی ہے تو تعلیم ہے۔ ترقی یافتہ ممالک بہت بڑی رقم تعلیم پر خرچ کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود ہر سال اس رقم میں اضافہ ہی کرتے جا رہے ہیں۔ کراچی میں' لاہور میں اور تمام پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ تعلیم کی کمی کی ہی وجہ سے ہو رہا ہے۔ میں تمھاری باتوں سے اتفاق کرتا ہوں۔

تم نے مجھے کافی شرمندہ بھی کر دیا ہے۔ پاکستان سے آنے کے بعد میں نے کبھی بھی کسی اچھے کام کے لیے کوئی رقم نہیں بھیجی ہے۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ میڈیکل کالج میں حکومت نے جو پیسے ہم لوگوں پر خرچ کیے ہیں وہ تو قوم کی کھوئی رقم ہے۔ تاہم ہم لوگوں نے رقم واپس کی ہے اور نہ ہی وہاں کام کر رہے ہیں۔ رفیق' شمیم' حمید کا خیال ہے کہ جو رقم ہم لوگ اپنے ماں باپ کو بھیج رہے ہیں وہ ایک طرح سے پاکستان کی زرِ مبادلہ کی آمدنی ہے۔

میں اور گرونیا اس بات کو ہضم نہیں کر پاتے ہیں' کیوں کہ سال میں ہزار پندرہ سو پونڈ'

ہماری آمدنی کے تناسب سے اتنی بڑی رقم نہیں اور یہ رقم ملک کا قرض کیا اتارے گی، ماں باپ کا قرض تو اتار سکتی نہیں ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے۔

تم کو ایک اور عجیب بات بتاؤں۔ میری اور گرونیا کی ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے تقریباً برابر کی ہی آمدنی ہے۔ مجھے پتا لگا کہ ڈاکٹر بننے کے بعد سے ہر ماہ گرونیا کے اکاؤنٹ میں سے کچھ رقم concern اور Amnesty International کو جاتی ہے۔ اینمسٹی کے بارے میں تو تمھیں پتا ہی ہے۔ concern آئرش لوگوں کی ایک تنظیم ہے جو ترقی پذیر ملکوں کی غریب آبادی میں کام کرتی ہے۔ میں دل میں کافی شرمندہ ہوا۔ اپنے کالج کے زمانے میں ایدھی کا کام دیکھنے اور پتا ہونے کے باوجود مجھے اتنی توفیق نہیں ہوئی تھی کہ کچھ پیسے ایدھی کو ہی دے دیتا۔

بہرحال میری اور گرونیا کی طرف سے ایک ہزار پونڈ قبول کرو اور تمھارے دیے ہوئے اکاؤنٹ میں ہر ماہ میری طرف سے پچاس پونڈ پہنچ جائے گا۔

کبھی کبھی اسٹیفن گرین پر اور ہرلیز میں گنس پیتا ہوں تو تم بہت یاد آتے ہو۔

اپنا خیال رکھنا اور اسما کو میرا اور گرونیا کا سلام۔

تمھارا ... محمد احمد

.... ○ ....

ڈیلاس۔ ۳۰ر اپریل

مائی ڈیئر امجد !

امید ہے کہ یہ خط تمھیں خوش و خرم پائے گا۔

مصروفیات کی وجہ سے تمھیں جلد جواب نہیں دے سکا۔ پاکستان سے امی اور ابو آئے ہوئے تھے۔ میں انھیں لے کر عمرہ کرنے چلا گیا تھا۔ ماشاء اللہ سے یہ میرا ساتواں عمرہ تھا۔ ایک دفعہ پھر سے میری over hauling ہو گئی۔ اللہ کی مجھ پر بڑی مہربانیاں ہیں۔ پورے ڈیلاس شہر میں کوئی بھی پاکستانی اور ہندوستانی ڈاکٹر میرا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔

یہ اسی آقا کا سارا کرم ہے کہ ساری بات بنی ہوئی ہے اور بنی رہے گی۔

میری سرگرمیوں کا تو تمھیں پتا ہے۔ میری آمدنی کا ایک حصہ لوئی فرح خان کو جاتا ہے۔ ڈیلاس کے باہر ہی میرا ایک بڑا رینچ ہے اور اس طرح کے بہت سارے رینچ پورے امریکا میں

ہیں۔ جہاں ہم لوگ آنے والی جنگ کی تیاری کررہے ہیں۔ ہم لوگ سب اچھے خاصے ٹرینڈ ہیں اور ایک وقت آئے گا جب اس ملک میں ہم لوگوں کو اسلام کی لڑائی لڑنا ہوگی۔ یہ میرا یقین کامل ہے اور اسی طریقے سے ساری دنیا میں مسلمانوں کو برتری حاصل ہوسکتی ہے اور ہوگی۔ ہم لوگ بڑی پلاننگ سے کام کررہے ہیں اور جب وقت آئے گا تو یہودیوں کو پتا بھی نہیں لگے گا کہ کیا سے کیا ہوگیا۔

ایسی صورت میں تم خود ہی بتاؤ کہ میں تمھاری تعلیمی مہم کے لیے کہاں سے ڈالر لاؤں۔ میرے ڈالر زیادہ ضروری کام پر خرچ ہورہے ہیں۔

دعاؤں میں یاد رکھنا

شاکر چیمہ

.... ○ ....

ہیوسٹن۔ ۳۰ر اپریل

امجد۔ خوش رہو۔

تمھارا خط ملا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ جواب ہی نہ دوں۔ تمھیں سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، مگر پھر یہ سوچ کر خط لکھ رہا ہوں کہ اس ملک میں یہ میں نے سیکھا ہے کہ جواب ضرور دینا چاہیے اور دوسرا یہ کہ تمھیں پتا تو لگے کہ میں یہاں کیا کررہا ہوں۔

میں نے پہلے کبھی تمھیں بتایا تھا کہ ہیوسٹن کی مسجدوں پر جماعت اسلامی کا قبضہ ہے۔ بظاہر تو یہ مسجدیں اسلامک سوسائٹی چلاتی ہے مگر درپردہ اسلامک سوسائٹی کے عہدیدار درحقیقت جماعت اسلامی کے پکے کارندے ہیں۔ جماعت اسلامی والوں نے اسلام کو نقصان پہنچانے کے علاوہ کوئی بھی کام نہیں کیا ہے۔ پاکستان میں اور پاکستان سے باہر جو پیسے جمع کیے ہیں انھیں اللے تللے سے ان سیاسی مقاصد کے لیے خرچ کیا ہے جن کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

کچھ عرصے قبل ڈاکٹر اسرار احمد یہاں آئے تھے اور ہم لوگوں نے ان کے ساتھ بہت اچھی میٹنگ کی تھی اور دعوت اسلامی کے نام سے ایک جماعت بنائی گئی ہے۔ بڑی تیزی سے ہماری ممبرشپ میں اضافہ ہورہا ہے اور اس دفعہ کے الیکشن میں ہم لوگوں کو پوری امید ہے کہ جماعت اسلامی کا صفایا کردیں گے۔ اس قسم کی مہم میں پیسہ بھی خرچ ہوتا ہے۔ میرے بھائی امجد! میں

اس کام کے لیے نہ صرف یہ کہ پیسہ دیتا ہوں بلکہ جمع بھی کرتا ہوں۔ اس صورت میں یہ میرے لیے ممکن نہیں ہو گا کہ تمھاری اس مہم کے لیے پیسہ بھیجوں، جس کا کوئی خاص فائدہ بھی نہیں ہے۔ تم بچوں کو جو تعلیم دینا چاہو گے اس سے بچے خراب ہی ہوں گے۔ مسلمان ملکوں میں سیکولر تعلیم دراصل یہودیوں اور ہندوؤں کی بہت پرانی سازش ہے۔ جس کے لیے انھیں تمھارے جیسے لوگ بھی مل گئے ہیں۔ خدا کرے گا، تم اور تمھاری مہم کبھی بھی کامیاب نہیں ہو گی۔

فقط ... محمد مجیب

.... ○ ....

نیو جرسی۔ امریکا۔ ۶ر مئی

امجد بھائی !

امید ہے کہ آپ لوگ سب خیریت سے ہوں گے۔ خالہ جان کی طبیعت کیسی ہے؟ امید ہے کہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں گی۔ کاظم کا فون شکاگو سے آیا تھا۔ اس کی شاید کراچی میں کسی سے بات ہوئی تھی تو پتا لگا تھا کہ خالہ جان کا پتے کا آپریشن ہونے والا ہے۔ امید ہے کہ سب کچھ بخیرو خوبی ہو گیا ہو گا۔ امی بالکل ٹھیک ہیں اور انڈیا سے پچھلے مہینے ہی واپس آئی ہیں۔ ابھی تک تو بمبئ، آگرے اور بلند شہر کے ہی قصے چل رہے ہیں۔

اب آپ کے خط کے دوسرے حصے کی طرف آتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ابھی تک خوش فہمیوں کا کیوں شکار ہیں۔ کیوں سمجھتے ہیں کہ پنجابیوں کے اس ملک پاکستان میں ہمارے جیسے اور آپ جیسے لوگوں کی کوئی جگہ ہے۔ کیوں اس قسم کی مہم چلانا چاہتے ہیں جو نہ آپ کی ذمہ داری ہے اور نہ ہی آپ کا کام ہے۔ تعلیم پھیلانا حکومت کا کام ہوتا ہے۔ اسکول بنانا، کالج اور یونیورسٹی بنانا حکومت کی ذمہ داری ہے آپ کی نہیں ہے۔ پورے ملک میں پنجابیوں کی اور سندھ، کراچی میں سندھیوں کی حکومت ہے اور یہ دونوں قومیں کبھی بھی تعلیم عام نہیں ہونے دیں گی۔ آپ نہ جانے کن خوابوں کی دنیا میں رہ رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ آپ اس ملک میں تعلیم پھیلالیں گے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے پاکستان نہ میرا ملک ہے اور نہ ہی میری شناخت ہے۔ پاکستان

میرے بزرگوں کی حماقت کا نتیجہ ہے جنھوں نے غیر ضروری طور پر ہندوستان میں اپنا خون بہا کر اور جذباتی نعروں کے بہکاوے میں آکر اسے حاصل کیا تھا۔ کراچی آکر ہم لوگوں کو کیا ملا ہے۔ پڑھا لکھا ہونے کے باوجود ایسے فارم ملے ہیں جن پر لکھنا پڑا ہے کہ میرے ابا جان کہاں پیدا ہوئے تھے۔ ڈومیسائل اور پی آر سی کی لعنتوں کے پیچھے بھاگنا پڑا ہے۔ میرٹ ہونے کے باوجود میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں میں داخلہ ان کو ملا ہے جن کا ڈومیسائل لاڑکانہ اور دادو کا تھا۔ پی آئی اے، ریلوے اور پولیس میں نوکری پنجابیوں کو ملی ہے۔ ہم لوگوں کو کیا ملا ہے۔؟

مجھے تو آپ کا خط پڑھ کر غصہ آیا ہے۔ ایک آگ سی لگ گئی ہے۔ آپ خود مجھے لندن میں پاکستان کی ایمبیسی کا حال بتا چکے ہیں جہاں پنجابی اہل کاروں نے آپ کو اور خالہ جان کو کس طرح سے ذلیل و پریشان کیا تھا۔ واشنگٹن میں پاکستانی سفارت خانوں میں بیٹھے ہوئے سفارت کاروں سے تو میرا ذاتی تجربہ ہے۔ کتوں کو بھی اس طرح سے ٹریٹ نہیں کیا جاتا ہے جس طرح کا سلوک یہ لوگ پاکستانیوں سے کرتے ہیں۔ اسلام آباد میں بیٹھے ہوئے الو کے پٹھوں کا بھی یہی حال ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان کے سفارت خانے بالکل مختلف ہیں۔ امی کے پاس ابھی تک گرین کارڈ ہے۔ ابھی جب وہ انڈیا جانے لگیں تو میں نے ڈرتے ڈرتے انڈین ایمبیسی کو ویزے کے لیے فون کیا۔ ان لوگوں نے نہ صرف یہ کہ اچھے طریقے سے بات کی بلکہ چار دن میں ویزا لگا کر بھیج بھی دیا۔ پاکستانی ایمبیسی میں کوئی کام کرانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔

اب آپ مجھے خط لکھ رہے ہیں کہ میں اس ملک میں تعلیمی مہم کے لیے پیسے بھیجوں۔ ایک ایسے ملک کے لیے جو ختم ہو رہا ہے۔ جہاں آپس کی مار کٹائی میں روز کتنے ہی لوگ مر جاتے ہیں۔ آپ کے پنجابیوں نے پہلے بنگالیوں کو لوٹا اور جس طرح سے پاکستان بنانے والے بہاریوں کو بے یار و مددگار چھوڑا ہے اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ گزشتہ بیس سالوں سے جو سلوک کراچی کے مہاجروں کے ساتھ کیا جارہا ہے اس کے بعد کسی مہاجر کے خیالات آپ جیسے ہیں تو اس کو اپنا علاج کرانا چاہیے۔

ہم لوگوں کے خاندان میں سوائے آپ کے کوئی بھی پاکستان میں نہیں رہا ہے اور ہم لوگ جو اب امریکا آگئے ہیں جہاں بھی ہیں، خوش ہیں۔ کام کرتے ہیں اور اس کا انعام پاتے ہیں۔ نہ کوئی رنگ دیکھتا ہے نہ مذہب پوچھتا ہے اور نہ ہی ڈومیسائل دکھانا پڑتا ہے۔ خاندان کے جتنے بچے ہیں سب اسکولوں میں اچھے جا رہے ہیں۔ آپ کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اس سے

پہلے کہ آپ کے بارے میں کوئی بری خبر ہم لوگوں کو ملے آپ بھی یہاں آجائیں۔ آپ جیسے قابل آدمی کے لیے یہاں بہت کام ہے۔ بڑی عزت ہے۔ یہاں کے یہودی اور عیسائی آپ کے اسلام آباد اور سندھ سکریٹریٹ کے افسروں سے بہت اچھے ہیں۔ میں آپ کی مہم کے لیے ایک ڈالر بھی بھیجنے کو تیار نہیں ہوں۔ اگر زکواۃ خیرات دینا ہوگا تو وہ میں بلند شہر پھوپھی جان کو بھیجوں گا کہ وہاں غریب رشتہ داروں میں تقسیم کردیں۔ اگر کسی مہم کے لیے بھیجوں گا تو وہ بھی ہندوستان میں بہت ہیں۔ پاکستان میں کسی بھی کام کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔

امید ہے کہ آپ برا نہیں مانیں گے اور میری بات سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

خالہ جان کو میرا سلام کہیں۔ انھیں اپنے وعدے کے مطابق ہمارے پاس امریکا آنا ہے۔ جیسے ہی وہ حکم کریں گی میں ٹکٹ بھیج دوں گا۔ امی آپ کو دعا کہہ رہی ہیں۔

بھابی کو سلام اور بچوں کو بہت بہت پیار۔

ایک دفعہ پھر معافی کا طلب گار ہوں۔

آپ کا ... محمد رفیق

.... ○ ....

گرین کینڈل۔ نیو جرسی۔ ۵ر مئی

ڈیئر امجد !

خوش رہو...

تمھارا خط ہمیشہ دنیا بھر کی خبر لے کر آتا ہے۔ ایک طرح سے ہر ایک کے بارے میں خبر مل جاتی ہے کہ کون کیا کر رہا ہے۔ نصیر صاحب کی موت کی خبر افسوس ناک ہے اور اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ بے چارے گلشن کی چورنگی پر منی بس سے ٹکر کھا کر پڑے رہے نہ منی بس رکی اور نہ ہی کسی کو توفیق ہوئی کہ کوئی ان کی مدد کرتا۔ ایدھی ایمبولینس کے غیر تربیت یافتہ ایمبولینس ڈرائیوروں نے جیسے ہی اٹھانا چاہا تو وہ مرگئے۔ میں تو ڈاکٹر نہیں ہوں لیکن اتنا مجھے پتا ہے کہ جن لوگوں کو سر پر یا پیچھے کی ہڈی پر چوٹ لگتی ہے انھیں خاص طریقے سے اٹھانا چاہیے ورنہ ان کی حرام مغز کٹ سکتی ہے جس سے آدمی مر بھی سکتا ہے اور مستقل اپاہج بھی ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ تم نے خط میں لکھا ہے ان کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ ان کے بچے تو اب بڑے ہوگئے ہوں گے۔ خدا انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

امجد تعلیم پھیلانے کی تمہاری مہم بہت اچھی ہے لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا ہے کہ تم لوگ کس طرح سے تعلیم پھیلاؤ گے۔ ہم لوگ تو کراچی بہت بعد میں آئے تھے۔ جب میرے ابو کا ٹرانسفر کراچی ہو گیا تھا۔ مجھے پنجاب کا پتا ہے کہ میلوں میل سفر کرتے رہو کوئی اسکول نہیں ملتا۔ گاؤں' دیہات میں پڑھا لکھا آدمی مسجد کا مولوی ہوتا ہے جو کہ خود ہی پکا جاہل ہوتا ہے اور جسے زمانے کا کچھ بھی پتا نہیں ہے۔ ان حالات میں تم کس طرح سے تعلیم پھیلانے کی مہم شروع کرو گے اور کامیاب ہو گے میری سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ مجھے نہیں لگتا ہے کہ موجودہ پاکستان کے نوابزادہ نصراللہ خان' کھر' بے نظیر' مزاری' وٹو' شریف' کھوکھر' ٹوانے' دولتانے' بھٹو' جتوئی' میرزادے اور نہ جانے کون کون' کی موجودگی میں پاکستان میں تعلیم کبھی بھی پھیل سکے گی۔ ساتھ میں جو تم لوگوں کی آرمی ہے وہ خود اتنی بڑی پیراسائٹ ہے کہ وہ خود ملک کو ایک دن ختم کر دے گی۔ میں خود پنجابی ہوں اور میرا ایک بھائی اب تو فوج میں بریگیڈیئر ہو گیا ہے اور مجھے تھوڑا بہت اندازہ ہے کہ اتنی بڑی آرمی کو زندہ رکھنے کے لیے بہت سے لوگوں کا پیٹ کاٹنا پڑے گا اور ان کے بھی مفاد میں یہی ہے کہ عوام جاہل رہیں تاکہ یہ سوال کوئی نہ اٹھائے۔

اگر حکومت سنجیدگی سے تعلیم پھیلانا چاہے تو یہ کوئی بہت بڑی بات نہیں ہے مگر اس کے لیے رقم کہاں سے آئے گی۔ مثال کے طور پہ F-16 کے جہاز اور ان کے نگہداشت کا خرچ پاکستان کے تمام تعلیمی بجٹ سے زیادہ ہے اور تم کو تو اندازہ ہوگا ہی کہ ہماری ساری حکومتیں تعلیم کے مقابلے میں F-16 کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔

ایسی خراب صورتِ حال میں تم اور تمہاری مہم کیا حاصل کر لے گی' مجھے کچھ اندازہ نہیں ہے لیکن پھر بھی میں چاہوں گا کہ تمہاری مدد کروں۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں اس کے بننے میں میرے والدین کے بعد کراچی یونیورسٹی کا بڑا ہاتھ ہے جہاں کی بنیادی ٹوٹی پھوٹی تعلیم کے بعد میں اس قابل ہو سکا کہ امریکا آکر یہاں کے امتحان پاس کر سکوں اور عزت سے اپنی ضرورت سے زیادہ کما سکوں۔ میں تو دن رات خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کیوں کہ اگر میرے والد کھر کے مزارعے یا نوابزادہ نصراللہ یا لغاری کی زمینوں پر کام کرنے والے بے گاری ہوتے تو آج نہ جانے میں کس حال میں ہوتا۔ تم کو میری طرف سے مستقل چندہ ملتا رہے گا۔

بھابی کو سلام دینا اور بچوں کو پیار۔ میرے لائق کوئی کام ہو تو حکم کرنا۔

تمہارا ... محمد افضل

کنساس مسوری۔ ۸ر مئی

ڈیئر امجد !

اگر تم ایک ایسی مہم شروع کرو جس کے ذریعے سے کراچی کے تمام میڈیکل کالج بشمول بقائی، ضیاء الدین، ہمدرد، کراچی میڈیکل ڈینٹل کالج، ڈی ایم سی اور ایس ایم سی کو بند کردیا جائے تو میں تمھاری مہم کے لیے جتنا بھی ہوسکے گا، دوں گا۔ دوسری بات یہ کہ ان اداروں کے بند ہونے سے جو پیسے بچیں گے وہ تمھاری عام تعلیم کی مہم پر خرچ کیے جاسکیں گے۔ تم بھی سوچ رہے ہوگے کہ میں کیا بکواس کررہا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بکواس نہیں ہے، یہ حقیقت ہے اور میں یہی چاہتا ہوں۔ میں تمھیں بتاتا ہوں کہ میں ایسا کیوں سوچ رہا ہوں کہ یہی سب کچھ میرے اوپر بیت چکی ہے۔

تین ماہ قبل مجھے یکایک کراچی آنا پڑ گیا تھا۔ میں تم سے بھی رابطہ نہیں کرسکا تھا کیوں کہ اٹھارہ دن اس طرح سے گزرے تھے جیسے کوئی ڈراؤنا خواب تھا۔ تقریباً" تین لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے اور آخر میں میرے ۶۲ سالہ والد کی لاش مجھے ملی تھی۔ انھیں کوئی سینے کا انفیکشن ہوا تھا جس کے لیے میرا چھوٹا بھائی انھیں آغا خان ہسپتال لے گیا تھا۔ وہاں داخلے کے چوتھے دن یکایک ان کا Respiratory Failure ہوگیا تھا جس کے لیے انھیں Ventilator کی ضرورت تھی۔ میں اسی دن ہی کراچی پہنچا تھا۔ پہلے تو مجھے کوئی بتاتا ہی نہیں تھا لیکن جب میں نے بتایا کہ میں ڈاکٹر ہوں اور یہ میرے والد ہیں تو مجھے بتایا گیا کہ ابو کو کسی ایسی جگہ شفٹ کرنا پڑے گا جہاں Ventilator ہو۔ کیوں کہ آغا خان ہسپتال کے Ventilator خالی نہیں ہیں۔ یہ مجھے بعد میں پتا لگا تھا کہ ایک Ventilator خالی تھا مگر کسی کے لیے رکھا گیا تھا۔ وہاں سے ہم لوگ ابو کو تاج میڈیکل کمپلیکس لے کر آئے۔ یہاں مجھے جلد ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ یہاں کا اسٹاف تربیت یافتہ نہیں ہے اور جس طرح کی بات وہ لوگ کرتے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کا level of care کیا ہے۔ دو دن کے بعد ہم لوگوں نے ابو کو ضیاء الدین ہسپتال کے ICU میں شفٹ کیا تھا۔ وہ شفٹ کرنا بھی ایک عجیب و غریب تجربہ تھا۔ ایدھی کی "ایمبولینس" جس میں کوئی بھی مناسب انتظام نہیں تھا۔ میں خود ہی انھیں اوکسیجن کی بیگ لگا کر لے گیا تھا۔ بڑے سے ضیاء الدین ہسپتال میں ICU میں تو شاید سب کچھ تھا لیکن مریض کو دیکھنے والے

ڈاکٹروں کے ساتھ کوئی مسئلہ تھا۔ مجھے ان کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کیوں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی جواب ان لوگوں کے پاس نہیں ہوتا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میرے ابو کی طبیعت صحیح نہیں ہے۔ میں اپنے لحاظ سے کوئی مشورہ اوّل تو دیتا نہیں تھا لیکن اگر کسی غلطی کی نشاندہی کرتا تھا یا کسی ایسی رپورٹ کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا تھا جس پر ان کی نظر نہیں پڑی تھی تو وہ ناراض ہوجاتے تھے۔ جو سب سے بڑی کمی تھی وہ Accountability کی تھی۔ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔

ICU میں ڈیوٹی والے ڈاکٹروں سے لے کر consultant تک کا رویہ بڑا ہی casual تھا۔ میں نے کوئی رعایت نہیں مانگی تھی، کچھ کم نہیں کرایا تھا، جتنے پیسے لگ رہے تھے اتنے پیسے میں دے بھی رہا تھا مگر نرسوں سے لے کر ڈاکٹروں تک کسی کے کام سے میں مطمئن نہیں تھا اور میرے دیکھتے دیکھتے ۶۲ سال کے میرے والد خواہ مخواہ ہی مرگئے۔ وہ فٹ تھے ۶۲ سال مرنے کی عمر نہیں ہوتی۔ یہ قصور میرا ہی ہے کاش ! میں انھیں اپنے پاس امریکا میں رکھتا۔

ایک ایسا ملک جہاں کسی بھی چیز کی کوئی accountability نہیں ہے۔ وہاں ڈاکٹروں میں accountability کیوں ہو؟ یہ بات مجھے کراچی میں ہی کسی ڈاکٹر نے کہی تھی جو میرے لیے بہت افسوس کی بات ہے۔ کیوں کہ میرا خیال یہ ہے کہ سڑے سے سڑے سسٹم میں اور خراب سے خراب حالات میں بھی ڈاکٹر اور ٹیچر کو system کے دوسرے لوگوں سے اچھا ہونا چاہیے۔
ن پریشان کن حالات میں رہنے کے بعد میں تم کو فون بھی نہیں کرسکا تھا اور کراچی سے شدید مے میں واپس آیا تھا۔ یہاں آنے کے بعد کنساس سٹی اور کنساس مزوری میں کام کرنے والے ستانی ڈاکٹروں سے بہت باتیں ہوئیں جو بھی ان ڈاکٹروں نے کراچی کے میڈیکل کالجوں اور بتالوں میں ٹریننگ کے بارے میں بتایا ہے وہ تو بالکل ہی ناقابلِ قبول ہے۔ جنھوں نے ڈاؤ ڈیکل کالج اور سندھ میڈیکل کالج سے پڑھا ہے ان دونوں جگہ پر پی ایم ڈی سی کے مطابق سب اسٹاف ہے وہاں نہ کوئی تعلیم ہے نہ کوئی ٹریننگ اور باقی جو پرائیویٹ میڈیکل کالج ہیں، ، تو مکمل طور پر پی ایم ڈی سی کے ٹوٹے پھوٹے اصولوں کے مطابق بھی اسٹاف موجود نہیں
ـ

امجد ایسے اداروں کا کیا فائدہ ہے۔ ایسے ڈاکٹروں سے تو عطائی اچھے ہیں کیوں کہ اب جو یہاں سے نکل رہے ہیں وہ وہاں ہی علاج کریں گے۔ امریکا اور انگلینڈ نہیں آسکیں گے۔

لوگوں کے پیسے خرچ ہوں گے اور میرے ابو جیسے لوگ بے وجہ مرجائیں گے۔

اب تم یہ بل شٹ والی بات نہ کرنا کہ میری طرح سے بہت سے لوگوں نے پاکستان چھوڑ دیا ہے تو پاکستان میں گاربیج ہی رہ جائے گا۔ تمھاری بات کم از کم میرے معاملے میں درست نہیں ہوگی کہ تم کو پتا ہے کہ کراچی میں ایک سال تک کوشش کرنے کے باوجود مجھے کسی بھی جگہ مناسب نوکری نہیں ملی تھی اور میں مجبور ہو کر واپس آیا تھا۔

میں اس طویل خط کی معافی چاہتا ہوں مگر اپنی بات سمجھانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ تمھیں اپنی نفرت اور اپنے غصے کی وجہ بھی سمجھاؤں۔

خدا تم کو کراچی کے ہسپتالوں سے بچائے۔

تمھارا ... اسلام الدین

.... ○ ....

وی چی ٹا۔ ۵ر مئی

امجد بھائی !

جب آپ کا خط ملا اس وقت میں اپنا سامان لپیٹ کر پرانی نوکری چھوڑ کر کلیولینڈ سے وی چی ٹا شفٹ ہو رہا تھا۔ اس نئی جگہ پر زیادہ بہتر نوکری ملی ہے۔ یہاں امریکا کے زیادہ تر ہوائی جہاز بنانے کی فیکٹریاں ہیں۔ بوئنگ سے لے کر چھوٹے جہاز تک یہاں بنتے ہیں اور دنیا بھر سے بڑے بڑے لوگ یہاں ہوائی جہاز خریدنے آتے ہیں۔ یہ نوکری بہت ہی اچھی ہے۔ پچھلی نوکری کے مقابلے میں، سمجھ لیں کہ ہر چیز ڈبل ہے۔ یہاں پر کافی پاکستانی انجینیرز کام کرتے ہیں۔ ویسے بھی پورے امریکا میں شاید پاکستان کے سب سے زیادہ انجینیر کام کرتے ہیں۔ ایسی ایسی جگھوں پر ایسا ایسا کام کر رہے ہیں کہ آپ کو تعجب ہوگا۔ افسوس یہ ہے کہ ان لوگوں کے لیے پاکستان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

آپ کی تعلیمی مہم کے سلسلے میں عرض یہ ہے کہ میں مکمل طور پر آپ کی مدد کروں گا۔ نہ صرف یہ کہ اپنے پاس سے آپ کو چندہ بھیجوں گا بلکہ کوشش کروں گا کہ دوسروں سے بھی جمع کر کے آپ کو بھیج سکوں، مگر اس سلسلے میں مجھے بڑا خراب تجربہ ہوا ہے۔ کچھ سال پہلے میں پاکستان آیا تھا تو مجھے پتا لگا تھا کہ این ای ڈی انجینیرنگ کالج کے کچھ اسٹاف ممبر اس بات پر پریشان

تھے کہ جام صادق جیسے کچھ لوگ یونیورسٹی کے شفٹ ہونے کے بعد کالج کی پرانی بلڈنگ پر کوئی پلازہ بنانا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں نے مل کر کوشش کی ہے کہ اب اس جگہ پر سائنس ٹیکنالوجی کا میوزیم بنائیں۔ میں ان لوگوں سے ملا تھا اور این ای ڈی کا گریجویٹ ہونے کے ناتے یہ وعدہ کیا تھا کہ میں امریکا میں این ای ڈی کے پاس شدہ لڑکوں سے کچھ مدد جمع کرنے کی کوشش کروں گا۔ کیمپس کی پرانی بلڈنگ کو اس کام کے لیے مختص کیا گیا ہے مگر افسوس کی بات ہے کہ اس سلسلے میں کچھ خاص کام نہیں ہوسکا ہے۔ وہاں تو نہ جانے کیا ہو رہا ہے۔ یہاں امریکا میں مجھے مکمل طور پر مایوسی کا سامنا ہوا ہے۔ سوائے چند ایک قریبی دوستوں کے زیادہ تر NEDians نے مدد کرنے سے نہ صرف یہ کہ منع کیا بلکہ عجیب عجیب قسم کے بہانے کیے ہیں اور ایسے ایسے سوال کیے ہیں کہ سن کر.... افسوس ہوتا ہے اور شرم آتی ہے۔

امجد بھائی واشنگٹن سے لے کر نیویارک تک' اور ڈلاس سے لے کر لاس اینجلز تک جس شہر میں چلے جائیں' زندگی کے ہر شعبوں کے میوزیم موجود ہیں۔ جہاں لوگ جاتے ہیں' دیکھتے ہیں' سمجھتے ہیں' اسکول کے بچوں سے لے کر بڑوں تک اور اس طرح سے ان کے علم میں اور آگہی میں اضافہ ہوتا ہے۔ میں نے جب واشنگٹن میں سائنس ٹیکنالوجی کا میوزیم دیکھا تھا تو سوچا تھا کہ کاش کراچی میں ایسی کوئی جگہ ہوتی جہاں عام آدمی جاکر سائنس کے کمالات کی تاریخ دیکھتا۔ پھر جب مجھے این ای ڈی کے اس پروگرام کا پتا چلا تھا تو میں نے سوچا تھا کہ کم از کم پاکستانی انجینئر اس پروجیکٹ کے لیے کچھ کریں گے' مگر میں اس میں ناکام ہو کر دل ہار بیٹھا ہوں۔ شاید یہ میوزیم تو کبھی بھی نہیں بنے گا مگر میں آپ کی مہم کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔

ہاں ایک بات اور انٹرنیٹ کے اوپر NED انجینئرنگ یونیورسٹی کا پیج بھی ہے اس کے اوپر بھی میں نے اپیل کی تھی' مگر کسی نے بھی مناسب جواب نہیں دیا ہے۔ حکومت کا لاکھوں روپیہ ہم جیسے لوگوں کو انجینئر بنانے پر خرچ ہو رہا ہے اور اپنے ہی ادارے کے لیے تھوڑے سے چندے کی اپیل پر بھی پرانے طالب علم کوئی توجہ نہیں دیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر ادارے کی بدقسمتی کیا ہوگی۔ نہ جانے یہ ادارے کا قصور ہے یا ہماری قوم ہی ایسی ہے۔ دعاؤں میں یاد رکھیں۔

آپ کا ... سلیم

لندن۔ یکم مئی (انگلش سے اردو میں ترجمہ کیا گیا)

ڈیئر امجد

امید ہے کہ تم ٹھیک ہو گے۔

تمہاری باتیں شاید درست ہوں لیکن میرا اس ملک سے اب کوئی واسطہ نہیں ہے۔ تعلیم کے بعد اس ملک میں مجھے صرف دھکے ہی ملے تھے۔ جب کبھی بھی اپنے والدین سے ملنے گیا' کراچی ایئرپورٹ پر مجھے پریشان کیا گیا۔ غیر ضروری ڈیوٹیاں لگائی گئیں' رشوت لی گئی۔ ڈاکوؤں نے میرے ابو کے گھر گھس کر ماں باپ دونوں کو گولی ماردی اور لوٹ کر چلے گئے۔ میں ایمرجنسی میں کراچی پہنچا تو نہ جانے کتنی مشکلوں سے لاش ملی۔ سول ہسپتال میں میڈیکو لیگل افسر کو پیسے کھلانے پڑے۔ پولیس والوں کی خوشامدیں کرنا پڑیں۔ میری ہر مجبوری کا ہر ایک نے فائدہ اٹھایا اور یہ سارے کے سارے لوگ کراچی کے پڑھے لکھے تھے۔ اس شہر اور اس ملک میں کسی بھی قسم کی مہم کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے اور اگر ہے تو بھی نہیں دوں گا۔

اپنا خیال رکھنا تمہیں بھی کوئی گولی نہ ماردے۔

فقط ... منظر

.... ○ ....

نیویارک۔ یکم مئی

امجد ڈیئر

سب ٹھیک ہے اور میں اپنے خاندان کے ساتھ مزے میں ہوں۔ تمہاری مہم کے سلسلے میں مجھے مندرجہ ذیل معلومات درکار ہیں۔

تم لوگوں نے کتنے پیسے جمع کر لیے ہیں؟

تم لوگوں کو کتنے اور پیسوں کی ضرورت ہے؟

حکومت تمہاری کتنی مدد کر رہی ہے؟

تمہارا اکاؤنٹ آڈٹ ہوتا ہے کہ نہیں؟

اپنی ایک آڈٹ رپورٹ بھیج دو؟

میں 25 ڈالر کا پے آرڈر بھیج رہا ہوں۔ مہربانی کر کے اس کی رسید مجھے فوراً" بھیج دینا۔

اپنے گھر میں سب کو سلام بولنا۔

فقط ... سلیم الدین مرزا

.... ○ ....

شکاگو۔ ۲ر مئی

امجد، آداب!

آپ کا خط ملا تھا جس میں آپ نے کراچی اور سندھ میں تعلیمی مہم کے سلسلے میں آپ لوگوں کی مہم کا ذکر کیا تھا۔ میری آج ہی ابو سے کراچی بات ہوئی تھی۔ وہ آپ کو contact کریں گے اور میری طرف سے چندہ بھی دیں گے۔ اس کے علاوہ بھی وہ آپ کے کافی کام آسکتے ہیں۔ میں نے آپ لوگوں کا نمبر اور ایڈریس انھیں دے دیا ہے۔

پاکستان میں تو عام تعلیم کی بہت ضرورت ہے اور اس سلسلے میں ہم سب لوگوں کو کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔ میں نے آپ کے خط اور پروگرام کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں بنالی ہیں اور کچھ جاننے والوں کو بھیج رہی ہوں۔ امید ہے کہ ان سب کی جانب سے کچھ مدد مل جائے گی۔

یہاں پر کام تو ٹھیک ہے مگر کبھی کبھی کراچی بہت یاد آتا ہے۔ سب کی خیریت اور سلام۔

فقط ... شکیلہ

.... ○ ....

ورجینیا۔ ۵ر مئی

(انگلش سے اردو ترجمہ لیا گیا)

ڈیئر امجد

پاکستان ایک ناکام ملک ہے جو دنیا میں فیل ہوگیا ہے۔ تاریخ کے کسی واقعہ سے، فلسفے کے کسی اصول سے اور دیانت کے کسی معیار سے پاکستان اور پاکستانیوں کو ایک ملک اور قوم کہنا مناسب نہیں ہوگا۔ جب سے مجھے یاد ہے ایوب خان کے خاندان سے لے کر ضیاء الحق تک اور بھٹو خاندان سے لے کر شریف خاندان تک فوجیوں، نوکر شاہی کے لوگوں اور ان خاندانوں کے دوستوں نے جس طرح سے ملک کو بھنبھوڑ بھنبھوڑ کر نوچا ہے اس کا اندازہ تم لوگ پاکستان میں بیٹھ کر، کر ہی نہیں سکتے ہو۔ امریکا اور یورپ کے ہر بڑے شہر میں ان لوگوں کی جائیدادیں ہیں۔ ان کے بچے جس طرح سے لندن اور ویگاس میں خرچ کرتے ہیں اسے دیکھ کر عرب بھی شرمندہ

ہوجائیں گے۔ ایسے ملک کا کیا مستقبل ہو سکتا ہے جہاں عورتوں اور بچوں کو بنیادی انسانی حقوق تک میسر نہیں ہیں۔ جہاں غربت کی انتہا کے ساتھ امیر لوگوں کی عیاشیوں کی بھی انتہا نہیں ہے۔ جس کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔

اب پاکستان میں انقلاب بھی نہیں آئے گا کیوں کہ انقلاب لانے والی طاقتیں خود اتنی زیادہ کرپشن کا شکار ہیں کہ اب انقلاب کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا ہے۔

بین الاقوامی طور پر امریکا' روس' چین کے تعلقات میں کچھ اس قسم کا توازن ہوگیا ہے کہ وہ پاکستان جیسے ملک میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہیں گے اور پاکستان اسی طرح سے رگڑ رگڑ کر اور آپس کے جھگڑوں میں پھنس کر ختم ہوجائے گا۔

میرے مارکسی اور لیننسٹ نظریات کے مطابق ایسا ملک جو ختم ہو رہا ہے اس ملک کے ختم ہونے کے عمل میں تمہارے جیسے لوگوں کا اس قسم کا کام درحقیقت ایک طرح سے ان کی زندگی کو تھوڑا اور طویل کردیتا ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک قدرتی انجام کو روکنے کی کوشش ہے۔ غریبوں اور پرولتاریہ کی مشکلات میں اضافہ کرنے کی اور اسے طول دینے کی ایک بے رحم خواہش ہے۔ اس سارے عمل میں تمہاری مدد کرکے میں بے وقوفی نہیں کرسکتا۔ مجھے معاف ہی رکھنا۔

تمہارا ... نجم فاروقی

.... ○ ....

لاس اینجلز۔ ۵ر مئی (انگریزی سے ترجمہ کیا گیا)

ڈیئر امجد!

تم نے تو مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ خط لکھو اور مجھے بھی اس تعلیمی مہم کی تفصیلات سے آگاہ کرو۔ جب شکیلہ نے مجھے وہ خط بھیجا تو بکھرے اور بچھڑے ہوئے دن فلم کی ریل کی طرح میری آنکھوں کے سامنے سے گزرتے چلے گئے۔

وہ دن اچھے تھے جب ہم سب کالج میں پڑھتے تھے اور اس انقلاب کے خواب دیکھتے تھے جو یونیورسٹی اور کالجوں سے نکل کر پورے ملک میں چھا جانے والا تھا۔ جب سب لوگوں کو ان کے حقوق ملنے والے تھے۔ جب ہر بچے کے لیے تعلیم اور ہر آدمی کے لیے کام کا انتظام ہونے والا تھا۔ کتنا رومانس تھا اس وقت۔

مجھے ابھی بھی یاد ہے کہ ہم لوگ سرخ جھنڈے کو ہاتھ میں اٹھا کر اور امریکن جھنڈوں کو آگ لگا کر، امریکا کا جو یار ہے غدار ہے غدار ہے کے نعرے لگا کر یہ سمجھتے تھے کہ انقلاب آنے ہی والا ہے۔ مجھے وہ بھی دن یاد ہے جب کراچی یونیورسٹی میں پروگریسیو فرنٹ کے جلسے میں ضیاء الحق کے خلاف نعروں کے ساتھ "کون بچائے گا پاکستان، طلبا مزدور اور کسان" کے نعرے بھی لگتے تھے اور "ایک ہی جنگ جاری ہے لوگو، سائگان سے منگھوپیر تلک" جیسی نظموں پر شاعر جلسے لوٹ لیتے تھے اور ایسے ہی جلسوں میں شرکت کر کے تمھاری دی ہوئی کتابیں پڑھ پڑھ کر میں تمھارے قریب آگئی تھی۔ میرا یقین انقلاب پر تھا۔ تمھاری ذات پر تھا اور زندگی فیض اور ساحر کی شاعری کی طرح تھی۔ بے چین اور امیدوں سے بھری ہوئی۔

جو لڑکیاں رضیہ بٹ اور اے آر خاتون کے ناول پڑھتی تھیں میں انھیں بے وقوف سمجھتی تھی۔ کھوئی کھوئی کسی شہزادے کے انتظار میں، جو کسی گھوڑے پر آنے والا ہے۔

لیکن حقیقت کچھ اور ہی نکلی۔ تم جو مرے شہزادے تھے میرے ساتھ چلنے کو تیار تھے۔ جس نے کہا تھا کہ انقلاب کے بعد نظام بدل جائے گا۔ امیر و غریب کا فرق رشتوں کے درمیان نہیں آئے گا۔ مذہب اور ذات جو پرانے سماج کی باقیات ہیں، ختم ہو جائیں گی۔ تم نے تو اس کی کوشش تک نہیں کی تھی۔ میں شیعہ تھی تو کیا فرق پڑتا تھا۔ تم سنی خاندان سے وابستہ تھے تو کیا بڑی بات تھی۔ مگر ہم دونوں ساتھ نہیں نباہ سکے۔ مجھے اس بات کا غم نہیں ہے کہ ہماری شادی نہیں ہوئی۔ مجھے اس بات کی تکلیف نہیں ہے کہ ہماری زندگی ساتھ ساتھ نہیں گزری۔ مجھے اس بات کا بھی دکھ نہیں ہے کہ تم میرے نہیں ہوسکے۔ مجھے تو دکھ اس بات کا ہے کہ تم نے جنگ لڑی بھی نہیں اور ہار بھی گئے۔ تمھارے وہ نعرے بھی جھوٹے تھے اور ہر وہ عمل بھی جو نظام کو بدلنے کی بات کرتا تھا۔ ضیاء الحق کو ہمارے نعرے نہیں تباہ کرسکے۔ امریکی جھنڈا بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔ طلبا مزدور اور کسان کیا پاکستان بچاتے، انھیں تو اپنے وجود کا ہی پتا نہیں ہے۔ تم نے تھوڑی سی بھی کوشش نہیں کی کہ اپنے خاندان سے مزاحمت کرو اور میرے خاندان کے شیعہ رسم و رواج کو توڑنے میں میری مدد کرو۔ وہ نعرے جھوٹے نعرے تھے۔ وہ جنگ بھی جھوٹی جنگ تھی، شاید سائگان میں جو لڑائی تھی وہ سچی تھی مگر منگھوپیر کے مزدور لیڈروں نے مزدوروں کو بیچا تھا۔ جیسے اس ملک کے ہر سیاست دان نے ملک کے ذرے ذرے کو بیچا ہے۔

شاید مجھے اپنے والدین کا ہی شکر ادا کرنا چاہیے جنھوں نے علی رضا سے میری شادی کرادی

اور قسمت مجھے لاس اینجلس لے آئی بالکل انھی لڑکیوں کی طرح جو شہزادوں کے خواب دیکھ رہی تھیں۔

یہاں کی دنیا اور ہے اور اس دوسری دنیا میں کراچی کا ہر انقلابی گھوم رہا ہے۔ ہر وہ شخص جس نے امریکی جھنڈے کو آگ لگائی تھی اور مذہب کے بارے میں شکوک کا اظہار کیا تھا وہ امریکی پاسپورٹ کو سینے سے لگا رہا ہے اور امریکا کے ہر محلّے میں مسجد بنانے کا ارمان لے کر گھوم رہا ہے۔ شیعہ ہو یا سنّی، وہابی ہو کہ دیو بندی، مہاجر ہو کہ پنجابی اور سندھی ہو کہ پٹھان، امریکی پاسپورٹ پر ہر ایک کا ایمان شک سے بالاتر ہے۔

میں سوچتی ہوں کہ ایسا کیوں ہے۔ کیوں ہم لوگ اتنے کھوکھلے ہیں اندر سے، بالکل خالی، شاید تم ہی صحیح کہتے ہو کہ جب تک تعلیم نہیں پھیلے گی کچھ بھی نہیں ہوسکے گا مگر تم نے پہلے جو کہا تھا وہ کب صحیح نکلا تھا جو اب کہہ رہے ہو وہ بھی صحیح نہیں ہوگا۔ ہم لوگ سب یونیورسٹی کے ہی تو پڑھے ہوئے تعلیم یافتہ ہیں اور پاکستان سے امریکا تک کیا کر رہے ہیں۔ میں جب بھی سوچتی ہوں تو شرمسار ہو جاتی ہوں۔ تم بھی سوچتے ہوگے کہ جس کو خط بھی نہیں لکھا ہے وہ خط کا جواب دے رہی ہے اور جواب بھی ایسا کہ جس میں صرف تنقید ہے۔ بات یہ ہے کہ بہت کچھ ہونے کے باوجود میں تمھیں بھولی نہیں ہوں۔ تم ابھی بھی ایک خوب صورت خیال کی طرح بہار کے پہلے پھول کی چٹکی ہوئی ایک خوش نما کلی کی صورت اندر بہت اندر دل کے نہاں گوشوں میں پنہاں ہو۔ تم نے جو بھی کیا شاید ٹھیک کیا ہو مگر میں تم کو اور تمھاری یاد کو بھولی نہیں ہوں۔ تمھارا وہ جذبہ جسے لیے ہوئے تم مجھے ملے تھے جھوٹا نہیں تھا۔ تمھاری مجبوریاں اپنی ہوں گی۔ آخر میں تو ہم سب مجبور ہی ہیں، شاید یہ نیا جذبہ بھی جھوٹا نہیں ہے، جو لے کر تم دوبارہ سے اٹھ کھڑے ہوئے ہو۔ میں اس خیال اور اس جذبے سے لاتعلق تو نہیں رہ سکتی ہوں۔ تم ابھی بھی یاد آتے ہو۔ کبھی کبھی بے چین بے کل کر جاتے ہو۔ چاندنی راتوں میں یہاں کے ساحلوں پر گھومتے ہوئے کبھی کلفٹن کا خیال آتا ہے۔ جب اچھے کراچی کے دنوں میں رات رات بھر ہم گھوما کرتے تھے بغیر کسی ڈر اور خوف کے، اور ساتھ ہی تم بھی یاد آجاتے ہو۔ اس بے چینی اس بے قراری کو علی رضا نہیں سمجھتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جب تم بھی بے کل ہو جاتے ہوگے تو اسما بھی نہیں سمجھتی ہوگی۔ تم خط نہ بھی لکھو، میرا ذکر نہ بھی کرو، مجھے پتا ہے کہ تم نے مجھے اپنے ساتھ رکھا ہوا ہوگا، جیسے کہ تم میرے ساتھ ہوتے ہو۔ میں یہاں خوش ہوں۔ علی رضا اور بچوں

کے ساتھ، تم بھی خوش رہو۔ ایک حقیر سا ڈرافٹ بھیج رہی ہوں۔ شاید تمہارا یہ خواب پورا ہو۔

بچھڑے دنوں کی دوست
یاسمین رضا

انگارہ آنکھیں سلگتے ہونٹ

وہ مجھے گرینڈ لیز بینک میں ملا تھا۔ درمیانہ قد' سامنے سے گھونگریالے بال' جو بڑے سلیقے سے سر پر سجائے گئے تھے۔ گندمی رنگ' سلگتا ہوا چہرہ' بڑی بڑی انگارہ سی آنکھیں اور چہرے پر سب سے نمایاں چیز اس کے ہونٹ تھے' نہ افریقیوں کی طرح موٹے موٹے' نہ جاپانیوں کی طرح پتلے پتلے۔ بھرے بھرے ہوئے ہونٹ' سلگتے ہوئے چہرے پر سلگتے ہوئے ہونٹ۔ میں اسے دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گئی تھی۔ خواہ مخواہ ہی دوسری بار دیکھنے کو دل چاہا تھا۔ دل بے اختیار ہو کر دھڑکا' بے چین ہو کر چونکا۔ میں گھبرا کر جلدی جلدی فارم بھرنے لگی تھی۔

کراچی میں بینک میں اکاؤنٹ کھولنا بھی ایک مسئلہ تھا۔ پہلے تو میں ناظم آباد چورنگی پر جو حبیب بینک ہے وہاں گئی' مگر ایک ہفتہ چکر کاٹنے کے بعد بھی اکاؤنٹ کھولنے کا فارم نہیں ملا تھا۔ عبداللہ ہارون روڈ پر موجود یونائیٹڈ بینک میں بھی یہی ہوا تھا۔ میں نے از راہِ تذکرہ فون پہ بہناز کو یہ بات بتائی تھی اس نے کہا تھا کہ کیوں نہ گرینڈ لیز بینک میں اکاؤنٹ کھول لو۔ گارڈن روڈ پر کانڈا والا بلڈنگ میں یہ کراچی کا پرانا بینک پارسیوں کا پسندیدہ بینک تھا۔ پھر اس نے ہی مجھے تعارفی چھے پر دستخط کر کے اکاؤنٹ کھولنے کا فارم بھجوادیا تھا۔ بہناز بہت اچھی تھی۔ ہم دونوں نے ساتھ ہی ماما پارسی اسکول سے انٹر کیا تھا۔ ماما پارسی اسکول کراچی میں پارسیوں کا بنایا ہوا لڑکیوں کے لیے پرانا اسکول ہے۔ اس اسکول میں گزرے ہوئے لمحے خوابوں کی طرح یاد ہیں۔ اسکول کا میدان' پتھروں کی بنی ہوئی پرانی عمارت۔ اونچی اونچی چھتوں والی پرانی کلاسیں۔ سخت محنت کرنے والی استانیاں۔ پرنسپل کا صاف ستھرہ کمرہ' جہاں ڈانٹ بھی پڑتی تھی' پیار بھی ملتا تھا۔ جہاں کی ماسیوں نے اور استانیوں نے ماں باپ کے بعد ہم لوگوں کی ہر طرح سے خدمت کی تھی۔ نہ جانے کراچی کی کتنی لڑکیاں یہاں سے پڑھ پڑھ کر دنیا کے ان گنت کونوں میں پہنچ گئی ہیں۔ یہاں مجھے بہناز ملی تھی اور میری دوست ہو گئی تھی پھر ساتھ ہی ہمارا داخلہ سندھ میڈیکل کالج میں ہوا۔ وہ بہت امیر تھی اور اس کے نمبر بھی مجھ سے زائد تھے' مگر اقلیتوں کے کوٹے میں اس کا نمبر سندھ میڈیکل کالج میں پڑا تھا۔ میں اس سے نمبروں میں بہت کم ہونے کے باوجود صرف تین نمبروں سے ڈاؤ

میڈیکل کالج میں داخلے سے رہ گئی تھی۔ ہم لوگ بہت گہرے دوست تھے۔ میرا گھرانہ بہناز کی طرح امیر نہیں تھا' متوسط درجے کے ناظم آباد میں رہنے والے لوگ تھے ہم' مگر پھر بھی بہناز سے خوب دوستی تھی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ میری رازدار سہیلی تھی اور وقت پر کام آنے والی' جس پر میں مکمل طور پر بھروسا کرسکتی تھی۔

میں اس وقت گارڈن میں شمع کلینک میں کام کرتی تھی۔ صبح سے دوپہر تک کام تھا۔ اچھی تنخواہ تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ جلد از جلد پارٹ ون کا امتحان دے کر جناح ہسپتال میں میڈیسن میں کام شروع کروں۔ مجھے اس سے پہلے کبھی بھی بینک کے اکاؤنٹ کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی مگر حامد' میرا چھوٹا بھائی' اب سعودی عرب چلاگیا تھا۔ وہاں سے اس نے کچھ رقم بھیجی تھی جو کہ وہ اب ہر ماہ پابندی سے بھیجنا چاہتا تھا اور اس نے لکھا تھا کہ میں اپنا اکاؤنٹ کھول کر اس میں پیسے جمع کرادیا کروں۔ حامد کو انٹر کے بعد کراچی کے کوٹے میں نہ این ای ڈی میں داخلہ مل سکا تھا اور نہ ہی ڈاؤد انجینئرنگ کالج میں داخلہ ملا۔ مگر کراچی پولی ٹیکنک میں داخلہ مل گیا تھا۔ اس نے وہاں سے سول انجینئرنگ میں ڈپلومہ کیا تھا' جس کے بعد وہ سعودی عرب چلا گیا تھا۔ اس کی نوکری بہت اچھی تھی اور وہ اپنے سارے ساتھیوں سے زائد اور میرے ڈاکٹر ہونے کے باوجود مجھ سے بھی کہیں زیادہ کما رہا تھا۔

میں نے جلدی جلدی فارم بھرا۔ حامد کے بینک ڈرافٹ کا جمع کرنے والے فارم میں اندراج کیا اور جلدی جلدی اس کے چہرے پر اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر گھبراتی ہوئی بینک سے نکل آئی تھی۔ نشاط سینما کے سامنے ڈبلیو چھ کا انتظار ہی کررہی تھی کہ میں نے اسے دیکھا۔ نپے تلے قدموں کے ساتھ دھیرے دھیرے' آہستہ آہستہ وہ میرے سامنے سے چلتا ہوا مجھے دیکھتا ہوا' اپنی تیز نظروں سے اور اپنے سلگتے چہرے اور ہونٹوں کے ساتھ میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا تھا۔

میں ساکت دم بخود حیران اور پریشان سی ہوگئی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا "مس آپ اپنا پارکر قلم بھول آئی تھیں" اس کے ہاتھ میں میرا پسندیدہ سیاہ پارکر قلم تھا' جسے میں فوراً ہی پہچان گئی تھی۔ میں نے اس سے قلم لے لیا' پھر کہا' بہت بہت شکریہ۔ نہ جانے کتنی مشکل سے یہ الفاظ ادا کیے تھے میں نے۔

"نہیں' صرف شکریے سے تو کام نہیں بنے گا۔ آپ کو جرمانہ دینا ہوگا۔" اس نے بڑے شوخ انداز سے کہا تھا۔ میں تو جیسے مرہی گئی تھی۔

"آپ تو ڈاکٹر ہیں ناں۔ میں نے اندازہ لگالیا تھا۔ اچھا اپنے ہسپتال یا کلینک کا نمبر دے دیں۔ میں خود ہی آپ سے جرمانہ وصول کرلوں گا۔" اس نے ہنس کر کہا تھا۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا' پھر شمع کلینک کا نمبر اسے بتا دیا تھا۔ دو اور تین کے درمیان فون کیجیے گا مجھے۔

تبسم میرا نام ہے۔ میں نے جھجک جھجک کر نہ چاہتے ہوئے بھی وہی کہا جو میرا دل کہہ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں ایک شدید خواہش تھی اس سے بات کرنے کی اور اس سے تعلق رکھنے کی۔ اس میں کسی قسم کی شدید کشش تھی' جان لیوا۔ مار دینے والی۔

وہ مسکراتا ہوا ایک بھرپور نظر مجھ پر ڈال کر واپس بینک کی طرف چلا گیا تھا۔

وہ دن خوب صورت دن ثابت ہوا تھا۔ میں تمام دن اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ وہ عام معیار کے مطابق خوب صورت تو نہیں تھا' مگر ایک کشش تھی اس میں' بے قابو کر دینے والی۔ گھر پہنچ کر بھی میں اسے بھولی نہیں تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح بار بار جھٹکنے کے باوجود ذہن کے پردے پر چلا آتا تھا' اپنی انگارے جیسی آنکھوں اور سلگتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ۔ میں اس کے بارے میں سوچتی ہوئی سوئی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ رات یکایک آنکھ کھل گئی تھی میری' ایک خوف سے مگر بڑے خوشگوار احساس کے ساتھ۔ میں خواب دیکھ رہی تھی کہ میں ایک ویرانے میں بھاگی چلی جا رہی ہوں اور کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ مسلسل چیخ پکار کے باوجود کوئی مددگار نہیں تھا جو ہاتھ پکڑتا۔ میں خوف کے مارے بھاگی جا رہی تھی اور پیچھے تعاقب کرنے والا آدمی' آگے اور آگے مسلسل قریب سے قریب تر آتا جا رہا تھا کہ میدان ختم ہو گیا اور نیچے ایک بڑی سی کھائی تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور آنکھیں بند کر کے اس کھائی میں کود گئی لیکن اس سے قبل ہی ایک مہربان چہرے نے مجھے پکڑ لیا تھا اپنی گود میں اٹھا لیا تھا۔ وہی بڑی بڑی انگارے جیسی آنکھیں اور سلگتے ہوئے ہونٹ۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ تعاقب کرنے والا بھاگ چکا ہے۔ ایک پرسکون احساس کے ساتھ میں ڈری ڈری جاگ گئی تھی۔

پھر میں اسی کے بارے میں سوچتے ہوئے سو گئی تھی۔

صبح کا وقت بڑا مصروف گزرا تھا۔ طرح طرح کے مریض' عجیب عجیب شکایتیں' پھر ایک آیا کا مسئلہ تھا' جس کی ماں کو کینسر ہو گیا تھا جس کی دوا آٹھ ہزار روپے کی تھی اور پیسے اس کے پاس نہیں تھے۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ کچھ زکواۃ کے پیسوں سے اس کی مدد کر دوں گی۔ پھر دواؤں کی کمپنیوں کے نمائندے آ گئے تھے اور ان کی باتیں سنتے سنتے تقریباً" ڈھائی بجے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔

نرس نے دوسرے کمرے میں فون اٹھایا' پھر مجھے بتایا تھا کہ کوئی دانش صاحب آپ سے بات کریں گے۔ فون کے دوسری جانب وہی تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں اس فون کا ہی تو انتظار کر رہی تھی۔ بھاری بھاری سی آواز۔ "بہت مصروف ہیں کیا آپ؟" اس نے پوچھا تھا۔

"اچھا' ڈسٹرب تو نہیں کیا میں نے؟" اس نے کہا تھا۔

"نہیں نہیں' بالکل نہیں۔" میں نے جلدی سے جواب دیا۔

"پھر کیا فیصلہ کیا ہے آپ نے؟" اس نے پوچھا۔

"کاہے کا فیصلہ؟" میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"ارے بھول بھی گئیں۔ بڑی بے وفا ہیں آپ۔" یہ کہہ کر وہ ہنسا تھا۔ مجھے عجیب سا لگا مگر اچھا لگا تھا۔

"میں سمجھی نہیں۔" میں نے جواب میں کہا تھا۔

آپ نے جرمانہ دینا ہے۔ یاد ہے؟ میں نے کہا تھا کہ آپ سے جرمانہ وصول کروں گا۔" اس کی بھری بھری سی آواز آئی تھی۔

میں ہنس دی۔ "ضرور بولیں' کیا جرمانہ چاہیے؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں دے سکیں گی آپ۔" اس کی آواز آئی۔

"آپ مانگیں تو۔" میں نے فوراً" ہی جواب دیا تھا۔

"اچھا' وقت آئے گا تو مانگ بھی لوں گا' پھر نہ ناں کیجئے گا۔" اس کی شوخ سی آواز میرے کان میں آئی تھی۔

"ضرور آزما کر دیکھیں۔ اب تو جرمانہ دے کر ہی رہوں گی۔" میرے منہ سے بے ساختہ سا نکل گیا۔

"اچھا' آپ کی کلینک کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے بتایا کہ گارڈن ایسٹ میں چوراہے کے فوراً" بعد نیلی سی عمارت ہے۔

"ہاں ہاں۔ میں سمجھ گیا۔ اس علاقے سے میرا گزر ہوتا ہے۔"

پھر اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اسٹیٹ لائف انشورنس میں کام کرتا ہے اور گلشن میں رہتا ہے۔ اس وقت وہ آفس سے ہی بول رہا تھا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے فون بند کردیا۔ میں گھبرائی تو تھی پر خوش تھی' بے تحاشا' بے اندازہ۔ مجھے وہ اچھا لگا تھا اور اس کا ہر انداز مجھے بھا گیا تھا۔ وہ دھیرے سے چپکے سے آکر میرے دل میں سما گیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ میں اسے اچھی ہی لگی ہوں تبھی تو اس نے مجھے فون کیا ہے۔ یاد کرکے میرے بتائے ہوئے نمبر' بتائے ہوئے وقت پر۔ میں من ہی من میں مسکرا مسکرا دی تھی۔ روزانہ کی بور زندگی میں یکایک بہار سی آگئی تھی۔

ابو کے مرنے کے بعد جیسے زندگی تھم سی گئی تھی۔ امی اپنے غم سے ہی نہیں نکل پائی تھیں۔ ابو کو اس طرح سے مرنا نہیں چاہیے تھا۔ وہ روزانہ کے معمول کے مطابق گھر سے نکلے تھے اور بس اسٹاپ سے تھوڑا سا آگے اپنے آفس کی بس کا انتظار کر رہے تھے کہ نہ جانے یکایک کہاں سے تین منی بسیں آپس میں ریس لگاتے ہوئے آئی تھیں اور چوراہے کے سرخ سگنل کو

توڑتے ہوئے نکلی تھیں۔ اس منی بس سے بچنے کے لیے دوسری جانب سے آنے والی منی بس مڑی تھی اور بے قابو ہو کر فٹ پاتھ سے ٹکرا کر روڈ پر الٹ گئی تھی۔ اس الٹی ہوئی منی بس سے بچنے کے لیے پیچھے آنے والی منی بس نے موڑا تھا اور میرے ابو کو کچل دیا تھا۔ وہ وہیں پر ہی مر گئے تھے۔ یہ واقعہ اتنی بار ہمارے سامنے دہرایا گیا تھا کہ مجھے اب بالکل ازبر ہو گیا تھا۔ زندگی جیسے ٹھہر گئی تھی۔ میرا ہاؤس جاب ابھی ختم ہی ہوا تھا۔ حامد نوکری تلاش کر رہا تھا۔ ابو کو میری شادی کی فکر تھی۔ امی نے تقریباً" سب کچھ بنایا ہوا تھا۔ اور وہ دونوں ہی کسی مناسب رشتے کے انتظار میں تھے۔

ابو کے مرنے اور سوگ کے ابتدائی دنوں کے بعد زندگی معمول پر آتو گئی تھی مگر لوگ بدل گئے تھے یا شاید بدلے نہیں تھے' ہم لوگوں کو ایسا ہی محسوس ہوا تھا کیوں کہ اس سے پہلے تو ہم نے سوچا ہی نہیں تھا۔ شکر ہے کہ سر چھپانے کو اپنا گھر تھا اور ابو کی بچائی ہوئی رقم اتنی تھی کہ ہمیں ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ پھر میں بھی باضابطہ ڈاکٹر بن کر برسرِ روزگار تھی اور حامد سعودی عرب میں اچھی خاصی رقم کما رہا تھا۔

دانش اس خلا میں تازہ ہوا کی طرح سے آیا تھا۔ دوسرے دن میں اس کے فون کا انتظار کرتی رہی تھی مگر اس کا فون نہیں آیا تھا۔ میں گھبرا گئی' پریشان ہو گئی۔ نہ جانے کیا کیا خیالات امڈ امڈ کر آئے تھے۔ گھر آکر بھی دل نہیں لگا تھا۔ تھوڑا سا کھانا کھا کر اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی تھی۔ ایک رسالہ پڑھنے کی کوشش کی تو دماغ سائیں سائیں کرنے لگا تھا۔ دل اتنا بے تاب ہوا کہ سر تکیے پر رکھ کر میں بے قرار ہو کر روئی تھی۔ "کہاں ہو دانش؟ فون کیوں نہیں کیا؟ جرمانہ تو لے لیتے۔" میرے پاس تو اس کا کوئی پتا بھی نہیں تھا۔ پھر نہ جانے کسی نے کہا تھا کہ تبسم کیسی بے وقوفی ہے۔ کیوں ایک سائے کے پیچھے بھاگ رہی ہو؟ کیوں ایک خواب سے دل لگا رہی ہو؟ بینک کی شناسائی' روڈ کی ایک ملاقات اور ایک فون۔ اس طرح سے تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ زندگی ایسے تھوڑی بیتتی ہے۔ میں سوچتی رہی' روتی رہی' الجھتی رہی اور بگڑتی رہی مگر وہ انگارہ آنکھیں اور سلگتے ہوئے ہونٹ بار بار میری نظروں کے سامنے رقص کرتے رہے۔ میرے تعاقب میں لگے رہے۔

شام کو میں نے بہناز کو فون کیا ادھر ادھر کی باتیں کر کے دل بہلانے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ سمجھ گئی۔ فون پر ہی اس نے کہا تھا کہ تبسم تم ٹھیک نہیں ہو۔ بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟ میں نے ٹال دیا تھا۔

دوسرے دن دو بجے یکایک بہناز مجھے لینے آگئی تھی اور زبردستی مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر اپنے گھر لے گئی تھی۔ وہ لوگ پارسی کالونی کے ایک بڑے سے پرانے سے گھر میں رہتے تھے۔

وہاں سے ہی میں نے امی کو فون کیا تھا کہ مجھے دیر ہوجائے گی۔

میں بہناز سے کچھ چھپا نہیں سکی بلکہ یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ کیوں کہ اس طرح سے دل کا بوجھ اتر گیا تھا۔ وہ ہنس دی تھی۔ "دنگریار تبسم' یہ تو بڑی بے وقوفی کی بات ہے۔ نہ جانے کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ مجھے تو کچھ الٹا سلٹا آدمی ہی لگتا ہے۔ ایسا نائی ہوتا ہے۔ آدمی لوگوں کا بھروسا نائی کرنا چاہیے۔ پھر تم اس کو تو جانتا بھی نہیں ہے۔ کیسا بات کرتا ہے۔"

اس نے اپنے طریقے سے صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا۔ میں سمجھی تھی مگر سمجھ کر بھی نہیں سمجھی تھی یا شاید سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ شام کو اس کے ڈرائیور نے مجھے میرے گھر چھوڑ دیا تھا۔

اگلے دن کام ختم کر کے اور فون کا انتظار کر کے میں کلینک سے باہر نکلی تھی اور روڈ کی طرف جا رہی تھی کہ برابر میں سرمئی رنگ کی وہ کار آکر رک گئی تھی اور اسی بھری بھری آواز میں اس نے کہا تھا' "جرمانہ دینے کو تیار ہیں ڈاکٹر صاحب؟" میں ٹھٹھک کر رہ گئی تھی۔ جیسے ایک بھونچال سا آگیا ہو۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی۔ اس نے دروازہ کھول کر کہا' "آئیں بیٹھیں' آپ تو جرمانہ دیں گی نہیں۔ چلیے میں ہی آپ کو چائے پلاتا ہوں۔"

میں مزید کچھ سوچے بغیر بے ساختہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ سبزی منڈی کے سامنے حسن اسکوائر سے پہلے وہ مجھے بڑی بی ریسٹورنٹ میں لے گیا تھا۔

میں بڑی بی ریسٹورنٹ میں پہلے کبھی نہیں آئی تھی مگر کراچی یونیورسٹی میں پڑھنے والی دوست لڑکیوں نے بتایا تھا کہ وہی ایک جگہ ہے جہاں محبت کرنے والے ملتے ہیں۔ آزادی کے ساتھ اور دوسروں کی توجہ کے بغیر۔

ہم دونوں وہاں دو گھنٹے تک بیٹھے رہے تھے۔ وہ خوب باتیں کرتا تھا۔ میں مسحور اُس کو دیکھتی رہی۔ وہ میرے لیے ہی بنایا گیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ اسٹیٹ لائف میں آفیسر ہے اور میکلوڈ روڈ پر اس کا آفس ہے۔ اس نے اپنے آفس کا نمبر بھی بتایا تھا۔ اس نے لطیفے سنائے' چٹکلے بوجھے' کچھ میری سنی نہیں اور نہ جانے کہاں کہاں کی' کون کون سی باتیں کرتا رہا تھا۔

اس نے ہی مجھے میرے گھر کے اسٹاپ تک چھوڑا تھا۔ مجھے دیر ہوجانے سے پریشان ہو کر امی بہناز کو فون کر چکی تھیں۔ میں نے بہانہ بنا کر امی کو مطمئن کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بہناز کا فون آیا۔ میں نے اسے بتایا کہ دانش سے میری ملاقات ہوئی تھی اور ہم نے ساتھ ہی بڑی بی میں چائے پی تھی۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ جوش اور جذبے کے ساتھ۔ ایک ایک بات۔ "بہناز وہ بہت اچھا ہے اور میں بری طرح سے اس کی محبت میں گرفتار ہوگئی ہوں۔"

بہناز نے میری حوصلہ افزائی نہیں کی تھی بلکہ مجھے ڈرایا تھا۔ مجھے بتایا تھا کہ یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے۔ تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہو۔ اس کے خاندان کے بارے میں' اس کے کام کے بارے میں۔ صرف گاڑی رکھنے سے انسان امیر نہیں ہوجاتا ہے۔ تبسم' ہوشیار رہنا' زمانہ بہت خراب ہے۔ میں ہنس دی تھی۔ "زمانہ خراب ہوگا مگر دانش خراب نہیں ہوسکتا۔"

دوسرے دن پھر اس کا فون آیا تھا۔ وہی شوخ آواز' بھری بھری' پراسرار۔ ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ میں اب جرمانہ دوں گی جہاں بھی وہ کہے گا۔

ہماری اگلی طویل ملاقات پیکنگ ریسٹورنٹ میں ہوئی تھی۔ بہادر آباد کا یہ چائنیز ریسٹورنٹ اچھی جگہ ہے۔ دوپہر کے کھانے کے ساتھ ساتھ ہم لوگ دنیا جہان کی باتیں بھی کرتے رہے تھے۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کی ماں ہے' جو گھر پر رہتی ہے اور ایک بھائی ہے جو فوج میں ہے اور آج کل لاہور میں ہے۔ دو بہنوں کی شادی ہوچکی ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کی ماں آج کل زبردست طریقے سے اس کے لیے رشتے کی تلاش میں ہے اور جیسے ہی کوئی لڑکی ملے گی ویسے ہی اس کی شادی ہوجائے گی۔ پھر اس نے میری آنکھوں میں اپنی انگارے جیسی آنکھیں ڈال کر کہا کہ اب لڑکی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

میں وہ احساسات بیان نہیں کرسکتی ہوں' وہ جذبات سامنے نہیں لاسکتی ہوں۔ خوشی کا ایک احساس' ایک ہلکے پن کا تصور۔ ایک ایسا حسین خواب جو کبھی بھی ختم نہیں ہوتا ہے۔

اس نے میرے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے دبایا تھا۔

اسی شام کو میں نے بہناز کو بتایا تھا۔ وہ خوش تو ہوئی مگر اس نے کہا کہ تبسم تم لوگوں میں ایسا تو نہیں ہوتا ہے ناں۔ اس کو کہو کہ اپنی ماں کو تمہارے گھر بھیجے اور یہ ہوٹلوں کا چکر چھوڑو۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ یا تو اس سے اپنی کلینک میں ملو اور بہت ضروری ہے تو میرے گھر بلالو۔

میں بہناز کی باتوں پر ہنسی تھی۔ پارسی لوگ تو خواہ مخواہ ہی شک کرتے ہیں۔ بہناز نے کبھی کسی کو چاہا تھوڑی تھا۔ اسے کیا پتا کہ محبت کیا ہوتی ہے' پیار کیا ہوتا ہے' کسی پر انحصار کرنا کس کو کہتے ہیں اور اعتبار کس چڑیا کا نام ہے؟ پہلی دفعہ مجھے بہناز کی باتیں بری بھی لگی تھیں۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے اس کو خواہ مخواہ کی جلن ہورہی ہے میری خوشی پر۔ اس کے پاس تمام تر دولت ہونے کے باوجود ابھی تک اس کے لیے کوئی نہیں آیا تھا اور اب میری محبت پر اسے جلن ہورہی ہے' شاید مجھے بھی ہوتی۔ مگر میں نے سوچا کہ میں دانش سے کہوں گی کہ اپنے گھر والوں کو میرے گھر بھیجے۔

اس دن ہم لوگ گلشن میں عثمانیہ ریسٹورنٹ میں بیٹھے دوپہر کا کھانا کھا کر چائے پی رہے تھے۔ میں نے اسے بھرپور نظروں سے اپنے من میں سماتے ہوئے کہا۔ "دانش تم نے اپنی امی

سے بات کی۔ اب اس طرح سے ملتے رہنے سے اچھا ہے کہ ہم لوگ شادی کر کے اکٹھے رہیں۔
اب مجھ سے اکیلا نہیں رہا جاتا۔ میں تمھارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ ہروقت ہر سمے۔ تمھارا خیال کرنا چاہتی ہوں، تمھاری زندگی میں شامل ہونا چاہتی ہوں۔"

وہ مسکرایا تھا، وہی قاتل مسکراہٹ جو بھرے بھرے ہونٹوں سے نکلتی تھی اور سفید سفید چمک دار دانت ایسے لگتے تھے جیسے کہیں پر بجلی گر رہی ہو۔ ایسے ہی موقعوں پر مجھے اس پر بے تحاشا پیار سا آتا تھا۔ میرا دل کرتا تھا کہ بڑھ کر اس کا منہ چوم چوم لوں۔ میں اسے مسحور دیکھ ہی رہی تھی کہ اس نے کہا۔ "تبسم بڑا مسئلہ ہے۔ تم لوگوں کا خاندان دہلی کا ہے اور ہم لوگوں کا خاندان الٰہ آباد سے پاکستان آیا ہے۔ ہمارے خاندان میں شادی صرف برادری میں ہوتی ہے۔ میں نے اپنی امی سے بات کی تھی مگر وہ کہتی ہیں کہ جان دے دوں گی مگر تیری شادی برادری سے باہر نہیں ہونے دوں گی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اس مسئلے کو کیسے حل کروں؟"

مجھے ایسا لگا کہ جیسے اس کی مسکراہٹ بجلی بن کر مجھ پر گری ہے۔ ایسا تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ میں نے تو اپنی امی سے تمھارا ذکر بھی کیا ہے اور انھیں تھوڑا اعتراض سا تھا کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ میں ڈاکٹر ہونے کے ناتے کسی ڈاکٹر سے ہی شادی کروں مگر پھر انھوں نے کہا تھا کہ اگر تمھاری مرضی یہی ہے تو میں راضی ہوں۔ میں تو صرف تمھیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن اب ایک نیا مسئلہ آکھڑا ہوا تھا۔ زندگی یکایک ایک دم سے کٹھن ہوگئی تھی۔ جیسے ڈھلان پر جاتے ہوئے یکایک کوئی چڑھائی آگئی ہو۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں؟ میں نے پوچھا تھا کہ "اب کیا ہوگا دانش؟"
وہ پھر مسکرایا تھا۔ "میں کوشش کرتا ہوں" اس نے کہا تھا۔ "دوبارہ امی سے بات کرتا ہوں۔ راضی کرتا ہوں ان کو، ورنہ مجھ میں ہمت ہے کہ دنیا سے بغاوت کرلوں۔" وہ زور سے ہنسا تھا۔

بہت دنوں کے بعد میں نے بہناز کو فون کیا تھا۔ اس نے ساری کہانی سنی پھر کہا تھا۔ "نہیں تبسم یہ صحیح نہیں ہے اس کے گھر والوں کو تمھارے گھر آنا ہوگا۔ پاکستان میں اس طرح سے نہیں ہوتا ہے۔ مجھے نہ جانے کیوں شک سا ہوتا ہے اس آدمی پر۔"

میں نے بہناز سے کہا کہ دانش کو اس سے ملانے لاؤں گی۔ بہناز نے ہم دونوں کو کھانے پر بلالیا۔ بہناز کے گھر پر ہم لوگوں نے ساتھ کھانا کھایا تھا اور خوب ساری باتیں کی تھیں۔ دانش نے کہا تھا کہ اس کی ماں نہیں مان رہی اور اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم لوگ شادی کرلیں اور کہیں اور رہیں اپنی ماں سے دور۔

بغیر کسی نتیجے پر پہنچے ہوئے ہم لوگ وہاں سے اٹھ گئے۔ دانش نے ہی مجھے گھر چھوڑا تھا۔

دانش میری ماں سے مل چکا تھا اور میری ماں اس پر بلا کا اعتبار کرنے لگی تھی۔ ان کے خیال میں دانش میرے لیے بہت ہی اچھا ثابت ہوا تھا۔

دوسرے دن بہناز میرے کلینک آکر مجھے اپنے گھر لے گئی۔ اس کا شک اور بڑھ گیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ جس طرح سے اس نے اپنی ماں کے بارے میں بات کی تھی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایمان دار آدمی نہیں ہے۔ اس نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ اس طرح کا کوئی فیصلہ نہ کرنا جس میں دانش کے گھر والے شامل نہیں ہوں۔

میں پریشان تھی۔ مجھے بہناز کی بات بالکل بھی اچھی نہیں لگی تھی۔ میری نظر میں دانش قربانی دے رہا تھا۔ اپنی ماں کو چھوڑ رہا تھا اور پھر میرا خیال تھا کہ ایک دفعہ شادی ہوجائے گی تو پھر سب کچھ صحیح ہوجائے گا۔

وہ رات میں نے سوچ سوچ کر اور جاگ جاگ کر گزاری تھی۔ دانش میرے ہوش و حواس پر آسیب کی طرح سے چھا گیا تھا۔ اس نے مجھے فتح کرلیا تھا اور اب میں اس کی باندی بننے کو تیار تھی۔ میں خود کوئی بدصورت لڑکی نہیں تھی۔ کالج میں اور ہاؤس جاب کے دوران بہت لوگوں نے مجھے پسند کیا تھا' چاہا تھا مگر میں نے کبھی بھی کسی میں کسی بھی قسم کی کشش محسوس نہیں کی تھی، مگر دانش نے مجھے بالکل دیوانہ بنادیا تھا۔ میں اس کے ساتھ بہت اچھا محسوس کرتی تھی۔ وہ بڑے اچھے معیار کے کپڑے پہنتا تھا۔ صاف ستھرے استری کیے ہوئے۔ موزوں سے لے کر قمیض اور رومال تک ہر چیز میچ ہوتی تھی۔ ہر طرح سے مکمل اور اس کا خوب صورت چہرہ' اس کی خوب صورت باتیں' اس کا خوب صورت انداز اور اب اس کی قربانی' مجھے اپنی قسمت پر ناز سا محسوس ہوا۔ اس دن بھی وہ مجھے کلینک لینے آگیا تھا۔ ہم لوگوں نے عثمانیہ میں کھانا کھایا۔ پھر وہ مجھے یونیورسٹی روڈ پر اپنے ایک دوست کے گھر چائے پلانے لے گیا تھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ گیٹ کی چابی اس کے پاس تھی۔ اس نے خود ہی چائے بنائی تھی اور ہم لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے خوب باتیں کرتے رہے تھے۔ وقت گزرتے گزرتے حد سے گزر گیا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی ہم دونوں وہ سب کچھ کر گزرے تھے جو ہمیں نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس میں دانش کا قصور' اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا کہ وہ مجھے ایک اکیلے گھر میں لے آیا تھا۔ کچھ قصور میرا بھی تھا۔ میں خود بھی تو اسے چاہتی تھی۔ میری سپردگی میں میری اپنی مرضی بھی شامل تھی۔

"دانش ہم دونوں کو اب شادی کرنی ہوگی۔ تم اب تاریخ بتاؤ میں حامد کو بلاتی ہوں۔ پھر تم ہمارے گھر میں ہی رہنا' کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے دھیرے سے مسکرایا تھا۔

پھر یکایک ہی مجھے پتا چلا کہ دانش شادی شدہ ہے' اس کے تین بچے ہیں' اس کی بیوی ہے۔

میں نے اس کے آفس فون کیا تھا جہاں سے کسی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ آفس آنے کے فوراً بعد واپس گھر چلا گیا ہے کیوں کہ اس کے بچے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ میں اپنے کانوں سے کیا سن رہی ہوں۔ میں نے دوبارہ پوچھا تھا اور دوبارہ سے مجھے یہی جواب ملا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اتنا بڑا جھوٹ۔ دانش ایسا نہیں کر سکتا۔ میں سوچ سوچ کر پاگل سی ہو گئی تھی۔

اس نے آج تک مجھے گھر کا فون نمبر نہیں دیا تھا۔ اس نے کہا تھا اس کے گھر پر فون نہیں ہے۔ میں نے دوبارہ اس کے آفس فون کر کے اس کے گھر کا نمبر پتا کیا تھا۔ نمبر سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ میں کلینک سے بار بار فون کرتی رہی تھی اور دل ہی دل میں روتی رہی تھی۔ گھر آ کر بھی مسلسل فون کرتی رہی مگر کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ میری امی نے کئی بار مجھ سے پوچھا کہ میں کیوں پریشان ہوں مگر میں انھیں بھی کچھ نہیں کہہ سکی تھی۔ دل میں آیا کہ بہناز سے باتیں کروں مگر ہمت نہیں ہو سکی۔

مغرب کے بعد اس کا فون لگ گیا۔ وہی بھری بھری آواز' وہ میری آواز سن کر سکتے میں آ گیا۔ میں چیخی' کیوں جھوٹ بولا تھا تم نے مجھ سے؟ وہ خاموش رہا تھا۔ جھوٹے' بدمعاش' بے غیرت انسان۔ کس جرم کی سزا دی تھی تم نے۔ میں نے تو محبت کی تھی' صرف چاہا تھا تمھیں۔ وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ بولو بولتے کیوں نہیں ہو؟

"تمھارا غصہ ختم ہو گا تو بولوں گا۔ تم خاموش ہو گی تو کچھ کہوں گا۔" اس نے اپنے اسی انداز میں کہا تھا۔

میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اس کی آواز آئی۔ "میں تمھیں سب کچھ بتا دوں گا کہ مسئلہ کیا ہے۔ کل میرا انتظار کرنا۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا تھا۔

یقین و اعتبار کا جو محل آہستہ آہستہ سے میں نے بنایا تھا وہ چکنا چور ہو کر میرے سامنے بکھر گیا۔ مجھے ایسا لگا تھا کہ جیسے کرچیاں میرے جسم سے لپٹ گئی ہیں۔ درد ہی درد۔ جسم سے روح تک اوپر سے اندر تک۔ زخم زخم۔ لہولہان۔

اس کے ساتھ گزرے ہوئے تمام لمحے خوف ناک پرچھائیوں کی طرح اُڈ آئے تھے اور سانپ کی طرح مجھے ڈس رہے تھے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں ناپاک ہو گئی ہوں۔ میرے جسم کا پور پور گندگی کا ڈھیر بن کر رہ گیا ہے۔ میں نہائی تھی۔ پورے خشوع و خضوع کے ساتھ۔ نماز پڑھی۔ اپنے گناہ کی خدا سے معافی مانگی تھی اور دعا کی تھی کہ یااللہ! مجھے حاملہ مت کر دینا' میں یہ بوجھ کس طرح سے لے کر گھوموں گی۔ کیسے دنیا کا سامنا کروں گی۔ امی سے کیا کہوں گی۔ بہناز کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ ساری رات جاگ کر گزاری تھی۔ روتے ہوئے۔ دعا کرتے ہوئے۔

وہ مجھے کلینک لینے آگیا تھا۔ سنجیدہ صورت کے ساتھ وہی چہرہ' وہی انداز۔ وہ مجھے پھر بھی اچھا ہی لگا تھا۔ میں اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ڈرائیو کرتا کرتا وہ ہل پارک آگیا تھا۔ ایک کونے میں گاڑی پارک کرکے اس نے سینڈوچ اور چائے کا آرڈر دیا۔ پھر اس نے کہا تھا' ''تبسم جس وقت میں نے تمھیں دیکھا تھا' میں تو تمھارا دیوانہ ہوگیا تھا۔ تمھیں پانے کی خواہش اتنی شدید تھی کہ میں تم سے سچ بول ہی نہیں سکتا تھا۔ ہاں میں شادی شدہ ہوں' میرے بچے ہیں' میری بیوی ہے' میری ماں نہیں ہے لیکن میں خوش نہیں ہوں۔ یہ شادی تو میرے گھروالوں کی مرضی کی شادی تھی۔ میری بیوی جاہل اور گنوار ہے۔ اسے کچھ پتا نہیں ہے کہ شوہر کیا ہوتا ہے۔ اس کی خوشی کیا ہوتی ہے۔ میں تو اس کے ساتھ صرف زندگی گزار رہا ہوں۔ وقت بتا رہا ہوں۔ محبت نہیں کرسکا ہوں۔ وہ محبت کے قابل نہیں ہے۔ محبت تو میں نے تم سے کی ہے' صرف تم سے۔ تم نے بھی مجھے چاہا ہے' میرا خیال کیا ہے اور یہ وہ جذبہ ہے جسے لیے میں ادھر سے ادھر گھوم رہا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے جیب سے میرے دیئے ہوئے کف لنک کا ڈبہ نکالا تھا۔ یہ تمھارا تحفہ ہے جو میں نے اپنی جان سے لگا کر رکھا ہے۔ تم اگر نہیں ملوگی نہ ملو مگر اسے میں ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گا اور اس کے ساتھ تم ہوگی۔ میرے پاس' میرے ساتھ ساتھ' ہروقت ہر لمحہ۔ میری بیوی میرا نصیب ہے میں چاہتا تم کو ہوں۔ میرا مقدر کچھ اور تھا مگر میری منزل تم ہو' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے کونوں سے آنسو رِس رہے تھے۔ میری نظروں کے سامنے وہ تمام چھوٹے چھوٹے تحفے آگئے' کف لنک' ٹائی کلپ' پارکر قلم' رومال اور نہ جانے کیا کیا' کس چاؤ سے میں نے خریدے تھے اور دانش کی دی ہوئی چیزیں تحائف ایک عورت کے لیے تھے کسی بھی عورت کے لیے میرے لیے یا اس کی بیوی کے لیے۔ میں نے محبت کی تھی' اس نے دھوکا دیا تھا۔ میں نے اعتماد کیا تھا اس نے جھوٹ بولا تھا۔ میں نے پیار کیا تھا اس نے چکر چلایا تھا۔ میں اس کی صورت' شخصیت' انداز پر مرمٹی تھی۔ میں نے کیا سوچا تھا یہ کیا ہوگیا۔

میرے آنسو نکل آئے تھے۔ ''مگر دانش' میں تم سے الگ نہیں ہونا چاہتی ہوں۔ تم کو مجھے پہلے بتا دینا چاہیے تھا۔'' میں نے روتے ہوئے کہا تھا۔

''پھر تم مجھے چھوڑ دیتیں۔ کبھی نہیں ملتیں' پھر میں کیا کرتا؟ میں تو ایک آسرے کے ساتھ تمھارے پاس آتا رہا تھا۔ امید تھی کہ مسئلہ حل ہوجائے گا۔'' اس نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

مسئلہ کیسے حل ہوسکتا ہے؟ دانش! تم شادی شدہ ہو' تمھارے بچے ہیں۔ میں نے پوچھا تھا۔ اس نے ٹشو پیپر سے میرے آنسو پوچھے تھے۔ میری بانہوں کو آہستہ سے پکڑا تھا۔ میری

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ''تبسم مرد تو دو شادیاں کرسکتے ہیں ناں۔ قانون مذہب' شریعت تو اجازت دیتا ہے اس بات کی۔ بولو! مجھ سے شادی کرو گی؟ ابھی' اسی وقت' فوراً'' میں تمھیں پہلی بیوی بناکر رکھوں گا کیوں کہ تم صرف بیوی نہیں ہو گی محبوبہ بھی ہو گی جس سے پیار کیا جاتا ہے اور سلمٰی صرف بیوی ہو گی۔ دوسری بیوی جس سے قسمت اور خاندان نے میری شادی کروی تھی۔ میں نے تو تمھارے لیے مکان بھی لے لیا ہے۔ ہم دونوں کا مکان جہاں ہم دونوں رہیں گے۔ اپنی خوشی سے اور اپنی مرضی سے۔''

مجھے اس کی آنکھوں میں پیار ابلتا ہوا نظر آیا تھا مجھے لگا تھا جیسے وہ سب کچھ سچ بول رہا ہے۔ میں کچھ زیادہ نہیں کہہ سکی۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ ''مجھے گھر چھوڑ دو۔''

محبت بھی کیا عجب چیز ہوتی ہے' جب سے دنیا بنی ہے جب سے انسان بنے ہیں اور جب سے انسان نے انسان کو چاہا ہے یہ جذبہ موجود ہے۔ اربوں' کھربوں' سال سے انسان کو اندھا کردینے والا یہ جذبہ نہ جانے کیا کچھ کرادیتا ہے۔ مجھے ابھی بھی دانش اچھا لگا تھا۔ وقت کا ستایا ہوا جسے کوئی اچھی عورت نہیں ملی تھی۔ اسے کسی اچھی عورت کی ضرورت تھی جو اس کی دوست ہو' اس کو سمجھے' جو اس کی شریک ہو' جس کے کاندھوں پہ سر رکھ کر وہ رو سکے' اس کی سن سکے اپنی کہہ سکے۔ میں نے سوچا تھا کہ زمانے نے بڑا ظلم کیا ہے اس کے ساتھ۔

شادی شدہ آدمی کے ساتھ شادی' میری امی نے مکمل طور پہ اپنی نارضامندی کا اظہار کیا تھا۔ انھیں یقین تک نہیں آیا تھا کہ دانش ایسا کرسکتا ہے۔ مگر میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں دانش سے ہی شادی کروں گی۔ میں نے اسے فون نہیں کیا تھا۔ مگر اس دن وہ خود ہی کلینک مجھے لینے آگیا تھا۔ گاڑی میں مجھے ناظم آباد میں میرے گھر سے بھی آگے لے کر آگیا تھا اور ایک مین روڈ پر واقع مکان کے آگے گاڑی روک دی تھی۔

''یہ مکان تمھارے لیے لیا ہے میں نے۔ فی الحال کرائے کا ہے اور بعد میں ہم اسے خرید لیں گے''۔ ''مگر یہ تو دو منزلہ ہے دانش۔'' میں نے کہا تھا۔

''ہاں اتر کر تو دیکھو۔'' اس نے اترتے ہوئے کہا تھا۔ ''اوپر ہم دونوں رہیں گے اور نیچے تمھارا کلینک ہو گا اور میٹرنٹی ہوم۔ آج کل میٹرنٹی ہوم میں خوب آمدنی ہوتی ہے۔''

مکان اچھا تھا۔ علاقہ بھی اچھا تھا' میں سوچ رہی تھی اور پریشان ہو رہی تھی۔ ایک ایسے آدمی کے ساتھ تھی جسے میں نے ٹوٹ کر چاہا تھا' جو شادی شدہ تھا اور تین بچوں کا باپ۔ کیسے ہو گا' یہ سب کچھ کیسے ہو گا؟

دانش نے مجھے گھر چھوڑ دیا۔ میری ماں نے مجھے سمجھایا تھا کہ شادی شدہ آدمی سے شادی کی بے وقوفی نہ کروں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں حاملہ تھی اور دانش تھا جو شادی شدہ

تھا اور مجھے حد سے زیادہ پیارا بھی تھا۔ اس نے مکان بھی لیا تھا جہاں ہم دونوں کو رہنا تھا اور میٹرنٹی ہوم چلانا تھا۔

دوسرے دن میں کلینک نہیں گئی۔ فون کر دیا تھا کہ میری طبیعت خراب ہے۔ میں بہناز کے گھر چلی گئی تھی۔ وہی میری دوست تھی جس پر مجھے اعتبار تھا۔ مجھے غصہ بھی تھا اور ساتھ میں مگر اعتماد بھی تھا۔

ساری باتیں سن کر وہ بہت ناراض ہوئی تھی۔ ”تبسم تیرا دماغ خراب ہے۔ وہ جھوٹا ہے جھوٹا۔ اس نے تجھے پھنسایا ہے اور اب راستے بند کر دیے ہیں۔ تیرے پاس اپنی عزت بچانے کا کوئی طریقہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ تو اس سے شادی کرے اور شادی کے بعد تجھے اس مکان میں میٹرنٹی ہوم چلانا ہوگا۔ روپے کمانے ہوں گے۔ اس مکار کے لیے‘ کرائے کے لیے‘ تیرے شوہر کے لیے اور یہی تیری زندگی ہوگی۔ تیرے اسلام میں مردوں کی چار شادی ہوگی مگر تیرے اسلام میں بغیر شادی کے بچہ تو نہیں ہے ناں۔ کدھر چلا گیا تھا دانش کا اسلام؟ تجھے جب وہ اس گھر میں لے گیا تھا۔ جہاں وہ سب کچھ کر بیٹھا تھا۔ وہ دھوکا دے رہا ہے تجھے۔ دیکھ میرا کچھ بھی نہیں ہے مگر تو میری دوست ہے۔ مت کر تو شادی اس سے۔ منع کر دے اور نہ مل اس کو۔ بھرا ہوا ہے کراچی ایسے لوگوں سے۔ اس نے کالج کی کئی لڑکیوں کے نام گنوا دیے تھے جو زندگی عذاب میں گزار رہی ہیں۔ جن کی شادیاں ایسے لوگوں سے ہو گئی ہیں جنھوں نے انھیں روپے بنانے کی مشین بنا دیا ہے۔ وہی محبت کا جھانسا‘ پھر ماں باپ کی مرضی کے خلاف شادی اور پھر دن رات کا کام۔ میں بیٹھی رہی۔ روتی رہی۔ سوچتی رہی۔ فیصلے کی طاقت سے محروم۔

پھر بہناز نے مجھ سے دانش کے گھر کا نمبر لیا اور میرے سامنے ہی فون کیا تھا۔ دوسری جانب سے کسی بوڑھی خاتون نے فون اٹھایا تھا جو دانش کی ماں تھی۔ بہناز نے پوچھا کہ دانش کی بیوی کہاں ہے؟ انھوں بتایا تھا کہ وہ تو اسکول میں پڑھاتی ہے اور کام پر گئی ہوئی ہے۔ باتوں باتوں میں بہناز نے ان سے یہ بھی پتا کر لیا کہ دانش نے یہ شادی بھی اپنی مرضی سے کی تھی اور اس کی ماں گھر میں رہتی ہے۔

بہناز نے کہا تھا کتنے جھوٹوں کا مقابلہ کرو گی تبسم۔ میرے لیے مشکل فیصلہ مشکل ہی رہا تھا مگر میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔

بارہ ہزار روپے خرچ ہوئے تھے۔ بہناز مجھے لے گئی جہاں خاموشی سے میرا حمل ضائع کیا گیا تھا۔ کوکھ کا یہ درد گزرے ہوئے تمام درد سے شدید تھا۔ جس کے بعد بہت دنوں تک میں غموں کا بوجھ لیے نڈھال گھومتی رہی تھی۔ بے کس‘ بے بس‘ پریشان اور اب تمام زندگی کوکھ کا یہ قرض جو میں کبھی بھی نہیں چکا سکوں گی۔

دانش کو میں نے کہہ دیا تھا مجھ سے کبھی بھی ملنے کی کوشش نہ کرے۔ میرا اعتبار مردوں سے اٹھ گیا ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اور خاص طور پر ان مردوں سے جن کی انگارہ آنکھیں ہوتی ہیں اور سلگتے ہوئے ہونٹ۔ اس نفرت کے باوجود وہ مجھے یاد آجاتا ہے اور اب بھی راتوں میں تکیے پر سر رکھ کر میں بے اختیار بے وجہ بے قرار ہو کر روتی رہتی ہوں۔

ماما لوسی پوسی مریا

وہ مجھے عید کی نماز میں مل گیا تھا۔ پہلے تو میں اسے نہیں پہچانا مگر جب اس نے اسکول کے بیتے دنوں کی باتیں کی تو مجھے فوراً ہی یاد آگیا۔ ہم دونوں ہی بی ایم بی اسکول کے پڑھے ہوئے تھے۔ پانچ سال تک ساتھ رہا تھا ہمارا۔ چھٹی کلاس میں ہم دونوں ساتھ ہی داخل ہوئے تھے۔ میرا تو داخلہ ہی چھٹی کلاس میں ہوا تھا۔ پہلے تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے داخلہ دینے سے صاف انکار کر دیا تھا مگر جب میرے والد نے کسی ذریعے سے ان سے بات کی تو وہ ٹیسٹ لینے پر راضی ہو گئے تھے۔ میں پڑھنے لکھنے میں بہت اچھا تھا۔ ٹیسٹ میرے لیے بالکل حلوہ ثابت ہوا' پھر انھوں نے بڑی خوشی خوشی مجھے اسکول میں داخلہ دے دیا تھا۔ وہ بڑے شفیق انسان تھے' بڑے محنتی۔ ایسے ہیڈ ماسٹر اسکولوں کو کم ہی ملتے ہیں۔ صبح سے شام تک وہ اسکول میں ہی رہتے تھے۔ نہ ان کا کوئی کوچنگ سینٹر تھا نہ وہ لڑکوں کو گھر پر بلا کر پڑھاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر لڑکوں کو کوچنگ سینٹر میں جانا پڑ جائے تو ایسے اسکولوں کو بند کر دینا چاہیے۔ انھیں میں نے صرف محنت ہی کرتے دیکھا تھا۔ ان کا غصہ بھی بہت غضب کا تھا۔ صبح اسمبلی لائن میں وہ ہر ایک کلاس کو دیکھا کرتے تھے۔ کسی کے بال بڑھے ہوئے ہیں' کسی کے ناخن نہیں کٹے ہوئے ہیں' کسی کا جوتا پالش نہیں کیا ہوا ہے کسی کی قمیض پر نشان پڑا ہوا ہے کسی کی پینٹ پر روشنائی گری ہوئی ہے ہر ایک چیز پر ان کی نگاہ ہوتی تھی۔ لمبے بالوں سے تو انھیں بلا کی چڑ تھی اگر ہم میں سے کسی کے بال کانوں سے نیچے آجاتے تھے تو وہ گھر خط لکھتے تھے کہ اپنے بچے کے بال کٹوالیں اور اگر دوسرے دن بال نہیں کٹے ہوں تو اسکول میں ایک حجام آکر بال کاٹ دیا کرتا تھا۔ میں اب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ پانچ سال اسکول میں جس طرح سے میری تربیت ہوئی تھی وہ اب میری شخصیت کا حصہ بن گئی ہے۔ ہمارے اسکول کے ہر لڑکے کا یہی حال تھا۔ آج کل کے مہنگے اسکولوں کے مقابلے میں وہاں صرف تعلیم نہیں ملتی تھی بلکہ انسانیت کے ہنر بھی سکھائے جاتے تھے۔

زاہد کا داخلہ بھی چھٹی کلاس میں ہوا تھا۔ وہ میرے بعد کلاس میں آیا تھا۔ میرا نمبر اکتالیس تھا اور اس کا بیالیس، اور ہم دونوں کو آخر میں سیٹ ملی تھی۔ شروع میں پوری کلاس ہمارے خلاف تھی لہٰذا ہم دونوں کی دوستی فوراً ہی ہوگئی تھی۔ مگر آہستہ آہستہ ہم دونوں کلاس میں گھل مل گئے تھے۔

میں آگرہ تاج کالونی میں رہتا تھا۔ غازی اسکول کے بس اسٹاپ سے اتر کر اسکول کے پیچھے ہی ہم لوگوں کا گھر تھا۔ میرے والد پاکستان ٹوبیکو کمپنی میں کام کرتے تھے اور کیپسٹن سگریٹ بہت شوق سے پیتے تھے۔ میں کالج میں تھا کہ انھیں خون کی الٹیاں شروع ہوگئیں، سول ہسپتال سے ڈاکٹروں نے بجلی لگانے کے لیے جناح ہسپتال بھیجا، تھوڑے دنوں بعد ہی ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ مجھے سگریٹ سے شاید نفرت اسی لیے ہوگئی تھی۔ سگریٹ کے ساتھ ہی مجھے خون کی الٹیاں کرتے ہوئے میرے والد صاحب نظر آجاتے ہیں۔

زاہد کھارادر میں رہتا تھا۔ ایک دن جب میں دس نمبر کی بس پکڑ کر بجائے ٹاور جانے کے کھارادر پر اتر گیا تھا تو وہ مجھے میمن مسجد کی طرف جانے والی مرزا آدم خان سڑک پر مل گیا تھا۔ میں اکثر ایسا کرتا تھا۔ مجھے روزانہ پانچ آنے یا چھ آنے ملا کرتے تھے۔ ایک آنا ٹاور تک کرایہ وہاں سے ایک آنا دے کر جامعہ کلاتھ مارکیٹ۔ واپسی میں جامعہ کلاتھ مارکیٹ سے ٹاور ایک آنہ اور پھر ٹاور سے ایک آنے میں آگرہ تاج کالونی۔ اکثر میں صبح سویرے نکلا کرتا تھا اور بجائے ٹاور جانے کے کھارادر پر اتر جاتا تھا۔ کھارادر سے ایک شارٹ راستہ تھا جس سے ہوتے ہوئے میمن مسجد کے گیٹ سے نکل کر بولٹن مارکیٹ میں بندر روڈ پر راستہ نکلتا تھا۔ بولٹن مارکیٹ سے ٹرام لے کر جامعہ کلاتھ مارکیٹ پہنچنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ فائدہ یہ ہوتا تھا کہ ٹرام میں بغیر ٹکٹ سفر ہوسکتا تھا اور اس طرح سے ایک آنے کی بچت ہوجاتی تھی۔ میں اپنے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے اس طرح سے پیسے جمع کرلیا کرتا تھا۔ سستا زمانہ تھا ایک آنے میں آدھا سیر امرود یا تین کریم رول مل جایا کرتے تھے۔ اسکول کے باہر بنگالی کے ٹھیلے سے چورن یا بابا سے جنگل جلیبی لے کر کھانے میں بہت مزا آتا تھا۔ بنگالی کا چورن اور املی کے گولے یا گولا گنڈا اور فالودہ ہر چیز ہمیں کھانے سے منع کی جاتی تھی مگر اس کے باوجود ان کا کھانا روز کی بات تھی۔

پھر تو میرا یہ معمول ہی بن گیا تھا کہ کھارادر پر زاہد سے مل کر اس کے ساتھ بولٹن مارکیٹ جانا پھر وہاں سے ٹرام پر بیٹھ کر جامعہ کلاتھ جانا اور پیسے بچانا اور نئی نئی وہ تمام چیزیں کھانا جن سے میرے گھر والے منع کیا کرتے تھے۔ زاہد کو ہر چیز کا پتا تھا۔ وہ ہماری کلاس کا سب سے سیانا بندہ تھا۔ ٹاور سے مرچوں والے چھولے، صدر میں گھسیٹے خان کی حلیم اور چوہدری فرزند علی کی قلفی،

سعید منزل کے کھیر ہاؤس کی کھیر اور برنس روڈ کے کباب، میٹرک تک پہنچتے پہنچتے ان سب چیزوں کا مزا ہم لوگ لوٹ چکے تھے۔ گھر سے چھپ کر پہلی فلم "ارمان" میں نے زاہد کے ہی ساتھ ناز سنیما میں دیکھی تھی۔ شمیم آرا کی "سہیلی" بھی سب سے چھپ کر دیکھی تھی اور بعد میں لی مارکیٹ کی قسمت ٹاکیز میں انگلش فلمیں دیکھنی شروع کی تھیں۔

میٹرک کے بعد ساری کلاس جیسے غائب ہوگئی تھی۔ میں نے ایس ایم کالج کامرس میں داخلہ لیا تھا جہاں سے بی کام پاس کرلیا تھا۔ بی کام کے دوران ہی میرے والد صاحب کا انتقال ہوگیا تھا جس کے بعد مجھے نوکری پر بھی توجہ دینی پڑی تھی۔ مجھے پارسیوں کی ایک پرانی اکاؤنٹنگ فرم میں نوکری مل گئی اور زندگی کی اس دوڑ میں بہت سی چیزیں بچھڑ گئی تھیں، زاہد بھی ان میں سے ایک تھا۔

میں نے بڑی محنت سے کام کیا تھا۔ میرا بڈھا پارسی باس جس کے دونوں بیٹے امریکا میں آباد ہوگئے تھے اور ایک بیٹی اپنے شوہر کے ساتھ کینیڈا چلی گئی تھی، مجھ پر بڑا مہربان تھا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ میری مالی مدد کی تھی بلکہ اس طرح سے رہنمائی کی تھی کہ میں بغیر وقت ضائع کیے ہوئے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بن گیا تھا۔

اب میری اپنی اکاؤنٹنگ کی فرم ہے۔ ہم لوگ اب آگرہ تاج کالونی میں نہیں ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہتے ہیں۔

اس عید پر ڈیفنس کی بڑی مسجد میں زاہد سے ملاقات ہوئی تھی۔ عید ملنے کے بعد ہم لوگوں نے اپنے فون نمبروں کا تبادلہ کیا تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ اب میں اکاؤنٹنٹ ہوگیا ہوں۔ مجھے یاد نہیں تھا کہ اس نے اپنے بارے میں کیا بتایا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اسے ضرور فون کروں گا مگر اس کا نمبر مجھ سے کھو گیا۔

ایک دن آفس میں اس کا فون آیا۔ میں آواز سے ہی پہچان گیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے آفس میں بلایا تھا اس نے کہا تھا کہ اسے مجھ سے کام بھی ہے وہ اپنے اکاؤنٹنٹ کو بدلنا چاہ رہا تھا اور اس سلسلے میں اسے کچھ مشورہ چاہیے تھا۔ ہم نے کچھ پرانی باتیں کی تھیں پھر میں نے اسے بتایا تھا کہ میں کب اس کے آفس آؤں گا۔

تین دن کے بعد میں اس کے آفس پہنچ گیا۔ کلفٹن کی اس بلڈنگ میں پوری تیسری منزل پر اس کا آفس تھا۔ آفس میں داخل ہوتے ہی جو چیز سامنے تھی وہ تھی ایک بڑی سی خوب صورت بلی کی بڑی سی تصویر تھی۔ یہ اس کا ادارہ تھا ادارہ تحفظ حقوق بلیاں، اور وہ اس ادارے کا ڈائریکٹر تھا۔ اس کے کمرے کے باہر کچھ لوگ مختلف ٹیبلوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دربان نے مجھے

اس کے کمرے کے باہر ایک چھوٹے کمرے میں پہنچا دیا تھا جہاں اس کی سیکریٹری اپنے کمپیوٹر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی، "اچھا آپ احسان صاحب ہیں؟ جی ہاں زاہد صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" وہ مجھے لے کر سیدھے زاہد کے کمرے میں چلی گئی تھی۔

اس کا کمرہ خوب صورت تھا۔ بڑے سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ دیواروں پر خوب صورت تصویروں کے ساتھ بلیوں کی تصویر مختلف انداز میں لگی ہوئی تھی۔ اس کے بالکل پیچھے دیوار پر تین بلیوں کی تصویر تھی جن کی دم کو آپس میں باندھ دیا گیا تھا۔ ساتھ میں ایک تیر کی طرح کا ہتھیار تھا جو دموں کی گرہ کو الگ کر رہا تھا۔ اس تیر کے اوپر ادارہ تحفظ حقوق بلیاں کا نشان بنا ہوا تھا۔ اس کی ٹیبل کے دائیں جانب ایک بوڑھی یورپین عورت کی تصویر تھی جو بہت ساری بلیوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔

وہ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا، بڑے خلوص سے ملا تھا۔ دیر تک ہم دونوں اسکول کی باتیں کرتے رہے۔ ماسٹر فضل دین کی کہانیاں اور پی ٹی ماسٹر کی مختلف سزائیں۔ ہمارا اسکول سے بھاگنا اور الفنسٹن اسٹریٹ پر چکر لگانا یا خوامخواہ بوری بازار میں پھیرے لگانا۔ اسے ہر کلاس کی بہت ساری چھوٹی چھوٹی باتیں یاد تھیں۔ ہم گپ مارتے رہے اور چائے پیتے رہے، وہ شام میری بھی فارغ تھی اور شاید اس نے بھی اپنے آپ کو فارغ رکھا ہوا تھا۔ ہم دونوں بچھڑے دنوں کی باتیں کرتے رہے، کبھی ہنستے رہے۔ اس نے ہی بتایا تھا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا انتقال ہو گیا تھا اور کچھ اور کلاس ٹیچروں کے بارے میں بھی اسے پتا تھا۔ وہ ایک اچھی شام ثابت ہوئی۔

رخصت ہوتے ہوئے اس نے مجھ سے وقت مانگا تھا تاکہ کچھ کام کی باتیں کرے۔ دو دن بعد میں نے اسے اپنے آفس بلالیا تھا۔

اس کا ادارہ دنیا بھر میں بلیوں کے حقوق کا تحفظ کرتا تھا۔ پاکستان میں اس نے ہی اس ادارے کی بنیاد رکھی تھی، اب اس کا کام بہت بڑھ گیا تھا۔ لاکھوں ڈالر کا بجٹ تھا اور بقول اس کے اگلے سال سے کتوں کے حقوق کے لیے بھی انھیں کام کرنا تھا۔ اس صورت میں کام مزید بڑھ جانا تھا اسے سارے کام کے اکاؤنٹس کو صحیح رکھنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اکاؤنٹس کی دیکھ بھال کے لیے میں اسے کوئی آدمی دوں اور ہر سال اس کا آڈٹ بھی کروں تاکہ بین الاقوامی میٹنگوں میں مشکل نہ ہو۔ اس نے کہا تھا کہ جو بھی ہماری فیس ہوگی اسے ادا کرنے میں ادارے کو کسی بھی قسم کی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا ہوگا۔ میں نے ہامی بھرلی کہ ایک اکاؤنٹنٹ میں بھیج دوں گا اور اس کی ابتدائی رپورٹ کے مطابق فیصلہ کروں گا کہ ہماری فرم کے لیے کام کرنا ممکن ہوگا کہ نہیں۔

جلد ہی مجھے پتا چل گیا کہ ادارے کا نظام اطمینان بخش ہے۔ لاکھوں ڈالر کا فنڈ ہر سال یورپ اور امریکا سے آتا ہے۔ ادارے کا مرکز درحقیقت سوئٹزر لینڈ میں تھا۔ زاہد پاکستان کی برانچ کا بانی بھی تھا اور ڈائریکٹر بھی، جسے پاکستان میں تمام اختیارات حاصل تھے۔ ادارہ ہی اس کی تنخواہ دیتا تھا اور اس کے بتائے ہوئے طریقوں پر مختلف مہمیں چلاتا تھا۔ ہر سال جینوا میں ادارے کی مختلف برانچوں کی میٹنگ ہوتی تھی اور ہر تین سال پر دنیا کے مختلف حصوں میں ادارے کا کنونشن ہوتا تھا۔ آمدنی اور اخراجات کا حساب کتاب بہت مناسب تھا اور میری فرم نے اس کے ادارے کے آڈٹ کا کام سنبھال لیا تھا۔

زاہد خیابان توحید پر دو ہزار گز کے پلاٹ پر ایک خوب صورت سے مکان میں رہتا تھا۔ اس مکان میں وسیع و عریض لان تھا جس کے ساتھ ہی ایک خوب صورت سا سوئمنگ پول تھا جس کے کنارے پر باربی کیو کے لوازمات بھی موجود تھے۔ اندر کشادہ سادہ ڈرائنگ روم تھا جہاں ایک بڑی سی تصویر تھی بیچ میں وہی یوروپین بوڑھی سی عورت بہت ساری بلیوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔

آہستہ آہستہ ہم دونوں کی پرانی دوستی مزید مستحکم ہوگئی، ساتھ ہی مجھے اس کے ادارے کی سرگرمیوں کا اندازہ بھی ہوگیا تھا۔ بلیوں کے حقوق سے متعلق اس کے ادارے کی سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع تھا مثلاً انھوں نے "بلیوں کے حقوق اور انسان" نام کی کتاب چھاپی ہوئی تھی جس میں انسان اور بلیوں کے صدیوں پرانے تعلقات پر روشنی ڈالی گئی تھی اور بلیوں کے ان حقوق کا ذکر کیا تھا جن کا انسان بالکل خیال نہیں کر رہا تھا۔

"بلی کی ذاتی رائے" نامی کتاب میں بلی کے احساسات اور جذبات کا احترام کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ بچوں کے لیے ایک خوب صورت باتصویر کتاب تھی "بلیاں ہم سب کی دوست" بلیوں کے بارے میں ہی ایک کارٹون کہانی تھی جو کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ تھا۔ اسی طرح سے چھوٹے چھوٹے کئی پمفلٹ تھے جن میں بلیوں پر ہونے والے ظلم سے لے کر بلیوں کے ساتھ ہونے والے عجیب و غریب واقعات کی نشان دہی کی گئی تھی۔ ایک پمفلٹ میں مختلف مذاہب میں بلیوں کے مقام کے بارے میں اطلاعات فراہم کی گئی تھیں۔ اسی پمفلٹ سے مجھے پتا لگا تھا کہ حضرت ابوہریرہؓ کا نام ابوہریرہ اس لیے رکھا گیا تھا کہ وہ مکے کی بلیوں کی حفاظت و نگہداشت کیا کرتے تھے۔

ادارہ تحفظ حقوق بلیاں کے حساب کتاب دیکھنے سے جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ زاہد ہی اس سارے نظام کا بانی بھی ہے اس ادارے کے چلانے کی ذمہ داری بھی اسی پر ہے۔ یورپ،

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور جاپان سے فنڈ ادارے کے لیے آتا تھا اور زاہد کی زیر نگرانی سارا کام ہوتا تھا۔ ادارے میں کام کرنے والے تمام لوگ تنخواہ دار ملازم تھے اور بہت اچھی تنخواہوں پر کام کر رہے تھے۔ زاہد بھی تنخواہ دار ڈائریکٹر تھے۔ ادارے کے مرکزی دفتر جینوا میں تھا، وہاں کی ہدایات پر وہ کام کرتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ زاہد نے یہ سلسلہ شروع کیسے کیا تھا۔ اس کی بھی تفصیل ایک دن مل گئی تھی۔

اس شام میں زاہد کے خوب صورت ڈرائنگ روم میں بیٹھا اس سے گپ مار رہا تھا۔ زاہد پچھلی شام ہی جینوا سے واپس آیا تھا اور اپنے ساتھ ٹیچر کی کچھ بوتلیں بھی لے آیا تھا۔ ٹیچر مجھے بھی بہت پسند ہے یہ شراب ایک مہربان استاد کی طرح ہے جس کی اچھی باتوں کا نشہ کبھی بھی نہیں اترتا ہے۔ ترش ترش، دھیمی دھیمی اور بہت گداز۔ اس نے مجھے شام ساتھ گزارنے کے لیے بلایا تھا۔ میں عادی پینے والا نہیں تھا۔ مگر کبھی کبھار ضرور پی لیتا تھا۔ یہ بھی میں نے اپنے پارسی باس سے سیکھا تھا۔ جب کبھی کبھار وہ مجھے اپنے گھر بلاتے تھے، پی آئی ڈی سی بلڈنگ کے پیچھے پتھروں کے بنے ہوئے گھر کے کشادہ لان پر جب کیماڑی سے آنے والی ہوا اپنے سرور میں چلتی تھی تو شراب کا سرور کچھ اور ہی مزا دیتا تھا۔ نہ جانے مجھے ٹیچر کیوں بہت اچھی لگتی تھی۔ اس دن بھی ہم دونوں باب مارلے، ٹینا ٹرنر اور بروس اسپرنگ کے مختلف گانوں سے دھیمے سروں میں لطف اندوز ہو رہے تھے تو نہ جانے کیوں یکایک میں اس سے پوچھ بیٹھا تھا کہ یار یہ بلیوں کے چکر میں تو کب سے پڑ گیا تھا؟

زاہد زور سے ہنسا تھا۔ ”یار پرانا قصہ ہے، کہاں سے شروع کروں؟ چلو شروع سے شروع کرتا ہوں۔ ہوا یہ کہ میٹرک میں میری سیکنڈ ڈویژن آئی تھی اور میں نے داخلہ اسلامیہ کالج میں لیا تھا اور وہاں ہی میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں کام کرنے لگ گیا تھا۔ ایم ایس ایف میں کام کرنے سے یہ ہوا تھا کہ مسلم لیگ کے لیڈروں سے دوستی ہوگئی۔ ساتھ ہی میں تقریریں وقریریں بھی کرنے لگا تھا۔ پھر پابندی سے مسلم لیگ کا وظیفہ بھی ملتا تھا۔ ایوب خان کے الیکشن میں تو میں نے کام بھی کیا تھا اور اگر ایوب خان رہتا تو مغربی پاکستان کی اسمبلی کا ممبر تو شاید بن ہی جاتا۔ مگر نہ ایوب خان رہے اور نہ ہی ایوب خان کی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن۔ 1968ء میں نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن والوں نے بھٹو کے ساتھ مل کر چھٹی کرائی تھی، پھر الیکشن ہوئے تھے اور پاکستان ٹوٹ گیا تھا۔ بھٹو صاحب کے وزیراعظم بنتے وقت میں بی اے کرکے لا کالج میں قانون پڑھ رہا تھا۔ اس وقت میں پیپلز پارٹی میں شامل ہوگیا تھا۔ ایل ایل بی تو جیسے تیسے میں نے پاس کرلیا تھا مگر وکالت کرنا بڑا مشکل تھا۔ میں کام کی تلاش کے ساتھ ساتھ پیپلز پارٹی کے آفس میں

کام کرتا تھا جس میں پیداگیری بھی ہوتی تھی۔ بہت سے لوگوں کے بہت سے کام کرائے تھے۔ میڈیکل انجینئرنگ کالج میں داخلے سے لے کر پلاٹوں کے الاٹمنٹ تک ہر کام کا کوئی نہ کوئی وزیر تھا اور پیسوں سے سارے کام ہو جاتے تھے۔ جس بلڈنگ میں میرا آفس ہے اس بلڈنگ کا وہ فلور میری ملکیت ہے۔ وہ بھی مجھے ایسے ہی ملا تھا۔ اس کے بلڈر کا سارا کام میں نے کرایا تھا۔ اس پلاٹ کا کمرشیلائزیشن، پھر اس کا نقشہ اور اس نقشے کے پاس ہونے کے بعد اس میں دو منزلوں کا اضافہ۔ کے ایم سی سے کے ڈی اے تک ہر جگہ یہ حال تھا اور ہر جگہ یہ کام ہو گیا تھا۔ میں اپنے دھندوں میں لگا ہوا تھا کہ پھر مارشل لا آگیا تھا۔ مارشل لا کے ساتھ ہی میں نے بھی پیپلز پارٹی چھوڑ دی تھی۔ فوجی حکومت میں تو بڑی آسانی ہو گئی تھی۔ فوجیوں کو تو کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ جلد ہی میری دوستی صحیح لوگوں سے ہو گئی تھی اور بیچ کے آدمی کی حیثیت سے میں نے بھی کافی کمایا تھا۔ یہ والا پلاٹ مجھے اسی زمانے میں کوڑیوں کے بھاؤ مل گیا تھا۔ اسی زمانے کی بات ہے ایک دن اخبار میں میں نے پڑھا تھا کہ سوئٹزر لینڈ میں ایک میٹنگ ہوئی ہے جس میں دنیا بھر کی بلیوں پر ہونے والے مظالم پر شدید غم و غصے کا اظہار کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں ایک تنظیم بنائی گئی ہے جو بلیوں کے حقوق کا تحفظ کرے گی اور اس سلسلے میں ساری دنیا میں کام کرے گی۔ میں نے ایسے ہی انھیں خط لکھ دیا تھا کہ میں بھی اس جدوجہد میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔ فوراً ہی مجھے جواب آگیا تھا کہ اس سلسلے میں ایک کانفرنس کا انعقاد ہو رہا ہے جس میں مجھے بھی بلایا گیا تھا۔ یہ میرا پہلا دورہ پاکستان سے باہر کا تھا۔ اس میٹنگ میں ایک بوڑھی خاتون جنھوں نے لاکھوں ڈالر اس مقصد کے لیے دیے تھے نے بڑی شاندار تقریر کی تھی۔ ان کی کہانی بھی خوب ہے۔

یہ کہہ کر وہ رکا اپنے اور میرے خالی گلاس کو ٹیچر اور برف سے لبریز کر کے پھر بولا کہ "یہ بڑی بی اپنی سیاحی کے دوران ہندوستان کے کسی پہاڑی علاقے میں پہنچ گئی تھیں وہاں انھوں نے دیکھا تھا کہ بچے اور بڑے سب شوق سے بلیوں کا کھیل کھیلتے ہیں۔ اس کھیل میں پانچ بلیوں کی دم کو سختی سے باندھ کر میدان میں چھوڑ دیا جاتا ہے اور جس کی بلی سب سے پہلے دم چھڑا کر یا تڑا کر بھاگتی ہے اسے انعام ملتا ہے۔ بلیوں کا یہ کھیل ان سے برداشت نہیں ہو سکا تھا۔ ہماری تنظیم کا یہ نشان وہیں سے آیا ہے یہ تیر ہم لوگوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ ہم دنیا کی تمام بلیوں کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ اس کانفرنس میں اسلامی اور ایشیا افریقہ کے ملکوں سے میں واحد نمائندہ تھا۔ مادام نے مجھے اپنے گھر خصوصی طور پر بلایا تھا۔ مجھے ابھی تک یاد ہے جینوا شہر سے تھوڑا باہر ایک بڑے سے ولا کے ایک بڑے سے ہال میں وہ اپنے کئی بلیوں کے درمیان کھڑی تھیں جب میں پہنچا تھا۔ یہ ہال میں لگی ہوئی تصویر اسی وقت کی تھی۔ کائنات کا سارا پیار ان کے چہرے پر عیاں

ہے جو صرف بلیوں کے لیے تھا۔ یہ تھیں ماما لوسی پوسی مریا۔ ان کا نام تو لوسی مریا تھا مگر بلیوں کی محبت کی وجہ سے انھیں ماما لوسی پوسی مریا کہا جاتا تھا۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ارب پتی شوہر کے مرنے کے بعد تمام دولت انھیں مل گئی تھی، جس سے انھوں نے بلی فاؤنڈیشن بنایا تھا۔ مجھے بہت اہمیت دی گئی تھی اور پھر میں نے بھی فیصلہ کرلیا تھا کہ اب زندگی بلیوں کی مد میں ہی گزاروں گا۔ اس علاقے کا ڈائریکٹر مجھے بنایا گیا تھا۔ میں نے بھی عقل مندی سے کام لیتے ہوئے اپنا آفس ادارہ تحفظ بلیاں کو کرائے پر دے دیا تھا اور وہیں سے ہی آپریٹ کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ رکا، دھیرے سے مسکرایا تھا اور چڑھی چڑھی آنکھوں کے ساتھ بولا تھا۔ "یار بلی ولی تو اپنی جگہ پر خیر ہے مگر ہوا یہ ہے کہ بہترین آفس ہے، بہترین تنخواہ ہے اور ہر سال کا بجٹ ہے اور بلیوں کے حقوق کا مسئلہ ہے۔ ساتھ میں دنیا گھومنے کو الگ ملتی ہے۔ زندگی مزے میں گزر رہی ہے اور مجھے نہیں لگتا ہے کہ میری زندگی میں بلیوں کا مسئلہ حل ہوسکے گا۔"

زندگی مزے میں ہی گزر رہی تھی۔ اس کا اکاؤنٹنٹ ہونے کے ناطے مجھے پتا لگ گیا تھا کہ یہ کام کبھی بھی ختم نہیں ہوگا۔ یورپ امریکا میں مرنے والے ارب پتی، کروڑ پتی لوگ اور پیٹ کے مسائل سے آزاد قومیں دنیا بھر کے بلیوں کتوں اور جانوروں کے لیے رقم دیتے رہیں گے اور زاہد جیسے پروفیشنل لوگ یہ کام خوب طریقے سے کرتے رہیں گے۔ ٹیچر کی آخری بوند کے بعد وہ محفل برخواست ہوگئی تھی۔

ایک دن شام کو زاہد کا فون آیا تھا کہ اب کام بڑھ جائے گا کیوں کہ یہ تنظیم دوسرے جانوروں کے حقوق کے لیے بھی کام کرے گی، پچھلی ڈائریکٹرز کی میٹنگ میں بڑے بحث و مباحثہ کے بعد اب ہمارے مینڈیٹ یعنی دائرہ عمل کو بڑھا دیا گیا ہے۔ کتوں سے غیر انسانی سلوک، گدھوں گھوڑوں کا استعمال اور دیگر جانوروں سے غیر معیاری رویہ قابل قبول نہیں ہے۔ یہ کہہ کر وہ رکا تھا، پھر بولا تھا کہ تمھارا بھی کام بڑھ جائے گا کیوں کہ میرا بجٹ تقریباً" تین گنا بڑھ جائے گا۔ مجھے ٹیلی فون کے دوسری جانب اس کے چہرے پر کھلی ہوئی مسکراہٹ صاف نظر آئی تھی۔ پھر یکایک وہ بولا تھا یار کیا کر رہے ہو۔ آجاؤ پول پہ کباب لگ رہے ہیں اور ٹیچر کی بوتل کھلی ہوئی ہے آؤ اور غم غلط کرو۔

میں بھی فارغ ہی تھا، فوراً" ہی ہامی بھر بیٹھا جب میں پہنچا تو وہ بڑے سے ڈرائنگ روم میں ماما لوسی پوسی مریا کی تصویر کے نیچے بیٹھا تھا۔ ماما لوسی پوسی مریا کا بلیوں کے لیے پیار اس کے چہرے پر عیاں تھا۔ یہ پیار ہی تو تھا کہ جس کی وجہ سے اس نے اپنی زندگی، جائیداد اور دولت ان بلیوں کے لیے تیاگ دی تھی۔ یہ آج کی دنیا کا عجب معاملہ ہے۔ وہ جن کے پاس بے انتہا دولت

تھی وہ کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں اور ان کے کچھ نہ کچھ میں بھی ہم لوگ اپنی ذاتی دنیاؤں کو آباد کر رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر زور سے چیخا' یار آگئے' آجاؤ آج خوشی کا دن ہے۔ ٹیچر کی بوتل کسی مہربان استاد کی طرح بڑے شاطر انداز سے مسکرا رہی تھی۔ بیتھوون کی پانچویں سمفنی بجنی شروع ہوئی تھی تاتاشاتا۔ تاتاتاشا۔ تاتاشاتا۔

ہم دونوں نے پینا شروع کردیا تھا جب پی پی کر بھوک لگی تھی تو نوکر نے خبر دی تھی کہ سوئمنگ پول پر کباب لگا دیے گئے ہیں۔ پھر یکایک وہ واقعہ ہوگیا تھا۔ ہم دونوں جب جھومتے ہوئے سوئمنگ پول پر پہنچے تو دیکھا تھا کہ ٹیبل پہ لگے ہوئے چکن تکوں سے ایک بلی بڑی انہماک سے شوق کر رہی تھی۔ زاہد زور سے چیخا۔ "حرام زادی۔" سووروں دیکھتے نہیں ہو' اس نے ایک نوکر کو آواز دی تھی اور زور کی لات بلی کو ماری تھی۔ بلی کے منہ سے چکن تکا الگ جاگرا تھا اور وہ ہوا میں چکر کھا کر سوئمنگ پول کے بیچ میں جاگری تھی۔

میرے سامنے یکایک ایمنسٹی انٹرنیشنل۔ ہیومن رائٹس کمیشن' انصاف برائے انسانی حقوق اور حق انسانیت کے بے شمار کارکن آگئے جو زاہد کے ساتھ کھڑے مجھے منہ چڑا رہے تھے۔

بلی سوئمنگ پول کے بیچوں بیچ غوطے کھا رہی تھی۔ زندگی اور موت کی کشمکش میں مصروف۔

بیتھوون کی پانچویں سمفنی دوبارہ شروع ہوگئی تھی تاتا تاشا۔ تاتا تاشا۔ تاتاشاتا--------

ٹوٹے ہوئے لوگ

روپ چند کو کراچی پہنچ کر امرتا رام پریتم داس روڈ پر عبدالرحمان سومرو کا گھر تلاش کرنا تھا۔ روپ چند کراچی میں ہی پیدا ہوا تھا۔ رحمان سومرو اس کے بچپن کا دوست تھا' دونوں ساتھ ساتھ ہی بڑے ہوئے تھے۔ روپ چند کے باپ خوب چند کی دوستی رحمان سومرو کے باپ الٰہی بخش سومرو سے تھی۔ دونوں شکارپور کے رہنے والے تھے۔ دونوں کی پشتیں شکارپور میں تھیں دونوں کی زمینیں شکارپور میں تھیں اور دونوں کے مکان کراچی میں بھی تھے۔ خوب چند کا کراچی میں کپڑوں کی آڑھت کا کام تھا اور الٰہی بخش کراچی کے سندھ مدرسے میں سندھی کا استاد تھا۔

پاکستان بننے سے پہلے روپ چند ٹاور کے قریب کٹرک بلڈنگ کے ساتھ دریا لال جیون داس بلڈنگ میں رہتا تھا اور رحمان سومرو امرتا رام پریتم داس روڈ کے ایک مکان میں رہتا تھا۔ اسے تو ایسا ہی لگا تھا کہ جیسے پاکستان یکایک بن گیا' پھر زندگی ایک عذاب ہو کر رہ گئی تھی۔ ہندوستان سے مہاجر کراچی آنے لگے تھے۔ آہستہ آہستہ زندگی کے غیر محفوظ ہونے کا احساس ہونے لگا تھا۔ ایسے ہی وقت میں جب ہندو مسلم فسادات کے فوراً بعد سارا پریوار ہندوستان جانے کو تیار بیٹھا تھا تو اس کی سولہ سالہ بہن کلپنا کا اغوا ہو گیا۔ زندگی جیسے رک گئی تھی۔ وہ تو چھوٹا تھا' آٹھ دس سال کی عمر بھی کیا ہوتی ہے۔ اسے تو یہی یاد تھا کہ ماں اور دادی کا رو رو کر برا حال ہو گیا تھا۔ خوب چند اور الٰہی بخش دن رات کلپنا کی تلاش میں لگے رہے تھے۔ پھر پتا لگا تھا کہ وہ حیدر آباد میں ہے اور اسے کلمہ پڑھا کر مسلمان بنالیا گیا ہے اور وڈیرے ستار جوکھیو کے بیٹے موسیٰ جوکھیو سے اس کی شادی ہو گئی ہے۔ وہ لوگ کلپنا سے مل بھی نہیں سکتے تھے۔ زندگی درد سے بھری ہوئی ایک طویل چیخ بن کر رہ گئی تھی۔ اس کے باپ نے سندھ دھرتی کی تھوڑی سی مٹی ایک شیشی میں بھرلی تھی۔ بوجھل دلوں کے ساتھ روتے ہوئے کیماڑی سے سمندر کے راستے وہ لوگ بمبئی چلے آئے تھے۔ پھر اس نے کبھی بھی ماں جی کو خوش نہیں دیکھا۔ ان کی ہنسی بھی جیسے

ایک طرح کی فریاد بن گئی تھی۔ دادی کلپنا کو یاد کرتے کرتے ایک دن مر گئی تھیں۔ ماں کی بات سچ تھی کلپنا اگر مرجاتی تو صبر آجاتا، مگر اس کا اغوا ہوا تھا، اسے زبردستی مسلمان بنالیا گیا تھا، اسے زبردستی نکاح میں لے لیا گیا تھا۔ بھولنے کی ہر کوشش رات کی سسکیوں میں بدل کر رہ گئی تھی۔

ایسا صرف ان کے ساتھ تو نہیں ہوا تھا۔ ہزاروں مسلمان ہندوستان سے پاکستان جاتے ہوئے قتل ہو گئے تھے۔ نہ جانے کتنی مسلمان عذراؤں اور زبیداؤں کو اغوا کرکے زبردستی کلپنا بنالیا گیا تھا اور وہ بھی کلپنا کی طرح کسی کے گھر میں بیوی یا باندی بن کر رہ گئی تھیں۔

بمبئی میں کلیان کے فوجی کیمپ میں دوسرے سندھی شرنارتھیوں کے ساتھ آکر وہ لوگ آباد ہوئے تھے۔ جلد ہی جگہ کا نام الھاس نگر ہو گیا۔ مہاراشٹر کی حکومت نے اپنی طرف سے سہولتیں پہنچائی تھیں، مگر مہاجر تو پھر مہاجر ہی ہوتا ہے۔ نہ زمین اپنی، نہ صوبہ اپنا، نہ زبان اپنی۔ مذہب بھلے ایک ہو، مگر مذہب میں شاید نفرت کو دبانے کی طاقت نہیں تھی۔ وہ سب لوگ سندھی ہی کہلاتے تھے اور ان سب لوگوں سے اگر کھلی نہیں، تو ڈھکی چھپی نفرت ہی کی جاتی تھی۔

روپ چند کے باپ خوب چند نے یہاں بھی کاروبار شروع کرنے کی کوشش کی تھی اور چھوٹی سی کپڑوں کی دوکان سے آگے نہیں بڑھ پایا تھا۔ کراچی کی بات اور تھی۔ شہر میں کاروبار تھا اور ہر سال شکارپور سے آنے والی زمینوں کی آمدنی تھی۔ الھاس نگر میں زندگی آسان نہیں، بہت مشکل تھی اور اس مشکل کا سامنا سارے مہاجروں کو کرنا پڑا تھا۔ کچے گھر، پانی کا مسئلہ، بجلی کا مسئلہ، بچوں کے پڑھنے کا مسئلہ، علاقے کا بھتہ، غنڈوں کا ٹیکس۔ سارے سندھی سندھ دھرتی کی مٹی کی بوتل کو دیکھ کر دل میں روتے تھے۔ کسی نے گھر میں سندھو دریا کا پانی رکھا ہوا تھا۔ کسی نے سندھ کے کھجور کی گٹھلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کسی نے کراچی کے مکان کی چابی رکھی ہوئی تھی۔ ایک تعلق تھا جو ٹوٹا نہیں تھا۔ کلپنا ان کی بیٹی تھی، اس کی بہن تھی، بچپن ساتھ ساتھ گزرا تھا۔ کلپنا نے اسے مارا بھی تھا، چوما بھی تھا۔ جھٹی مٹھی اس سے روٹھی بھی تھی، اسے منایا بھی تھا۔ اسے ایک مہربان چہرہ یاد تھا۔ ایک گرم گرم گود یاد تھی۔ اپنے چہرے پر بوسوں کی بارش یاد تھی۔ جب ماں جی اور پتا جی اسے ڈانٹتے تھے تو وہ کلپنا کی بانہوں میں چھپ جایا کرتا تھا۔ وہی کلپنا سندھ کے شہر حیدر آباد میں کہیں رہ رہی تھی، کسی مسلمان کے گھر میں اس کی بیوی بن کر، گھر میں باندی کی طرح، شاید مسلمان ہو کر وہ پچاس سال کے بعد اسی کلپنا کی تلاش میں کراچی آیا تھا۔

بمبئی میں زندگی نے بہت دھوکے دیے تھے۔ لاکھوں شرنارتھیوں کی طرح ان لوگوں کی زندگی بھی گزر گئی تھی۔ آزادی کے بعد جو بھی آئے، دہلی میں یا صوبے کی حکومت میں انھوں

نے سبز خواب جگائے تھے اور بھیانک تعبیریں دکھائی تھیں۔ یہ کیسا ہندوستان تھا' بھارت ماتا' گاندھی کا خواب' اشوکا کی حکومت' دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت' جہاں کروڑوں انسان روڈ پر بھوکے سوتے ہیں' ننگے رہتے ہیں' جن کے پیروں میں نہ چپل ہے اور جن کے بچوں کے ہاتھوں میں نہ قلم ہے نہ کوئی کتاب۔ جہاں لڑکیاں گڑ کی بوریوں اور چاول کی تھیلیوں کی طرح بیچ دی جاتی ہیں۔ چکلے بڑھتے ہی جارہے ہیں۔ تاج محل ہوٹل سے لے کر بمبئی کی کچی آبادیوں تک۔

اس نے سوچا تھا جب وہ رحمان سومرو سے ملے گا تو وہ اسے کیا بتائے گا' کیسے بتائے گا کہ پتاجی کی موت کیسے ہوئی تھی۔ دادی تو کلپنا کلپنا کا جاپ کرتی ہوئی اور مسلمانوں کو بددعائیں دے دے کر ایک دن خاموشی سے مرگئی تھی اور پتاجی کو کانتا کا غم لے مرا تھا۔ کانتا اس سے چھوٹی تھی۔ کلپنا کی طرح ہی خوب صورت' چنچل' نٹ کھٹ' گھر کے غم زدہ ماحول میں ایک رحمت کے فرشتے کی طرح تھی۔ اس کا چلنا جیسے جلترنگ تھا۔ اس کی باتیں جیسے گیتا کے بول۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اجنتا کے غاروں میں کسی ناری کی تصویر میں جان پڑگئی ہو اور وہ چھم سے ان کے آنگن میں اتر آئی ہو۔

اسے ہر ایک کا پیار ملا تھا۔ الہاس نگر کی غربت اور روزمرہ زندگی کی کشمکش میں پتاجی نے ماتا جی اور خود اس نے کانتا کو سب کچھ دیا تھا۔ کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ غریب ہیں' اچھے اسکول میں پڑھایا تھا' اچھے کپڑے پہنائے تھے اچھے کالج میں داخلہ دلایا تھا۔ پھر اس نے تو ایک لوہے کی دیوار کی طرح اس کی حفاظت کی تھی۔ شراب پی کر مست ہوجانے والوں سے کانتا کو بچانا آسان نہیں تھا' روزانہ کی جدوجہد تھی۔ اس کی خوب صورتی سارے پریوار کے لیے مسئلہ بن گئی تھی۔ اس کے لیے رشتے کی ہی تلاش تھی کہ یکایک یہ سب کچھ ہوگیا تھا۔ وہ کالج کے کسی لڑکے کے ساتھ چلی گئی تھی' بمبئی کی فلم انڈسٹری میں کام کرنے کے لیے۔ نہ جانے کیا ہوا تھا' نہ کوئی بات' نہ کوئی چیت۔ نہ کوئی بحث نہ کوئی مباحثہ۔ ان لوگوں نے تو ایسا سوچا بھی نہ تھا۔ اس نے شاید خود ہی سوچ لیا تھا کہ گھر والے ستیش کی ذات برادری میں اس کی شادی کبھی بھی نہیں کریں گے۔ ستیش نے پیار کی قسمیں کھائی ہوں گی' بولی وڈ کے قصے سنائے ہوں گے اسے' اس کے حسن سے آشنا کیا ہوگا' اسے سمجھایا ہوگا کہ زندگی بہت سندر ہوسکتی ہے۔ بمبئی میں ہی سمندر کے کنارے خوب صورت سا گھر بھی ہوسکتا ہے۔ بس کسی طرح فلمی دنیا میں پہنچنے کی دیر ہے۔ وہ تھی ہی اتنی خوب صورت کوئی بھی اسے بہکا سکتا تھا۔

زندگی نے بہت جلد بہت سخت پرانی چال دوہرائی تھی۔ اس دفعہ کراچی نہیں تھا' الہاس نگر تھا۔ پاکستان نہیں تھا' ہندوستان تھا۔ کوئی مسلمان نہیں تھا' ہندو تھا۔ ابھی سنبھل ہی نہیں پائے

تھے کہ پھر باپ بیٹا کانتا کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔
بمبئی حیدر آباد نہیں تھا اور بمبئی میں الٰہی بخش بھی نہیں تھا۔ نہ جانے وہ کہاں چلی گئی تھی
اسے آسمان کھا گیا تھا یا زمین نگل گئی تھی۔ وہ دونوں کام کرتے تھے اور کانتا کو تلاش کرتے تھے۔
نہ جانے پولیس والوں نے کتنے ہی روپے کھالیے تھے' ایک دن اس نے کانتا کو دیکھا بھی تھا۔
ایک بڑی سی گاڑی میں ایک عربی کے ساتھ۔ وہ دیوانوں کی طرح دوڑا تھا۔ اس ہوٹل کے چپے
چپے میں اس نے شور مچایا تھا' پھر اس نے کانتا کے کالج کے دوست ستیش کو دیکھا تھا جس نے
اسے پولیس کے حوالے کردیا تھا۔ پولیس والوں نے اسے خوب مارا تھا۔ گاندھی جی اور نہرو جی
کی تصویر کے سامنے اسے ننگا کر کے ادھ موا کردیا تھا۔
"حرام زادے .... جانتے نہیں ہو' ستیش کون ہیں؟ نیتا جی کے بیٹے ہیں۔ ان پر الزام لگاتے
ہو۔ تمھاری رنڈی جیسی بہن کو یہ اغوا کریں گے۔ ارے ان کو کمی کاہے کی ہے۔ ساری سرکار
ان کی ہے۔ سارا علاقہ ان کا ہے۔ دہلی سے بمبئی تک ان کا کام ہے۔ وزیر اعلیٰ سے وزیر اعظم
تک ان کی رسائی ہے۔"
اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ دہلی سے بمبئی تک ان کا کیا کام تھا۔ لڑکیوں کا اغوا۔ فلمی دنیا کا مافیا۔
بڑے بڑے ہوٹلوں میں دلالی۔ بیٹا چھوٹا دلال' باپ وزیر تھا' بڑا دلال تھا۔
بڑی مشکلوں سے ہزاروں روپوں کا بندوبست ہوا تھا اور خوب چند نے پولیس والوں کو
رشوت دے کر روپ چند کو آزاد کرایا تھا۔
پھر انھیں کانتا کی لاش ملی تھی۔ اس نے خود کشی کرلی تھی۔ وہ لوگ لاش لے کر بھی نہیں
آسکے تھے۔ لاش اس قابل ہی نہیں تھی۔ انھیں تو کانتا کا خط ملا تھا جو اس کی کسی دوست نے
اس کے کہنے کے مطابق مرنے کے بعد انھیں بھیجا تھا۔ اس نے معافی مانگی تھی۔ اس سے دھوکا
ہوا تھا۔ ستیش نے اسے اغوا کر کے شادی کا ڈھونگ رچایا تھا اور پھر اسے صرف استعمال کیا تھا اور
ایک دن وہ سمجھ گئی تھی کہ آگے کا راستہ بولی وڈ کو نہیں بمبئی کے چکلے کو جاتا ہے اور پیچھے تو اب
صرف دیوار ہی تھی۔ اس نے پتا جی سے' ماتا جی سے اور اس سے معافی مانگی تھی۔ گھر میں جیسے
میت ہوگئی تھی۔ ہر کوئی جی بھر کے رویا تھا اور پتا جی خاموشی سے روتے روتے فالج کی نذر
ہوگئے تھے۔
اٹھارہ دن اس کی زندگی کے سرکاری ہسپتال میں ٹھوکریں کھا کھا کر گزرے تھے۔ گھر پر پہلے
ہی بہت قرض تھا' پھر پتا جی کی بیماری' ہسپتال میں تو کچھ نہیں ملتا تھا۔ کاغذ کے پرزے ملتے تھے۔
یہ دوا لاؤ' وہ دوا لاؤ' خون کی بوتل' گلوکوز کی بوتل' پیشاب کی تھیلی' پیشاب کی نالی' منہ کا ٹیوب'

خون کا ٹیسٹ، ایکسرے، انھوں نے سسک سسک کر جان دے دی تھی۔ آخری وقت میں سندھی ایسوسی ایشن کے کچھ لوگوں نے مدد کی تھی، مگر یہ مدد بھی ایسی ہی تھی جس سے تکلیف دہ زندگی کے ختم ہونے میں کچھ مزید دن لگ گئے تھے۔

پتا جی کے مرنے کے بعد وہ ماتا جی کے گلے لگ کر زار زار رویا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ وہ کبھی بھی کانتا کو معاف نہیں کرے گا۔ نہ اس جنم میں اور نہ کسی اور جنم میں۔ اس نے اس کے لیے جنم جنم کی بددعا دی تھی۔ اس نے ہندوستان کے اس نظام کو بددعا دی تھی جس میں لڑکیوں کو اغوا کر کے طوائف بنا دیا جاتا ہے، اس نے ان لوگوں کو بددعا دی تھی جنھوں نے ہندوستان کو تقسیم کر کے اس کے پورے خاندان کو ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ اس نے اپنے باپ کے سرہانے پڑی ہوئی شیشی کو اٹھا کر چوما تھا جس میں سندھ دھرتی کی میلی میلی مٹی سونے کی طرح چمک رہی تھی۔

پتا جی کے مرنے کے بعد اس نے جی جان سے دکان پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ ماتا جی کے کہنے پر پاروتی سے اس کی شادی بھی ہو گئی تھی۔ زندگی نے ایک تھوڑی دیر کے لیے سکھ کا سانس لیا تھا، پھر نہ جانے کیوں اٹھتے بیٹھتے ماں جی کلپنا کے خواب دیکھنے لگی تھیں، ان کی بیٹی کلپنا، اس کی بہن کلپنا زندہ تھی۔ سندھ کے شہر حیدر آباد میں نہ جانے کیسی تھی۔ کتنے اس کے بچے تھے، مسلمان ہونے کے بعد خوش تھی کہ ناخوش۔ وہ لوگ اکثر اس کی باتیں کرتے تھے۔

ایک دن پاروتی کے کسی رشتہ دار نے خبر دی تھی کہ وہ لوگ پاکستان گئے تھے، حیدر آباد میں کلپنا سے ملے تھے۔ اسے الہاس نگر والوں کا کچھ پتا نہیں تھا۔ پاروتی والے نواب شاہ کے رہنے والے تھے۔ نواب شاہ جانے کی جلدی میں کلپنا سے زیادہ خبر نہ لے سکے تھے۔ اس نے اپنی روتی ہوئی ماں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ پاکستان جائے گا، ایک بار پھر کلپنا کو تلاش کرے گا، اس کی خبر لے گا۔ اس نے دل میں سوچا تھا کہ ماں جی کے مرنے سے پہلے شاید انھیں وہ کوئی اچھی خبر دے سکے۔ کاش وہ ایسا کر سکتا۔

دہلی جا کر پاکستانی سفارت خانے سے ویزا لینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ رشوت اور فارم کی فیس ملا کر پورے پانچ ہزار روپے خرچ ہوئے تھے، تو کراچی حیدر آباد کا ویزا ملا تھا۔ شکارپور کا ویزا منع ہو گیا تھا۔ دہلی میں پاکستانی سفارت خانے کے باہر مسلمانوں، ہندوؤں کا ہجوم تھا، بکھرے ہوئے لوگ، بچھڑے ہوئے لوگ، ٹوٹے ہوئے لوگ اور ہر کوئی رشوت دے رہا تھا، اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے۔ ایک سزا تھی جو پوری کرنی تھی۔

رمیش چاچا نے اسے بتایا تھا کہ بندر روڈ پر سندھ زمیندار، سندھ جاگیردار ہوٹل ہے اور

میکلوڈ روڈ پر بمبئی ہوٹل ہے جہاں ٹھہرا جاسکتا ہے۔ کراچی میونسپل کارپوریشن کے سامنے مندر ہے اور مسافر خانہ، کلفٹن اور گارڈن پر بھی مندر ہے جہاں کچھ جاننے والوں کے فون نمبر انھوں نے دیے تھے، مگر روپ چند کا خیال تھا کہ وہ عبدالرحمان سومرو کا پتا چلائے گا۔ اسے ابھی تک بچپن کا وہ سومرو یاد تھا۔ املی کا وہ درخت جس کی ٹھنڈی چھایا کے نیچے وہ لوگ کھیلتے تھے، لڑتے تھے، جھگڑتے تھے اور پھر کھیلنے لگتے تھے۔

شاید اس کی قسمت اچھی تھی۔ اتنے بڑے شہر کراچی میں جہاں امرتا رام پریتم داس روڈ کھو گیا تھا۔ جہاں پرانی ہوادار اونچی چھت والی پتھروں کی بلڈنگوں کی جگہ پر بمبئی کی طرح سیمنٹ کے جنگل گھر بن گئے تھے، وہاں اسے سندھ مدرسے میں جاکر ماسٹر الٰہی بخش کے گھر کا پتا مل گیا تھا۔ وہ ایمپریس مارکیٹ کے سامنے ایک عجیب سی بلڈنگ کی چھٹی منزل کے فلیٹ میں رہ رہے تھے۔

روپ چند کو ایمپریس مارکیٹ یاد تھی۔ بچپن کی ایمپریس مارکیٹ کراچی کی خوب صورت ترین جگہ تھی۔ وہ پتا جی کے ساتھ کئی دفعہ یہاں ٹرام پر بیٹھ کر آیا تھا۔ کیماڑی سے آنے والی ٹرام بندر روڈ سے ہوتی ہوئی گارڈن روڈ سے مڑ کر ایمپریس مارکیٹ آتی تھی۔ ایمپریس مارکیٹ پر ٹرام بدل کر کینٹ اسٹیشن جایا جاسکتا تھا۔ ایمپریس مارکیٹ سے ہی ٹرام کے ذریعے سولجر بازار، گاندھی گارڈن جاسکتے تھے۔ چاکیواڑہ اور لی مارکیٹ کی ٹرامیں بندر روڈ پر نیپیئر روڈ کے راستے سے ملتی تھیں۔ وہ نریندر ناتھ جگن داس ودیلا۔ این جے وی اسکول کا پڑھا ہوا تھا اور ٹراموں میں بھی آنا جانا ہوتا تھا۔ ایمپریس مارکیٹ کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر دیکھنے سے جہاں پارسیوں کا آتش کدہ نظر آتا تھا، وہاں دور کینٹ اسٹیشن بھی نظر آتا تھا۔ صاف ستھری سڑکیں، گھنٹی بجاتی ہوئی ٹرامیں، گھوڑا گاڑی پر آنے والے گورے گورے یوروپین اور کراچی کے پارسی، ہندو، یہودی اور کرسچنوں کا ایمپریس مارکیٹ میں ہجوم، وہ پرانا منظر اس کی نظروں کے سامنے آیا۔ دور کہیں ٹرام کی آواز، نہ کوئی دھواں نہ کوئی ہاکروں کی غیر قانونی تجاوزات، نہ لوگوں کا ہجوم اور نہ ہی کوئی جھگڑا۔ پرانا منظر نئے منظر میں مل کر بے اختیار سا ہو گیا تھا۔ روپ چند نے سوچا تھا جیسے کراچی مر گیا ہے، کراچی مٹ گیا ہے۔ اس کے خاندان کے ساتھ کراچی بھی اجڑ گیا ہے۔

عبدالرحمان سومرو ویسا ہی تھا جیسا اس نے سوچا تھا۔ اس کے بتانے پر وہ دونوں گلے ملے تھے۔ بڑی محبت سے اسے گھر میں بٹھایا گیا تھا۔ کچھ پرانی باتیں ہوئی تھیں، کراچی میں گزرے ہوئے بچپن کے دن، نہ سومرو نے اس سے اس کے پتا جی کا پوچھا تھا اور نہ اس نے ماسٹر الٰہی بخش کے بارے میں کوئی سوال کیا تھا۔

حیدرآباد میں کلپنا کو تلاش کرنے میں زیادہ مشکل نہیں ہوئی تھی۔ سومرو اور روپ چند

کراچی سے حیدر آباد بس پر گئے تھے۔ بس صدر کے علاقے سے نکلی تھی ہوتی ہوئی حیدر آباد پہنچی تھی۔ دونوں شہر تقریباً ایک جیسے تھے۔ اسے تو ایسا ہی لگا تھا جیسے وہ ہندوستان میں گھوم رہا ہو۔ وہی فقیر' وہی گانے' یہاں خدا کے نام پر مانگ رہے تھے۔ وہاں رام کا نام چلتا ہے' یہاں نعت گا رہے تھے' وہاں بھجن پڑھتے ہیں۔ وہی ٹوٹی ہوئی سڑکیں' دھوئیں سے بھرا ہوا ماحول' پانی کا رونا' بجلی کی کمی' دھتکارے ہوئے غریب' ذلتوں کی مارے لوگ۔ کچھ بھی فرق نہیں تھا اور اگر تھا تو کوئی خاص نہیں تھا۔

وہ کلپنا کے بڑے سے گھر میں اس سے ملا تھا۔ اس کا نام اب کلثوم تھا۔ اس کے جوان جوان بچے تھے۔ اس کی بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے جیسے اس کی ماں کا چہرہ آگیا تھا۔ بڑا اس کا دل چاہا تھا اس کے پیروں کو چھوئے' اس کے ہاتھوں کو چومے' اس کے سینے سے لگ کر رو دے۔ "دیدی میں ہوں روپ چند۔ تیرا بھائی۔" وہ بس اتنا ہی کہہ سکا تھا۔ بڑے دن گزر گئے تھے' بہت فاصلہ تھا' مہینوں اور برسوں کا۔ بیتے ہوئے سپنوں کا' کھوئے ہوئے رشتوں کا اور اب تو مذہب کا فاصلہ تھا جو انھیں کھینچ کر دو الگ الگ کناروں پر لے گیا تھا۔

اس نے اسے بتایا تھا کہ "دادی مر گئی ہے' پتا جی مر گئے ہیں' کانتا بھی مر گئی ہے۔" رک رک کر ساری کہانی سنائی تھی۔ آنسوؤں کی لڑی تھی جو بہہ رہی تھی' کلپنا روتی رہی سنتی رہی۔

پھر کلپنا نے بتایا تھا کہ موسیٰ جوکھیو کی اب دو اور بیویاں ہیں۔ ایک اسلام آباد میں ہے جب کہ دوسری کراچی کے کلفٹن میں۔ اسے خرچ مل جاتا ہے اور اب تو بچے بھی بڑے ہو گئے ہیں۔ اغوا ہونے کے بعد موسیٰ نے شادی زبردستی کی تھی۔ مگر شروع کے آٹھ سال تک شوہر اچھا تھا' پھر آہستہ آہستہ بدل گیا تھا۔ اپنے باپ کے ساتھ سیاست شروع کی تھی۔ وہ حیدر آباد میں رہتی تھی اور وہ کبھی کراچی میں اور کبھی زمینوں پر۔ پھر فوجی حکومت میں تو وہ بڑا آدمی بن گیا تھا۔ کراچی میں' لاہور میں' پنڈی میں' اسلام آباد میں مکان تھے۔ دو بیویاں مر چکی تھیں اور دو بیویاں اور موجود تھیں۔ میں نے ایک دفعہ بچوں کے نام پر شور کیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ یاد رکھنا دو بیویاں مر چکی ہیں تیسری بھی مر جائے گی تو کیا بگڑ جائے گا۔ مجھے پتا لگ گیا تھا کہ میری اوقات کیا ہے۔ کلپنا سے کلثوم تک ایک کہانی ہے' ایک قصہ ہے۔ اب وہ کہتی رہی تھی وہ روتا رہا تھا۔

پھر وہ لوگ جدا ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے مسلمان بھانجوں کو پیار کیا۔ کلپنا کو آخری دفعہ دیکھا تھا۔ کلپنا نے کہا تھا "ماں جی کو بتانا میں خوش ہوں۔ بچے بھلے مسلمان ہیں' میں وہی ہوں' کلپنا۔ بھگوان سے پراتھنا کرنا میرے لیے۔" اس نے جھک کر کلپنا کے قدم آخری دفعہ چھو لیے۔

روپ چند کا دل پھر زور سے دھڑکا۔ کیا ہوگیا ہے، کس جنم کے گناہوں کی سزا ہے۔ سرحد کے اس طرف بھی اس پار بھی، ہندوستان میں بے روزگاری، پاکستان میں غربت۔ کبھی بابری مسجد جل جاتی ہے کبھی یہاں مندر ڈھائے جاتے ہیں، وہاں اگنی اور پرتھوی میزائل بنتا ہے۔ یہاں غوری بنتا ہے۔ وہاں کے محلوں میں بیٹھے ہوئے لوگ یہاں کے محلوں میں سمٹے ہوئے ہدف اور غوری بنتا ہے۔ وہاں کے محلوں میں بیٹھے ہوئے لوگ یہاں کے محلوں میں سمٹے ہوئے لوگوں سے بابر، غوری، پرتھوی اور اورنگ زیب کی جنگ لڑرہے ہیں اور ہم لوگ زندگی کی جنگ لڑرہے ہیں۔ زندہ رہنے کی جنگ ایسی شدید ہوگی کس نے سوچا تھا۔

سومرو کے ساتھ بوجھل قدم لیے ہوئے روپ چند کراچی لوٹا تھا۔ صدر کے اس فلیٹ میں گھر میں داخل ہوتے ہی وہ بڑے میاں نظر آئے تھے، ماسٹر الٰہی بخش سومرو کے بابا جی۔ وہ چیخ رہے تھے، مرگئے، مرگئے، سب مرگئے۔ رحمان بھی مرگیا، ہائے ہائے۔

رحمان کو دیکھتے ہی جیسے ان کو چپ سی لگ گئی تھی۔ وہ اٹھے اور آہستہ آہستہ رحمان کو گلے لگایا اور خاموشی سے اندر چلے گئے، نہ اس کی طرف دیکھا تھا اور نہ ہی کوئی بات کی تھی۔

یہ بابا جی تھے، روپ چند۔ اب تو یہی حال ہوگیا ہے۔ ایک دن بھی اگر میں گھر سے غائب ہوجاتا ہوں تو یہ اسی طرح چیخنے چلاتے رہتے ہیں۔ ایک دن حیدر آباد میں سندھیوں نے مہاجروں کے گھروں کو آگ لگا دی تھی، بہت سارے مہاجر مرگئے تھے۔ کوئی جل گیا تھا اور کوئی گولی کا نشانہ بنا تھا۔ اس کے دوسرے دن میرا چھوٹا بھائی اور چاچا ٹھٹھے سے آرہے تھے تو مہاجروں نے بس کو روک کر سارے سندھیوں کو مار ڈالا تھا۔ ان کی لاشیں پہنچی تھیں، تب سے بابا ایسے ہی ہوگئے ہیں۔ میں اگر نہ ہوں تو چیختے رہتے ہیں لیکن تیرے ساتھ تو مجھے جانا تھا۔ ابھی ٹھیک ہوجائیں گے۔ لوگ تو مرتے ہی رہتے ہیں۔ یہ کہہ کر سومرو خاموش ہوگیا۔ جیسے کہنے کے لیے کچھ نہ ہو۔

وہ دل کہاں سے لاؤں

کون سی پیتے ہو؟ بوڑھے نے جمائی لے کر کہا تھا۔ میری ملاقات اس سے ہیتھ رو ایئرپورٹ پر ہوئی تھی۔ میں کینیڈا سے لندن کے راستے کراچی جا رہا تھا' وہ لندن سے ہانگ کانگ جا رہا تھا۔ دبئی تک ہم دونوں کی مشترکہ فلائٹ تھی دبئی سے مجھے کراچی چلا جانا تھا اور اس کو ہانگ کانگ۔ ہم دونوں فرسٹ کلاس لاؤنج میں ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ مجھے تو میری کمپنی نے ٹکٹ دیا تھا اور ہم لوگ ہمیشہ فرسٹ کلاس میں ہی سفر کرتے تھے۔ فرسٹ کلاس کی عیاشی کا مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا جب تک میں اس کلاس میں بیٹھا نہیں تھا۔ اپنے خرچے پر تو میں ہمیشہ اکانومی کلاس میں ہی سفر کرتا تھا فرسٹ کلاس کے مقابلے میں ہوائی جہاز کا اکانومی کلاس ایسا ہی تھا جیسے تھرڈ کلاس کا ڈبہ۔ قریب قریب کی سیٹیں اس کے اوپر شور و غوغا۔ فرسٹ کلاس کی سیٹیں کشادہ ہوتی ہیں' آگے پیروں کو پھیلانے کی بے شمار جگہ' کھانا مینو کے چوائس پر ملتا ہے اور بے شمار شراب۔ پوری دنیا کلاسوں میں بٹی ہوئی ہے اور ہر جگہ فرسٹ کلاس کی اور بات ہے۔ اورنگی ہو کہ ڈیفنس' لیاری ہو کہ کلفٹن اور ہوائی جہاز ہو کہ سینما ہال۔ کلاسوں کا یہ نظام بہت جلد میری سمجھ میں آگیا تھا۔

ہم دونوں ہی فرسٹ کلاس کے لاؤنج میں بیٹھے سنگاپور ایر لائنز کی پرواز کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ میرے برابر میں آکر بیٹھ گیا تھا۔ ساٹھ پینسٹھ سال اس کی عمر ہوگی کراچی میں تو بوڑھا ہی کہلاتا۔ سرخ و سفید رنگ' جاذبِ نظر شخصیت میں کچھ تھا کہ میں خود ہی اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ جاوید احمد خاں نام تھا اس کا۔ اس کے کارڈ پر یہی لکھا تھا ساتھ ہی ایڈنبرا کی کسی انڈسٹری کا نام جس کا وہ مینیجنگ ڈائریکٹر تھا۔

اسکاچ ود روک ٹین نے کہا تھا اس نے انگلی کے اشارے سے ویٹرس کو بلایا اور مزید شراب کا آرڈر دیا تھا۔ ہم لوگ کافی دیر سے پی رہے تھے۔ چیک اِن ہونے کے بعد جب سوار ہونے کو

تیار تھے کہ کسی وجہ سے جہاز تین گھنٹے کے لیے روک لیا گیا تھا۔ جاوید خان صاحب خود ہی میرے پاس آکر بیٹھے تھے۔ ان کے اجلے رنگ میں بھی جو مشرقیت شامل تھی اس سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ پاکستان ہندوستان کے ہی ہوں گے۔ میں سمجھا تھا کہ شاید پٹھان ہوں گے اور کارڈ پر بھی خان ہی لکھا ہوا تھا مگر وہ پٹھان نہیں تھے۔ بہاری تھے' بہار کے پٹھان۔ میرا نہیں خیال تھا کہ بہار میں بھی خان ہوتے ہوں گے۔ میرے جاننے والوں میں اور میرے دوستوں میں جو بھی بہاری تھے وہ کالے تھے چھوٹے قد کے' دبلے پتلے لوگ۔ میں نے شاید پہلی دفعہ کس خوب صورت بہاری کو دیکھا تھا۔ میں اپنے اس تعجب کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

وہ زور سے ہنسے۔ نہیں' ایسا نہیں ہے بہار میں بھی ہر ساخت کے لوگ مل جائیں گے' میں بھی سمجھ لو عام ساخت سے الگ ہوں اور اب تو برسوں سے ایڈنبرا میں رہتا ہوں۔ اسکاٹ لینڈ کا ہوا پانی شاید کچھ زیادہ ہی اچھا ہے۔ میں نے بھی دل میں سوچا تھا کہ اسکاٹش بھی تھوڑے تھوڑے بہاری ہی ہوتے ہیں' یہ خوب رچ بس گئے ہوں گے ان لوگوں میں۔ انھوں نے میرے خالی ہونے والے گلاس کو دیکھ کر اپنے لیے اور میرے لیے منگوانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ہم دونوں نے جام ٹکرا کر گھونٹ بھرے' پھر انھوں نے کہا کہ جب مجھے والدین نے علی گڈھ یونیورسٹی پڑھنے بھیجا تھا تو وہاں بھی یہی ہوا تھا۔ پہلے ہی دن دوسروں نے مجھے بہاری کہہ کر مذاق اڑایا تھا مگر میں بھی خاموش نہیں بیٹھا تھا۔ اس وقت صرف انیس سال عمر تھی میری اور خون بہت گرم۔ میں نے مرزا نجیب کا ہاتھ اس وقت تک نہیں چھوڑا تھا جب تک اس نے معافی نہیں مانگی تھی۔ اس کے بعد سارے ہی یو پی والے خاموش ہو گئے تھے اور میں نے اپنی عزت منوالی تھی۔ وہ مسکرائے پھر بولے کہ ایسا ہے کہ بہاری بہار سے تو نکل جاتا ہے اور کہیں بھی جا کر بس جاتا ہے' مگر بہار بہاری سے نہیں نکل سکتا ہے۔ میرا بھی وہی خیال تھا جو جاوید صاحب کا تھا۔ کراچی میں میں جتنے بہاریوں کو جانتا تھا وہ سب تھے تو کراچی میں مگران کے اندر کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی بہاری چھپا ہوا تھا۔ میں نے ہنس کر انھیں بتایا تھا وہ مسکرائے تھے "اچھا تو تم کراچی میں رہتے ہو؟ میں بھی کبھی اس شہر میں رہتا تھا اب تو میں نے سنا ہے سب کچھ بدل گیا ہے' کراچی بڑا ہو گیا ہے پھیل گیا ہے اور نہ جانے کیا کیا ہو گیا ہے اور سنا ہے بہت کچھ ہوتا ہے وہاں پر۔" میں سمجھ گیا تھا وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

کب سے کراچی نہیں گئے ہیں آپ؟ میں نے بات جاری رکھنے کے لیے پوچھا تھا۔

چالیس سال سے زیادہ ہو گیا ہو گا۔ ایک دفعہ جب نکلا تو پھر کراچی واپس نہیں گیا۔ اصل میں کراچی میں کچھ رہا نہیں تھا۔ ایک بہن اور ایک پھوپھی ہندوستان میں رہ گئے ہیں۔ کبھی کبھار

بہن کی شادی پھوپھی زاد سے ہو گئی تھی اور ان کے پورے خاندان نے پاکستان نہ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا ہم لوگ کھاتے پیتے لوگ تھے۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کراچی ایئرپورٹ پر ایک پٹھان پولیس والا ملا تھا جس نے زور سے السلام علیکم کہا تھا۔ وہ پاکستان میں پہلا سلام تھا جو میرے ذہن پر چپک کر رہ گیا ہے۔ پھر تھوڑے دنوں میں ہی سولجر بازار کے علاقے میں ایک ہندو کا چھوڑا ہوا بڑا سا مکان ہم لوگوں کو مل گیا تھا۔ میں تو پہلے دن سے ہی کراچی کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ چھوٹا سا صاف ستھرا شہر جہاں درختوں کا سایہ نہیں تھا۔ مٹی کی پھوار تھی اور دلوں کی گرمی تھی۔ مجھے یاد ہے ہم لوگ اپنے کسی عزیز سے ملنے ٹینری روڈ پر بہار کالونی گئے تھے اور چاکیواڑے سے گزرتے ہوئے زندگی میں پہلی دفعہ ہم نے مکرانی لوگ دیکھے تھے۔ کالے چہرے' گھنگریالے بال اور سفید دانت۔ وہ لوگ مہاجروں کو پناہ گیر کہتے تھے۔ کچھ بہاریوں نے جس کا بہت برا منایا تھا۔ مگر یہ بعد میں پتا لگا تھا مکرانی زبان میں پناہ گیر بھی ایک معزز لفظ ہے۔ اس وقت کا کراچی ایک طرح کا melting point تھا۔ ساری دنیا کے لوگ کراچی آ رہے تھے۔ ہر طرح کی صلاحیت والے' ہر طرح کے کام کرنے والے مگر جلدی سب کچھ کھو گیا تھا۔ معزز بہاریوں' بارسوخ میمنوں' سمجھ دار حیدر آبادیوں نے اپنے اپنے علاقے کے لوگوں کے نام پر کالونیاں اور سوسائٹیاں بنائیں جہاں جاننے والے والوں کو چھوٹے چھوٹے پلاٹ دیے اور اپنے خاندانوں کو عزیزوں کو ایکڑوں کے حساب سے نوازا۔ اور غریب آدمی لیاری اور کھارادر میں ہی رہ گیا۔ بے ایمانی جب اوپر سے شروع ہوئی تو سلسلہ دور تک چلتا چلا گیا تھا۔ میرے والد شریف انسان تھے' وہ پاکستان کی اس ابتدا پر کڑھتے رہتے تھے' تم کو تو شاید پتا نہیں ہو گا کہ کراچی میں پرنس اسٹریٹ کہاں ہے؟ میں تمھیں بتاتا ہوں سول ہسپتال کے پاس پرنس اسٹریٹ ہے اسی پر کراچی یونیورسٹی تھی جہاں ہندو' پارسی' عیسائی اور مسلمان سب پڑھتے تھے اور پڑھانے والوں میں بھی ان کی بہت ساری تعداد تھی۔ میرے والد صاحب نے وکالت شروع کر دی تھی۔

یونیورسٹی میں اچھا وقت گزرتا تھا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ وائس چانسلر کون تھا مجتبیٰ کریم' حلیم یا مرزا اختر حسین' مگر جو بھی تھا یونیورسٹی میں پڑھائی ہوتی تھی۔ سخت محنت کرنی پڑتی تھی اور اس کے بعد ہم خوب گھومتے تھے۔ کیفے جارج یا فریڈرک کیفے ٹیریا میں خاص قسم کی پلیٹوں میں جو ایک کے اوپر ایک ننھی ہوتی تھیں اور ان میں بیٹیز اور پیسٹری پیش کی جاتی تھی۔ یہ تو ایک خاص قسم کی عیاشی ہوتی تھی۔ اس کے بعد کیپیٹل' رٹنر' پیراڈائز اور پیلس سینما میں فلمیں دیکھی جاتی تھیں۔ شام کے وقت وکٹوریہ روڈ اور الفنسٹن اسٹریٹ پر جب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلتی تھیں تو لگتا تھا کہ قدرت کا سارا حسن زمین پر اتر گیا ہے۔ جاوید صاحب بولتے بولتے مسحور

سے ہو گئے تھے۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے ان کے دل میں بہار اور دل کے اوپر کراچی ہے۔ انھوں نے رک کر آخری گھونٹ سے اپنا گلا صاف کیا تھا اور میں نے ان کے لیے ایک اور جام منگایا تھا۔

وہ تھوڑے سے مسکرائے پھر کہا تھا کہ میں نے زندگی کا پہلا بیئر کراچی میں ہی پیا تھا۔ میرے ساتھ بمبئی کا ایک لڑکا تھا۔ عبدالرحیم نام تھا اس کا۔ دلیپ کمار جیسی شکل تو نہیں تھی اس کی لیکن بال چال اور ڈھال بالکل دلیپ کا ہی تھا۔ اب تو ٹورنٹو میں بڑی جائیدادیں ہیں اس کی اور وہاں بھی رچ بس گیا ہے وہ مجھے بیئر پلانے کے چکر میں رہتا تھا اور میں نہ نہ کرتا تھا ایک دن صدر کے پرشین ریسٹورنٹ میں پیٹیز کھانے کے بعد ہم لوگ گپیں ہانک رہے تھے کہ رحیم نے کہا چلو تمھیں بیئر پلاؤں اور نہ جانے میں کیوں راضی ہو گیا تھا۔ فریڈرک کیفے کے پیچھے ایک بار تھا۔ اچھا سا نام تھا اس کا مگر سامنے سڑک پر ہونے کی وجہ سے میں گھبرا گیا تھا کہ کوئی اندر جاتے ہوئے دیکھ نہ لے۔ رحیم نے فوراً" اس کا بھی حل نکال لیا تھا اور مجھے لے کر ہوٹل ایکسلیئر آگیا تھا۔ یہ میرے زمانے کے کراچی کا موڈرن ہوٹل تھا۔ بیئر کی دو ٹھنڈی بوتل اور اس کے بعد وکٹوریہ روڈ پر چہل قدمی کرتے ہوئے فریئر گارڈن تک آنا کسی خواب کی طرح یاد ہے۔ پھر ایسی کئی شامیں گزریں جن پر کئی کئی دن قربان کیے جاسکتے ہیں۔ کراچی کے جن چھوٹے چھوٹے باروں میں جانا ہوتا تھا ان کی اپنی زندگی تھی۔ شام کے وقت لوگ اپنا غم غلط کرلیتے تھے' سڑکوں پر گولیاں نہیں چلاتے تھے۔

مجھے ان کی باتوں کا مزا آرہا تھا۔ وہ مجھے ایک ایسے کراچی کی کہانی سنا رہے تھے جو میں نے نہیں دیکھا تھا۔ جس کے بارے میں میں نے سنا بھی نہیں تھا۔ ان کی خاموشی کو توڑنے کے لیے میں نے سوال کیا تھا کہ انھوں نے کراچی کیوں چھوڑا تھا۔

وہ تھوڑی دیر اور خاموش رہے تھے۔ "یہ بڑی ذاتی بات ہے' بہت پرسنل سوال ہے۔ تمھیں نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔ میں نے تو تم سے نہیں پوچھا تھا تم خود ہی بولے تھے۔"

مجھے ایسا لگا تھا جیسے انھیں برا لگا ہو۔ میں نے فوراً" ہی معذرت چاہی تھی۔ "نہیں میرا مطلب آپ کا دل دکھانا نہیں ہے میں تو ایسے ہی پوچھ بیٹھا تھا۔ پرانے کراچی کی جو باتیں آپ سنا رہے ہیں اس کے حوالے سے میں پوچھ بیٹھا تھا۔" میں گڑبڑا کر کے وضاحت کرنا چاہ رہا تھا۔

وہ مسکرائے تھے دھیرے سے' دوبارہ سے ان کی بڑی بڑی سرخ آنکھوں میں ایک روشنی سی آکر چلی گئی تھی۔ "نہیں' کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو ویسے ہی کہہ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر انھوں نے ایک بڑا گھونٹ لیا تھا۔ تھوڑی خاموشی کے بعد خود ہی آہستہ سے بولے تھے۔ "اس دن میں پیلس سینما کے پاس کیفے فردوس میں بیٹھا چائے پی رہا تھا اور رحیم کا انتظار کر رہا تھا۔ کیفے

فردوس میں فردوس کا ہی مزا آجاتا تھا۔ یہ کیفے تمام کا تمام ہرے رنگ کا تھا اور ہلکی روشنی میں ہم لوگ اکثر وہاں گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے۔ جلد ہی رحیم آگیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ چلو صدر میں عیسائیوں کا جلوس نکلا ہوا ہے اور کہا تھا کہ چل کے دیکھنا چاہیے۔ عیسائی ہر سال یہ جلوس نکالتے تھے اور نہ جانے کتنے سال سے نکال رہے تھے۔ شاید تب سے جب سے عیسائی اس شہر میں آکر آباد ہوئے تھے۔ رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس عیسائی لوگ مرد عورت' جوان بوڑھے' لڑکے لڑکیاں بینڈ کے ساتھ ساتھ سینٹ پیڑک چرچ سے نکلتے تھے ایمپرس مارکیٹ کے سامنے سے ہوتے ہوئے الفنسٹن اسٹریٹ سے ہوتے ہوئے بڑے کیتھڈرل پر جلوس کا خاتمہ ہوتا تھا۔

شہر کے دوسرے علاقوں سے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کی صورت میں نئے اور خوب صورت لباس پہنے ہوئے لڑکے لڑکیاں جلوس میں شامل ہوتے تھے۔ پاکستان بننے کے کچھ سال تک تو یہ جلوس نکلتا رہا ہے پھر نکلنا بند ہو گیا تھا کیوں کہ کراچی کے نئے مسلمان شہریوں نے جلوس پر حملہ کر دیا تھا۔ کچھ لوگوں نے لڑکیوں کو چھیڑ دیا تھا

اس دن بھی وہ جلوس خوب تھا۔ الفنسٹن اسٹریٹ پر بینڈ بجاتے ہوئے لڑکے لڑکیاں گزر رہے تھے اور ان میں ہی وہ لڑکی تھی۔ سفید فراک میں ملبوس۔ ہلکی سی لپ اسٹک لگائے ہوئے۔ لانبا قد تھا اس کا اور چہرے پر ہلکا سا پسینہ آیا ہوا۔ میں نے اسے دیکھا تھا۔ اس پر پھر نظر پڑی تھی۔ دوبارہ اس پر نگاہ ڈالی تھی پھر اسے دیکھتا ہی چلا گیا تھا۔ وہ اتنی ہی خوب صورت تھی کہ میرے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ رحیم کو بھی وہ اچھی لگی تھی مگر اتنی نہیں۔ آج جب میں پیچھے مڑ کے دیکھتا ہوں تو مجھے ابھی بھی وہ اتنی ہی خوب صورت نظر آتی ہے۔ سفید لباس میں ملبوس گورا رنگ اور چہرے پر ایسی کشش چہرے پر سے نظر نہیں ہٹتی تھی ۔ میرے خیال میں یہ کیمسٹری کا مسئلہ ہے۔ کسی کا اچھا لگنا اور کسی کا برا لگنے کا تعلق خوب صورتی سے نہیں ہے۔ یہ تو ایک طرح کی باہمی کیمسٹری کا مسئلہ ہے۔ کبھی خوب صورت سے خوب صورت چہرہ بھی اچھا نہیں لگتا ہے اور کبھی دوسروں کے لیے بدشکل صورت دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔ اس کا نام تھا جوزفین ڈیرک۔ ماں اس کی گون تھی اور باپ ایک انگریز سپاہی جو کبھی کراچی میں آیا تھا اور جوزفین کی ماں سلویا برگنزا سے شادی کی تھی۔ پاکستان بننے سے پہلے جب جوزفین اور اس کے دو بھائی چھوٹے ہی تھے کہ ولیم ڈیرک کو برما کے محاذ پر جانا پڑا تھا جہاں سے اس کی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ جوزفین کی ماں ابھی بھی کسی ایسی صبح کا انتظار کر رہی تھی جب مسکراتا ہوا ولیم مینس فیلڈ اسٹریٹ کے کونے والی بلڈنگ پر اس فلیٹ میں داخل ہوگا۔

میں جلوس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا تھا۔ رحیم بھی میرے ساتھ تھا اور میری نگاہ مستقل

جوزفین پر جمی ہوئی تھی۔ جلد ہی اسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ میں اسے مسلسل تک رہا ہوں۔ جلوس کے ختم ہونے پر سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ وہ لڑکوں اور لڑکیوں کے ایک گروپ کے ساتھ چلی گئی تھی لیکن جاتے جاتے اس نے ایک بھرپور نگاہ ڈال کر مجھے دیکھا تھا' بہت غور سے۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ پھر ملیں گے۔

اس کے بعد میں اور رحیم ہوٹل ایکسلیئر کے بار میں چلے گئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی برف میں لگی ہوئی وہ بیئر جیسے جسم سے لے کر روح کو تر کر گئی تھی۔ رحیم جلوس کے بارے میں اور میں جوزفین کے بارے میں بات کرتا رہا تھا۔ پھر ہم دونوں ہی تیز خوشبو اور سونف کا پان کھا کر گھر آ گئے تھے۔ خوشبو کے پان سے بیئر کی بدبو چھپ جاتی ہے۔ اس وقت کے بہار میں تاڑی پینا بہت غیر معمولی بات نہیں تھی مگر کراچی میں بیئر پی کر گھر جانا کسی کو بھی قبول نہیں تھا۔

دوسرے دن یونیورسٹی میں' اس کے بعد دوستوں میں پھر شام کو گھر پر ایک عجیب قسم کی بے قراری کا شکار رہا تھا۔ کسی کام کو کرنے کا دل نہیں کرتا تھا کسی بات میں جی نہیں لگتا تھا۔ نہ ریڈیو کے گانے اور نہ گراموفون کے ریکارڈ۔ ایک رحیم کو اندازہ تھا کہ کس قسم کی بے قراری کا شکار ہوں۔

اس شام کو میں نے اور رحیم نے میکلوڈ روڈ پر ڈاؤ میڈیکل کالج کے ہاسٹل کے پاس جو شاید چیلا رام بلڈنگ میں تھا ایک چھوٹے سے بار میں بیٹھ کر دو دو بوتل بیئر کی پی تھیں اور جہاں سے آہستہ آہستہ کراچی کی شام کی خنک ہوا میں ٹہلتے ہوئے پیلس ہوٹل گئے تھے۔ وہاں سے گھومتے ہوئے کمشنر کراچی کے گھر اور کراچی جمخانہ کے سامنے سے ہوتے ہوئے میٹروپول ہوٹل کے سامنے سے گزر کر پیلس سینما کے پوسٹروں کو دیکھتے ہوئے کیتھڈرل کے سامنے سے ہوتے ہوئے الفنسٹن اسٹریٹ پر جا نکلے تھے۔

یہ کہہ کر وہ رکے۔ میں نے دیکھا کہ ان کا گلاس خالی ہو چکا ہے۔ میں نے اشارے سے سروس کرنے والی لڑکی کو بلایا۔ فرسٹ کلاس کے لاؤنج میں بیٹھنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ ہر چیز وافر ہے' جتنی بھی چاہے لے لو۔ زندگی فرسٹ کلاس میں بسر کرنے والوں کے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ سیکنڈ کلاس زندگی کا رخ کریں۔ میں نے یہ سبق آسانی سے سیکھ لیا تھا مگر سیکنڈ کلاس اور تھرڈ کلاس میں رہنے والے لوگ یہ نہیں سمجھتے ہیں۔ ویٹرس نے ان کا گلاس بھر دیا تھا۔ انھوں نے سگریٹ سلگائی' ایک زور کا کش بھرا' مسکرائے پھر بولنے لگے "نہ جانے کیوں مرا دل کہہ رہا تھا کہ کراچی کی پرانی عیسائیوں کی آبادی کی طرف چلا جائے۔ شاید اس امید میں اس آسرے میں کہ جوزفین وہاں ہو گی' کہیں نظر آ جائے گی۔ میں اور رحیم کراچی کی شام کی ٹھنڈی ہوا میں

آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے لکی اسٹار پہنچے۔ وہاں سے گون ہال کے سامنے سینٹ جوزف کالج کے پیچھے سے ہوتے ہوئے مینس فیلڈ اسٹریٹ سے گزرتے ہوئے بر گنزا اسکوائر تک پہنچ گئے تھے۔ اب نہ جانے وہاں کیا ہوگا۔ اس وقت وہ جگہ بڑی خوب صورت تھی ایک طرف سینٹ پیٹرک چرچ نظر آتا تھا اور دوسری جانب سپریم کورٹ کی خوب صورت بلڈنگ۔ ہم دونوں وہاں دیر تک اِدھر اُدھر گھومتے رہے تھے۔ کئی خوب صورت عیسائی لڑکیاں نظر آئی تھیں مگر وہ نہیں دکھائی دی تھی۔ جوزفین دل میں ایک کانٹے کی طرح اٹک گئی تھی۔ وقت گزرتا گیا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔ کئی مہینے گزر گئے اور میں دوبارہ سے عیسائیوں کے سالانہ پریڈ کے بارے میں سوچنے لگا تھا کہ ایک دن مجھے وہ مل گئی' ایک حادثے کی طرح۔ میں کیپٹل سینما سے نکل رہا تھا کہ میں نے اسے دیکھا تھا سیڑھی سے اترتے ہوئے۔ میں بے تحاشا بے قابو ہو کر اس کی طرف دوڑا تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر مسکرائی شاید اسے بھی میرا انتظار تھا۔ میں نے اسے کیپٹل سینما کے اوپر کیپٹل ریسٹورنٹ میں چائے کی دعوت دی تھی اور وہ میرے ساتھ چلی آئی تھی۔ ہم نے چائے اور پیٹیز کھائے تھے۔ وہ سینٹ جوزف کالج میں پڑھ رہی تھی۔ ہم دونوں کی دوستی یکایک ہوئی تھی جو بڑھ کر شدید پیار بن گئی۔ ہم روز ملتے تھے' کبھی پیلس سینما میں فلم دیکھتے تھے' ہوٹلوں میں چائے پیتے تھے اور کئی دفعہ میں اس کے گھر بھی گیا تھا۔ کراچی چھوٹا سا شہر تھا تھوڑے دنوں میں ہی یونیورسٹی میں اور میرے جاننے والوں کو میری اس سے بے تحاشا محبت کا پتا لگ گیا تھا۔ اب یہ محبت نہیں رہی تھی میں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھی مجھ سے شادی پر تیار تھی مگر زندگی اتنی آسان نہیں ہے۔ میرے والد والدہ اور خاندان کسی کرسچن سے میری شادی کرنے کو تیار نہیں تھے۔ جوزفین کی ماں اور ماں کے رشتہ داروں کو جوزفین سے میری دوستی پسند نہیں تھی۔ زندگی یکایک مشکل ہو گئی تھی۔ اس کے خاندان کے بہت سارے کیتھولک لڑکے اس کے امیدوار تھے۔"

وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے تھے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں' پھر انھوں نے سوال کیا تھا "تم نے سینٹ پیٹرک چرچ دیکھا ہے؟"

میں نے جواب دیا "ضرور' سینٹ پیٹرک اسکول کے سامنے سینٹ جوزف کالج کے ساتھ کئی دفعہ جیکب لائن اور اسے سینما لائن سے گزرتے ہوئے وہاں نظر پڑی ہے۔"

"تم وہاں کبھی رات میں تو نہیں گئے ہو گے۔"

"نہیں' کبھی نہیں۔" میں نے جواب دیا

کبھی جانا اور جب چودھویں کی رات کا چاند نکلا ہوا ہو تو اس چرچ پر نظر ڈالنا۔ اس وقت

کے کراچی کا حسین ترین منظر تھا۔ نہ جانے اب کیسا ہو گا۔ میں نے سنا ہے بڑی بلند
ہیں اور زیادہ تر کرسچن وہ جگہ چھوڑ کر آسٹریلیا اور امریکا چلے گئے ہیں۔ ایسی ہی ایک
تھی جب اس چرچ کی سیڑھیوں پر میں اور جوزفین بیٹھے ہوئے تھے اور زندگی کی مشکلات سے
نمٹنے کے پلان بنا رہے تھے۔ مجھے یاد ہے اس دن اس نے اپنا پرس کھول کر ایک بار مجھے دیا تھا
انھوں نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک پرس نکالا جس کے اندرونی خانے میں پرانے اسٹائل کا
ایک سونے کا چھوٹا سا دل تھا۔ یہ دیکھ رہے ہو دل' یہ ایک ہار میں پرویا ہوا تھا۔ وہ ہار تو میں نے
کھو دیا۔ مگر یہ دل ہروقت میرے پاس ہوتا ہے۔

میں نے اس دل کو اٹھا کر دیکھا۔ اس کے ایک طرف بہت ہی خوب صورت انداز سے
انگلش کا حرف جے جے کھدا ہوا تھا۔ میں وہ دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ بولے "جاوید جوزفین" یہ
مطلب ہے اس جے جے کا۔ یہ جوزفین کا پہلا اور آخری تحفہ تھا۔ اس رات کے بعد سب کچھ
بہت تیزی سے ہو گیا تھا۔ میرے والد نے مجھے بلا کر کہہ رہا تھا کہ جوزفین سے میری شادی نہیں
ہو سکتی ہے۔ جوزفین بہت روئی تھی مگر اس کے بھائی' ماموں' ماں اور کیتھولک پادری کوئی بھی
اس رشتے پر تیار نہیں تھے۔ میری یونیورسٹی کا آخری سال تھا اور رحیم کے مشورے سے میں
کورٹ میرج کا پلان بنا ہی رہا تھا کہ وہ یکایک مر گئی۔ مجھے کچھ پتا نہیں چلا تھا کہ کیا ہوا تھا نہ کوئی
خط نہ کوئی پیغام اس کی دوست لوریٹا مجھے کئی دنوں کے بعد ملی تھی بس اس نے اتنا بتایا تھا کہ
جوزفین بہت پریشان تھی۔ اس کا اس کی ماں سے بھی جھگڑا ہوا تھا۔ اس کے ایک انکل کالج میں
آئے تھے پھر کالج کی پرنسپل مس این میری جوزفین سے کچھ باتیں کرتی رہی تھیں۔ اس دن اس
نے لوریٹا کو بتایا تھا کہ وہ شام کو مجھ سے ملے گی لوریٹا نے ہی بتایا تھا کہ وہ بہت پریشان تھی بار بار
گلے میں پڑے ہوئے کراس کو ہاتھ میں دبا دبا کر دعائیں مانگتی رہتی تھی۔ وہ فیصلہ کرنے سے قاصر
تھی وہ میرے ساتھ بھاگنا بھی چاہتی تھی اور اس کو اپنی ماں کا بھی خیال تھا وہ مسلمان بننا چاہتی
تھی مگر اس کو مجھ سے بھی پیار تھا۔ کشمکش کے دو پلڑوں کے درمیان وہ نہ جانے کیا فیصلہ کر بیٹھی
تھی میری زندگی کا وہ معمہ آج تک مجھے حیران کر رہا ہے۔ میں اس سے ملاقات کا انتظار ہی کرتا
رہ گیا تھا مگر وہ مجھ سے نہیں ملی تھی۔ دوسرے دن بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک ہفتے بعد
جب میں اسے تلاش کرتا ہوا مینس فیلڈ اسٹریٹ کے اس مکان میں پہنچا تھا تو اس کی ماں نے بتایا
تھا کہ جوزفین مر چکی ہے۔ اس کو مرے ہوئے بھی پانچ دن ہو چکے تھے۔ اسے ڈرگ روڈ کے
عیسائیوں کے قبرستان میں دفن کیا جا چکا تھا۔ اس کی ماں مجھ سے بار بار پوچھتی رہی تھی۔ یہ کیسے
ہوا' یہ کیسے ہوا اس کا غم میری سمجھ میں آ رہا تھا مگر میرے غم کی شدت کا اندازہ کوئی نہیں کر سکا

تھا۔ سلویا بر گنزا کا ہاتھ پکڑ کر میں بہت دیر تک روتا رہا تھا۔ پھر مجھے احساس ہو گیا تھا کہ سلویا کے علاوہ کسی کو بھی میری موجودگی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ میں بوجھل قدموں سے سیڑھیاں اتر کر اپنے گھر پہنچا تھا۔ پھر کراچی میں میرے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر میں لندن چلا آیا تھا۔ میری ماں اور باپ میری بہن سے ملنے بہار گئے تھے۔ جہاں میرے والد کی موت ہو گئی تھی اور میری ماں پھر کراچی واپس گئی ہی نہیں تھی۔ میرا کام بڑھتا گیا' بڑھتا گیا اور بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ کئی انگلش اور اسکاٹش لڑکیاں زندگی میں آئیں مگر میں ان میں بھی جوزفین کو تلاش کرتا رہا۔ جوزفین نہیں ملی' وہ تو مر گئی تھی یہ دل مجھے دے کر۔ میرے دل میں اتنا بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے لگتا ہے جیسے ساری کائنات اس میں سما جائے گی۔"

انھوں نے اس دل کو بڑے زور سے اپنے مٹھی میں بھینچا ہوا تھا اور ان کی سرخ سرخ آنکھوں میں قطرے جھلملا رہے تھے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ پھر بولے "کیا ہے کراچی میں میرے لیے۔ نہ ایکسلسیئر ہوٹل' نہ کیپٹل سینما' نہ کیفے فردوس نہ بر گنزا اسکوائر اور نہ ہی جوزفین، میں کراچی کی پرانی تصویر کے ساتھ ایڈنبرا میں ایک دن کہیں کھو جاؤں گا۔"

سنگاپور ایر لائنز کی فلائٹ دبئی کے لیے تیار تھی۔ ہم دونوں ہی ساتھ جہاز پر بیٹھے تھے دونوں ہی کھانا کھا کر سو گئے۔ دبئی پر جب آنکھ کھلی تو وہ کافی ہشاش بشاش تھے اس کے بعد ان سے پھر کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ ابھی بھی جب کبھی ہیتھ رو کے فرسٹ کلاس لاؤنج میں بیٹھتا ہوں تو وہ یاد آتے ہیں۔ جن کی جیب میں ایک پرس ہے' پرس میں سونے کا بنا ہوا ایک دل اور دل پر لکھا ہوا ہے جے جے۔ جاوید جوزفین۔ جو بچھڑ گئے اور اس دل کا شہر جو روٹھ کر کہیں چلا گیا۔

ننھے ننھے ہاتھ

ہاشم کا فون تھا امریکا سے۔ میں اس سے ہی بات کر رہا تھا۔ اس کی ماں کی طبیعت خراب تھی اور وہ چاہ رہا تھا کہ اگر میں کچھ کرسکوں تو ضرور کروں۔ میں نے وعدہ کرلیا تھا کہ کل ہی اس کی ماں کو سول ہسپتال میں پروفیسر صاحب کو دکھوا دوں گا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کا بھائی ماں کو لے کر صبح صبح میرے پاس آجائے گا' پھر میں دونوں کو سول ہسپتال لے جاؤں گا۔ وہاں کے میڈیکل وارڈ میں ایک پروفیسر صاحب کے ساتھ ہی میرا دوست کام کر رہا تھا' اس سے ہی کہہ کر ان کا علاج ہو جائے گا۔

ہاشم اور میں گہرے دوست تھے۔ ساتھ ہی ہم نے لانڈھی گورنمنٹ اسکول سے میٹرک پاس کیا' پھر گورنمنٹ کالج لانڈھی سے انٹر بھی ساتھ کیا تھا۔

اور ہم دونوں ہی انٹر میں اچھے نمبر نہیں لا سکے تھے۔ میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور بائیولوجی میں ایم ایس سی کرنے کے بعد ایک دواؤں کی کمپنی کا میڈیکل ریپریز-ٹیٹو ہو گیا تھا۔ طالب علمی کے دوران ہم دونوں کی دوستی قائم رہی۔ شام ساتھ گزرتی تھی۔ محلے کے ہوٹل میں دودھ پتی کی چائے پیتے اور سیاست بگھارتے تھے۔

ہاشم کی زندگی تھوڑی پیچیدہ ہو گئی تھی۔ انٹر کرنے کے بعد اس نے اسٹیل مل میں کام کرنا شروع کر دیا۔ کارخانے میں اسے اپرنٹس کے طور پر رکھا گیا تھا اور ٹریننگ کے بعد نوکری پکی ہو جاتی۔ دو سال کی ٹریننگ میں تنخواہ بھی اچھی تھی اور پکی نوکری کے بعد شاید اسے روس بھی ٹریننگ کے لیے بھیجتے۔

ہم دونوں روز شام کو ملتے تھے۔ میں اسے یونیورسٹی کے قصے سناتا' وہاں کی باتیں بتاتا اور وہ مجھے اسٹیل مل کے اور مزدور یونین کے قصے سناتا تھا۔ ہم دونوں ہی پر بڑی ذمہ داری تھی۔ میرے بھی گھر میں تین بہنیں تھیں اور دو چھوٹے بھائی اور اس کی بھی دو بہنیں تھیں اور دو چھوٹے بھائی۔ لانڈھی کے کوارٹروں میں ہم دونوں نے آنکھ کھولی

تھی۔ ہماری نظروں کے سامنے ہی کوارٹر مکانوں میں بدلے، پھر مکان دو منزلہ مکان بن گئے، گھروں کے سامنے اسکوٹر کھڑے ہوئے اور اکا دکا اسکوٹروں کی جگہ پر پرانی کاریں کھڑی ہونے لگی تھیں۔ قائد آباد سے کراچی جانے والی سڑک پہلے صرف ایک سڑک تھی، پھر بڑھتی ہوئی ٹریفک کی وجہ سے دو سڑکیں بنادی گئی تھیں۔ لانڈھی کورنگی کی آبادی میری نظر کے سامنے بڑھتی چلی گئی تھی۔ علاقے میں ترقی ضرور ہوئی تھی مگر اس طرح سے نہیں جیسی ہونی چاہیے تھی۔

رہائشی علاقوں میں دوکانیں، غیر قانونی کچی آبادیاں، پارکوں اور اسکولوں کی جگہوں پر قبضہ، آبادی کے بڑھنے کے باوجود گٹر لائنیں ویسی کی ویسی ہی تھیں اور پانی اتنا ہی آتا تھا جتنا 1960ء میں آتا تھا۔ آبادی بڑھتی جارہی تھی اور مسائل بھی بڑھتے جارہے تھے۔ بھٹو صاحب کی حکومت کو کراچی سے بڑے ووٹ ملے تھے اور انھوں نے کراچی کے لیے کیا بھی خوب، مگر ساتھ ہی کراچی کے لیے کوٹا لگا کر مہاجروں کی دشمنی بھی مول لی تھی۔ پھر ضیاء الحق کی حکومت نے کراچی سے خوب مذاق کیا تھا۔ بے نظیر کی دشمنی میں آہستہ آہستہ ملک کا جو برا ہوا وہ تو ہوا ہی، مگر کراچی کا بہت ہی برا ہوا تھا۔ لانڈھی کورنگی میں ایک دنیا آباد تھی، مگر اسکول اتنے ہی تھے، کالج اتنے ہی تھے، بے روزگاری بڑھ گئی تھی اور آہستہ آہستہ سب کچھ بدل گیا تھا۔ بچے اسکول جانے کے بجائے ہوٹلوں میں ڈبو کھیلتے تھے جوان بھتے وصول کرتے تھے اور پڑھی لکھی آبادی آہستہ آہستہ جہالت کی گود میں چلی گئی تھی۔

ہاشم اسٹیل مل کی یونین میں بہت زیادہ مصروف ہوگیا تھا۔ وہ کارخانے کا ملازم تھا جہاں سے اسے تنخواہ ملتی تھی، مگر کام وہ آفس میں کرتا تھا۔ تنظیمی کام۔ مجھ سے اس کی ملاقاتیں کم ہوگئی تھیں، لیکن جب بھی ملاقات ہوئی تھی وہ اپنے کام کے بارے میں بتاتا رہتا تھا۔ اس کے کاموں کی نوعیت بدلتی رہتی تھی۔ علاقے کے لڑکوں کی ٹریننگ کے لیے پیسہ جمع کرنا ہے۔ حالات خراب ہونے والے ہیں۔ کورنگی کے کارخانوں سے بھتہ وصول کرنا ہے۔ اسٹیل مل میں الیکشن ہونے والے ہیں، بڑا کام ہے۔ اس کے پاس موبائل فون بھی ہوتا تھا۔ کبھی پے جر ہوتا تھا۔ کبھی کبھی وہ ہفتوں اور مہینوں کے لیے غائب بھی ہوجاتا تھا۔ میں اسے سمجھتا تھا کہ اس کے کام کی نوعیت کچھ صحیح نہیں، وہ جو اور بھی کچھ کررہا ہے وہ سیاست سے کچھ زیادہ ہی ہے۔

آہستہ آہستہ ہاشم کے گھر میں پیسوں کی فراوانی ہوگئی۔ وہ جب بھی آتا تھا تو کسی

کے ساتھ ہوتا تھا، کبھی پیلی ٹیکسی میں، کبھی کالی سوزوکی میں تو کبھی سفید شراڈ میں — میں اکثر اس
کے گھر چلا جاتا تھا۔ اس کی ماں بہت پیار سے ملتی تھی۔ ایک عجیب طرح کی شفقت تھی ان میں
وہ بھی میری ماں کی طرح بہنوں کے رشتوں کے لیے پریشان رہتی تھیں اور اپنے مشورے مجھے
دیتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھار میری ماں ان کے گھر چلی جاتی تھیں یا وہ خود میرے گھر آجاتی تھیں۔
ہم سب کے مسائل ایک تھے اور ہم سب کے غم بھی ایک تھے۔ مگر اب وہ ہاشم کی وجہ سے
پریشان رہتی تھیں۔ گو کہ گھر میں اتنی مالی پریشانی نہیں تھی اور ہر ماہ ہاشم ایک بڑی رقم گھر میں
دیتا تھا اور گاہے بہ گاہے بھی کچھ نہ کچھ لاتا رہتا تھا۔ بیٹیوں کے جہیز بھی آہستہ آہستہ تیار ہو رہے
تھے مگر نہ جانے کیوں انھیں بھی میری ہی طرح کے خدشے ہوتے رہتے تھے۔ ہاشم اسٹیل مل
کے علاوہ بھی کچھ کر رہا ہے۔ صرف سیاست نہیں، سیاست سے آگے بھی بہت کچھ کر رہا ہے۔
وہ صرف سیاست نہیں کر رہا تھا، وہ سیاست سے آگے بھی بہت کچھ کر رہا تھا۔ ایک دن
جب وہ میرے گھر آیا تھا تو میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ جس راستے پر وہ چل نکلا
ہے وہ کہاں تک جائے گا۔ "عوام" "قومی اخبار" اور "امن" میں نہ جانے کیا کیا چھپ رہا تھا۔
نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔ ایسے حالات میں چندہ جمع کرنا، بھتہ وصول کروانا، اسلحہ کی خریداری
کرنا لڑکوں کو ٹریننگ دلوانا اور نہ جانے اس طرح کے کتنے کاموں کی ذمہ داری اس پر تھی۔ میں
نے اسے بہت سمجھایا تھا کہ ابھی بھی وقت ہے کہ صرف اسٹیل مل میں کام کرو اور اگر یہ ممکن
نہیں ہے تو سب کچھ چھوڑ دو، یہ شہر ہی چھوڑ دو۔ تم محنتی آدمی ہو بہت کچھ کر لو گے۔ مجھے ایسا لگا
تھا جیسے کچھ اس کی سمجھ میں آیا ہے، کچھ وہ نہیں سمجھا ہے اور کچھ وہ سمجھنا بھی نہیں چاہتا ہے۔

پھر ایک رات دو بجے میرے گھر کا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ وہ تین آدمی تھے۔ میرے
دروازہ کھولتے ہی اندر آگئے تھے، وہ لوگ ہاشم کی تلاش میں تھے۔ ٹیکسی میں ڈرائیور بیٹھا ہوا تھا
اور باہر ایک شخص کھڑا ہوا تھا۔ وہ سب کے سب مسلح تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہاشم میرے گھر پہ
چھپا ہوا ہے۔ ان لوگوں نے نہ مجھے مارا تھا نہ گالی دی تھی نہ بدتمیزی کی۔ میری ماں کو درشتگی
سے خاموش رہنے کے لیے کہا اور ایک ایک کمرے کی تلاشی لی تھی اور مجھے سختی سے کہا تھا کہ
ہاشم کو چھپانے کی کوشش نہ کروں۔ جتنی تیزی سے وہ لوگ آئے تھے اتنی ہی تیزی کے ساتھ
چلے گئے۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی میں ہاشم کے گھر گیا۔ ہاشم کی ماں کو کچھ بھی پتا نہیں تھا۔ پانچ
دنوں سے ہاشم گھر نہیں آیا تھا۔ مگر یہ تو ایک طرح کی معمولی سی بات تھی۔ میں انھیں رات کا
واقعہ نہیں بتانا چاہتا تھا مگر مجھے پتا تھا کہ اگر میں نہیں بتاؤں گا تو میری ماں سے انھیں پتا لگ جائے
گا، لہٰذا انھیں میں نے بتایا کہ رات کیا ہوا ہے۔ وہ بڑی پریشان ہو گئی تھیں۔ میں نے انھیں

سمجھایا کہ کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب ہاشم خود ہی کچھ بتائے گا اس وقت ہی ہم لوگ کچھ کریں گے مگر اپنے مشورے کے کھوکھلے پن کی شدت کا احساس مجھے تھا لیکن اس کے علاوہ چارہ بھی نہیں تھا میرے پاس۔ میں خود خوف زدہ تھا' سخت ٹینشن کا شکار اور نہ جانے کیا کیا باتیں میرے دماغ میں آرہی تھیں۔ دن بھر آفس میں بھی میرا دل ایک بے قراری کی سی کیفیت میں رہا تھا۔ اس دن میں کسی بھی فیلڈ وزٹ پر نہیں گیا تھا۔ ہاشم نے نہ اپنے گھر اور نہ میرے گھر پر کوئی رابطہ کیا تھا۔

دوسرے دن میں سول ہسپتال میں داخل ہی ہوا تھا کہ ایک آدمی نے خاموشی سے ایک لفافہ مجھے دیا۔ اس سے پہلے کہ میں وہ لفافہ کھولتا وہ اسی خاموشی سے میرے سامنے سے کھوگیا۔ وہ ہاشم کی چھوٹی سی تحریر تھی۔ اس نے مجھے شام پانچ بجے کیماڑی پر جہاں سے منوڑا کی بوٹ جاتی ہے وہاں ایک پٹھان کا ڈیرا تھا' وہاں بلایا تھا۔

میں وقت پر وہاں پہنچ گیا اور اپنے لیے چائے منگوائی۔ تھوڑی دیر میں ہاشم بھی وہاں آگیا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور اس نے کالے شیشوں کا چشمہ لگایا ہوا تھا۔

اس نے بتایا کہ کچھ شدید قسم کے مسئلے ہوگئے ہیں اور وہ اب کراچی تو کیا شاید پاکستان میں بھی نہیں رہ سکے گا' کسی وجہ سے اس کی موت کے حکم جاری ہو چکے ہیں۔ میرے پوچھنے کے باوجود اس نے وجہ نہیں بتائی تھی۔ فی الحال وہ کوششوں میں تھا کہ یہاں سے نکل جائے۔

میں نے اس سے کہا کہ وہ امریکا کیوں نہیں نکل جاتا ہے۔ اس نے بتایا کہ امریکا کا ویزا لگنا ناممکن ہے۔

میں نے اسے بتایا کہ میں کچھ ڈاؤ میڈیکل کالج کے اسٹوڈنٹس کو جانتا ہوں جو امریکن ویزا وغیرہ کی باتیں کرتے رہتے ہیں' اگر وہ کہے تو میں ان سے بات کرسکتا ہوں۔ اس نے مجھے تاکید کی تھی کہ ضرور کروں اور روپوں کی بالکل بھی فکر نہ کروں' جتنا بھی خرچ ہوگا وہ دینے کو تیار ہے۔ پھر اس نے کچھ روپے اپنی ماں کے لیے دیے اور مجھے تاکید کی تھی کہ ابھی جاکر ان سے نہ ملوں' کل صبح جب کام پر جاؤں تو اس کے گھر پر ہوتا ہوا جاؤں۔ اس نے گھڑی دیکھی اور کہا کہ چلنا چاہیے۔ وہ میرے ساتھ ساتھ باہر آیا۔ ایک لڑکا میرے اسکوٹر کے سامنے کھڑا تھا۔ ہاشم نے اس سے کہا تھا ٹھیک ہے' جبار پیچھے پیچھے آجاؤ۔ زیرو پوائنٹ تک پھر وہ میرے ہی اسکوٹر پر بیٹھ گیا اور کہا کوئنز روڈ سے میٹروپول کی طرف لے لوں۔ میں اسکوٹر چلا رہا تھا اور ساتھ ہی اسے تلقین کررہا تھا کہ وہ اس چکر سے نکل جائے اور وہ اپنی ہوں ہاں میں جوابات دے رہا تھا اور اپنی بات بھی کرتا جارہا تھا۔ اس طرح سے ہم لوگ میٹروپول ہوٹل پہنچ گئے۔ اواری ہوٹل کے سگنل سے

گزر کر اس نے کہا کہ اسکوٹر آہستہ کرلوں۔ مہران ہوٹل کے سامنے ایک سفید رنگ کی سوزوکی کھڑی تھی۔ اس نے اسکوٹر اس کے پیچھے رکوا دی اور جا کر اس میں بیٹھ گیا۔ جاتے جاتے اس نے ایک پرچی دی تھی کہ اس موبائل فون پر اسے فون کر کے بتاؤں کہ امریکا کا ویزا کتنے میں لگے گا۔

دوسرے دن صبح پہلے میں ہاشم کے گھر گیا' خاموشی سے اس کی ماں کو خیریت کی خبر دی اور کہا کہ کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آفس جا کر میں سول ہسپتال گیا جہاں تین وزٹ کرنے کے بعد ڈاؤ میڈیکل کالج کی کینٹین میں ساجد سے ملا۔ ساجد کئی سال سے میڈیکل کے آخری سال میں تھا۔ اپنے ایک دوست کے توسط سے میں اس سے ملا تھا۔ وہ میڈیکل کالج کے ہاسٹل میں ہی رہتا تھا اور دنیا جہان کے لوگوں سے اس کی دوستی تھی۔ اس کے کمرے میں ہر طرح کے لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ چرس' حشیش' شراب اور عورتیں' ان سب سے ساجد کا کسی نہ کسی طرح سے تعلق تھا۔ وہ مجھے کمرے میں ہی مل گیا' مگر اکیلا نہیں تھا۔ دو اور عجیب قسم کے لوگ بیٹھے تھے اور کسی بات پر ساجد سے بحث کر رہے تھے۔ ساجد نے آدھ گھنٹے کے بعد مجھے کالج کینٹین میں ملنے کو کہا' میں جا کر کینٹین میں بیٹھ گیا اور اس کے انتظار میں چائے پی رہا تھا کہ وہ آگیا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ جاپان کا سنگل وزٹ پی سی دو لاکھ میں ہو گا اور امریکا کا سنگل وزٹ پی سی ڈیڑھ لاکھ میں مل جائے گا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

اس نے سمجھایا کہ پی سی کا مطلب ہے کہ کسی ایسے پاسپورٹ پر جس پر امریکا جاپان کا ویزا لگا ہوا ہے اس پر فوٹو چینج (Photo Change) کردی جائے گی' اس کے بعد جانے والے کی قسمت ہے اگر وہ نکل گیا تو پاسپورٹ ایئرپورٹ پر ہی کوئی لے لے گا اور کام ختم' اگر نہیں نکل سکا اور پکڑا گیا تو ہماری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ پچاس ہزار روپے زیادہ دو گے تو ہماری ذمہ داری ہوگی' اگر پکڑے گئے اور واپس آگئے تو دوسرا پی سی بنادیں گے اور اس وقت تک بناتے رہیں گے جب تک ایئرپورٹ سے نہ نکل جاؤ۔ اس نے بتایا تھا کہ اس سارے کام میں ہفتہ دس دن لگ جائے گا۔ پچاس ہزار روپے ایڈوانس اور دس تصویریں دینا ہوں گی۔ جب پاسپورٹ تیار ہوجائے گا تو ساری رقم اکٹھے دینی ہوگی۔ جانے کے وقت ٹکٹ کا انتظام بھی ہم کر سکتے ہیں اگر ہم سے ٹکٹ نہ لوگے تو فلائٹ کا وقت بتادیں گے اور اسی فلائٹ کا ٹکٹ تم کہیں سے بھی لے لینا۔

شام کو ہاشم کے موبائل فون پر جبار سے بات ہوئی تھی اور اس نے پیغام لے کر کہا تھا کہ کہ ہاشم مجھ سے صبح 11 بجے میریٹ ہوٹل کے کیفے نادیہ میں ملے گا۔ وہ مجھے باہر ہی مل گیا' جہاں میں اپنی اسکوٹر کھڑی کر رہا تھا۔ وہ مجھ سے باتیں کرتا ہوا نادیہ کیفے کے بجائے میریٹ ہوٹل کے سامنے فریئر گارڈن میں لے گیا۔ اس نے مجھے ہزار ہزار روپوں کے ساٹھ نوٹ دیے اور اپنی

داڑھی والی تصویر۔ ''جتنی جلد ہو سکے یہ کام کرادو یار۔'' پھر اس نے پوچھا کہ 'بندہ تو بھروسے کا ہے ناں۔

''بندہ تو بھروسے کا ہی لگتا ہے۔ مگر اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔'' میں نے پھر پوچھا کہ ''یار تم نے کیا کر دیا ہے جو یہ مصیبت آن پڑی ہے۔'' وہ مجھے دیکھتا رہا' پھر آہستہ سے میرے ہاتھ کو پکڑ کر بولا کہ ''مجھ سے قتل ہو گیا ہے' انجانے میں' غلطی سے۔''

میرا دل شدت سے دھڑکا اور خنکی کے باوجود پسینے کا سیلاب آتا ہوا محسوس ہوا' مگر کیسے؟

''پھر کبھی بتاؤں گا۔'' ہاشم نے چوکنا ہو کر چاروں طرف دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ فریئر ہال کی جانب ایک لڑکا اسکوٹر لے کر کھڑا تھا اور ہاشم وہاں سے چلا گیا۔

میں اسی وقت ساجد کے کمرے میں پہنچا۔ میرے پہنچنے کے ساتھ ہی ایک مشکوک قسم کی لڑکی کمرے سے نکل کر تیزی کے ساتھ روڈ کی طرف چلی گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ ساجد کا داخلہ میڈیکل کالج میں کیسے ہو گیا تھا۔ میں اپنے جیسے کتنے ہی لوگوں کو جانتا ہوں جن کے نمبر اچھے ہونے کے باوجود وہ میڈیکل کالج میں نہیں گھس سکے تھے اور ساجد میڈیکل کے طالب علم کے علاوہ سب کچھ تھا اور برسوں سے وہاں موجود تھا۔ مجھے کافی دنوں کے بعد پتا لگا کہ ضیاء الحق کے زمانے میں اس کا داخلہ کوٹے کی سیٹوں پر ہوا تھا اور پھر اس کی ایک بادشاہت سی تھی میڈیکل کالج اور سول ہسپتال میں۔ بڑے بڑے پروفیسروں سے لے کر ایم ایس تک سب ہی اس سے جھک کر ملتے تھے۔ وہ ڈاؤ میڈیکل کالج میں امتحان پاس کرانے سے لے کر لڑکیوں کی سپلائی تک ہر کام کرتا تھا۔

''تو کیا فیصلہ کیا ہے؟ امریکا یا جاپان؟ چائے پیو گے؟ آؤ بیٹھو۔'' اس نے باہر نکل کر کسی چھوٹے کو آواز دے کر چائے لانے کے لیے کہا تھا۔

واپس آیا تھا تو میں نے کہا کہ یار جانا تو امریکا ہے مگر کوئی گھپلا تو نہیں ہوگا؟ جن صاحب کا ہے وہ قاتل واتل ہیں۔ اگر کچھ گھپلا ہوا تو مجھے نہیں چھوڑیں گے۔ میں نے اسے ڈرانے کے لیے خاص طور پر یہ بات کہی تھی۔ وہ ہنسا اور بولا میرے پاس کوئی شریف آدمی نہیں آتا ہے۔ کبھی قاتل' کبھی اسمگلر' وہ جو بھی ہے اسے میرا بتا دینا۔ ایئر پورٹ پر اپنے قتل کی وجہ سے پکڑا جائے تو میری ذمہ داری نہیں ہے۔ پی سی کا کام پکا ہوگا اس کی ہماری ذمہ داری ہے۔ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور دوسرے بستر پر بچھے ہوئے گدے کے نیچے سے ایک پلاسٹک کی تھیلی نکال کر اس میں سے کچھ پاسپورٹ نکال کر دکھائے۔ دیکھو! ''یہ سارا کام ہے دو نمبر کا اور ایک نمبر سے بھی اچھا ہے۔''

میں نے اسے پچاس ہزار روپے دیے اور کہا کہ جب پاسپورٹ ملے گا تو جانے کی تاریخ اور

ٹکٹ کے پیسوں کے ساتھ بقیہ ڈیڑھ لاکھ بھی دے دوں گا۔

شام کو گھر پہنچا تو ہاشم کی ماں ہمارے گھر پر ہی بیٹھی تھی۔ انھیں دیکھ کر میں اداس سا ہو گیا۔ شوہر کے مرنے کے بعد میری ماں کی طرح کس کس طرح سے محنت کر کے انھوں نے ہاشم کو پالا تھا، بڑا کیا تھا، پڑھایا تھا۔ جب اسے اسٹیل مل میں نوکری ملی تھی تو اس کی شادی اور دلہن کے خواب دیکھے تھے، مگر اب کیا تھا، انھیں پتا بھی نہیں تھا کہ ان کا بیٹا قاتل بن چکا ہے اور شاید امریکا چلا جائے گا اور پھر شاید کبھی بھی واپس نہیں آئے گا۔ میں خود پریشان تھا مگر ہنس ہنس کر ان سے باتیں کرتا رہا اور دلاسا دیتا رہا۔ زندگی سنگ دل ہے اور ہمارے جیسے خاندانوں کے لیے بڑی کٹھن۔

دوسرے دن کام سے واپس آیا تو میری ماں نے بتایا کہ رات کو ہاشم کے گھر کچھ لوگ آئے تھے اور اس کی ماں سے بہت بدتمیزی کر کے گئے ہیں۔ میں فوراً ہی ان کے گھر گیا۔ وہاں ہاشم کا چھوٹا بھائی اور بہنیں بہت سہمے ہوئے تھے۔ رات تین آدمی آئے تھے اور کہہ کر گئے تھے کہ اب صرف ہاشم کی لاش ہی ملے گی۔ وہ مجھ سے گڑگڑا گڑگڑا کر پوچھ رہی تھیں کہ آخر ہاشم نے کیا کیا ہے؟ میں کیا کہتا، تسلیاں دیتا رہا اور پریشان ہوتا رہا۔

دس دن کے بعد ساجد کا فون میرے آفس میں آیا تھا کہ پاسپورٹ تیار ہے، بقیہ پیسے اور ٹکٹ کے پیسے لے آؤ تو جانے کا انتظام کرتے ہیں۔

میں نے ہاشم کے دیے ہوئے موبائل پر فون کیا تو پھر جبار ہی فون پر ملا تھا اور اس نے بولٹن مارکیٹ کے پیچھے کسی گلی میں حبیب بینک میں دوسرے دن صبح گیارہ بجے مجھے اپنے شناختی کارڈ کے ساتھ بلایا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا، مگر میرے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

وہ بینک مجھے آسانی سے مل گیا۔ چھوٹا سا بینک تھا جس میں ضرورت سے زیادہ لوگ تھے۔ میں اندر گیا ہی تھا کہ ہاشم آ موجود ہوا تھا۔ اس کے پاس اکاؤنٹ کھولنے کا ایک فارم تھا جس پر اس نے میرے دستخط لیے۔ منیجر کے پاس جا کر اس نے پانچ لاکھ روپے جمع کروا کر میرا اکاؤنٹ کھلوا دیا۔ مجھے کچھ بولنے کا موقع دیے بغیر چیک بک میری جیب میں ڈال کر وہ مجھے لے کر باہر آگیا۔ میرے ساتھ ہی اسکوٹر پر بیٹھ کر اس نے کہا کہ طارق روڈ چلو۔ طارق روڈ کے ایک چائنیز ریسٹورنٹ پر ہم لوگ رکے۔ دوپہر کا کھانا کھایا، پھر اس نے پاسپورٹ کے بقیہ ڈیڑھ لاکھ روپے اور پینتیس ہزار روپے امریکا کے ٹکٹ کے لیے دیے اور کہا کہ جتنی جلدی کا ٹکٹ بن سکے، بنوا لینا۔ پھر اس نے خود ہی کہا کہ یہ پانچ لاکھ روپے تمہارے اکاؤنٹ میں ہیں جس کا مجھے اور

صرف تمھیں پتا ہے۔ جب بھی میری بہنوں کی شادی کا مسئلہ ہوگا ضرورت کے مطابق میری ماں کو دے دینا۔

اس نے ہی مجھے بتایا تھا کہ اس کے گھر پر مکمل پہرہ ہے وہ گھر نہیں جا سکے گا۔ نہ ماں سے مل سکے گا زندگی بچ گئی تو پھر دیکھا جائے گا۔ میں چاہنے کے باوجود اس سے ان پیسوں کے بارے میں کچھ نہیں پوچھ سکا کہ اس کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے ہیں، اس قتل کا تعلق پیسوں سے ہے تو کیا ہے؟ گزشتہ چند سال میں میرے اسکول کا دوست ہاشم، معصومیت، شرافت، محنت، دیانت کی دیوار پھاند کر کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی اسے قاتل اور خونی سمجھنے کو تیار نہیں تھا۔

میں وہاں سے نکل کر ساجد کے پاس گیا۔ ساجد نے مجھے ہاشم کا پاسپورٹ دکھایا جو کسی محمد جمیل رضا کے پاسپورٹ پر بنایا گیا تھا۔ جس پر امریکا کے لیے پانچ سال کا ویزا لگا ہوا تھا۔ ناظم آباد کے کسی گھر کا پتا تھا اور بتایا کہ پانچ تاریخ کے گلف ایئر لائنز رات کو جہاز جائے گا۔ دو دن کے بعد میں آکر ٹکٹ وغیرہ لے لوں۔

دوسرے دن صبح میں نے ہاشم کی ماں کو بتایا کہ ہاشم کا کیا پروگرام ہے۔ ان کے چہرے کی بدلتی رنگت بتا رہی تھی کہ وہ کتنی پریشان ہوگئی تھیں۔ پھر پانچ دن کے بعد رات کی فلائٹ سے ہاشم نکل گیا۔ میں اس کے جانے سے ایک دن پہلے ملا تھا، کیماڑی کے پٹھان کے ہوٹل میں اس سے گلے لگ کر رویا تھا۔ ساتھ چائے پی تھی اور پھر زیرو پوائنٹ تک اسے لے کر آیا تھا۔

پھر اس کا خط نیویارک سے آیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ جس دن اس کا خط آیا تھا اسی دن رات کو پھر وہ چار لوگ میرے گھر گھس آئے اور میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے وہ خط ہی انھیں دکھا دیا تھا۔

وہ لوگ خط لے کر چلے گئے تھے مگر انھوں نے کہا تھا کہ ہاشم کو اس غداری کی سزا ضرور ملے گی۔ ہم لوگ اسے بھولیں گے نہیں۔

پھر دن ہفتے، ہفتے مہینے اور مہینے سال بن گئے۔ میری ایک بہن کی شادی ہوگئی اور میں لانڈھی میں اپنا مکان بیچ کر گلشن کے ایک فلیٹ میں شفٹ ہوگیا اور ہاشم کی بھی ایک بہن کی شادی ایک سال بعد ہوگئی اور تیسرے سال میں اس کی دوسری بہن بھی بیاہ کر چلی گئی تھی۔ میں نے بینک سے پیسے نکال کر ہاشم کی ماں کو دے دیے تھے اور سب کچھ عزت سے ہوگیا تھا۔

پھر یکایک ہاشم کے ماں کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ علاج ہوتا رہا مگر ان کی طبیعت بگڑتی گئی۔ ہاشم کا فون پابندی سے آتا تھا اور اس دن فون کرکے اس نے مجھے تاکید کی تھی کہ اس کی

ماں کو کسی اسپیشلسٹ کو دکھانا ضروری ہوگیا ہے۔ وہ شدید احساس جرم کا شکار تھا۔ اسے اس بات کا شدید احساس تھا کہ وہ ایسے حالات میں پھنس گیا تھا کہ اپنی ماں سے ملے بغیر اسے شہر چھوڑنا پڑ گیا اور اب پانچ سال کے بعد کراچی کے نام سے اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی تھی۔ اب تو اسے گرین کارڈ بھی مل گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ بالکل بھی فکر نہ کرے اس کی ماں کا مناسب علاج ہوگا۔

میں انھیں سول ہسپتال کے میڈیکل وارڈ میں لے گیا جہاں پروفیسر صاحب نے دیکھنے کے بعد انھیں فوراً ہی داخل کرلیا۔ ان کا دل فیل ہورہا تھا۔ ان کی طبیعت صحیح نہیں تھی۔ ان کے تمام جسم پر ورم تھا، مشکل سے رک رک کر سانس لیتی تھیں۔

میڈیکل وارڈ کے کاریڈور میں لیٹے لیٹے نہ جانے کس خدشے کے ساتھ انھوں نے میرا ہاتھ پکڑلیا۔ بیٹے حامد! ہاشم تو ٹھیک ہے ناں؟ اسے مت بتانا کہ میں بیمار ہوں، ورنہ وہ آجائے گا، پھر یہاں کا تو تمھیں پتا ہی ہے۔ روز لوگوں کی لاشیں ملتی ہیں۔ نہ جانے اس نے کس کا کیا بگاڑا ہے کہ لوگ اس کے دشمن ہوگئے ہیں۔

میں نے آہستہ آہستہ ان کا ہاتھ دبانا شروع کردیا۔ انھوں نے آنکھیں بند کرلیں۔ میں انھیں کچھ بھی تو نہیں بتاسکتا تھا۔ نہ بھتے کے روپوں کا ذکر، جو ہاشم نے اپنے پاسپورٹ کے لیے خرچ کیے تھے اور نہ وہ پانچ لاکھ جن سے ان کی بیٹوں کی شادی ہوئی تھی۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور وہ دھیرے سے مسکرائی تھیں اور کہنے لگیں۔ "جب ہاشم چھوٹا تھا، بہت چھوٹا، تو میں ایسے ہی لیٹ جاتی تھی اور ہاشم ننھے ننھے ہاتھوں سے میرا سر، میرے ہاتھ، میرا جسم اور میرے پاؤں دبایا کرتا تھا، دھیرے دھیرے۔ کئی سال پہلے جب وہ لڑکے رات کو گھر آئے، ہاشم کی تلاش میں، تو اس کے بعد سے جب تک ہاشم چلا نہیں گیا تھا، میں راتوں کو خواب میں وہ کٹے ہوئے ہاتھ دیکھا کرتی تھی۔ شکر ہے کہ وہ چلا گیا۔ مالک اسے زندہ رکھنا، مالک اسے اچھا رکھنا، مالک اسے صحت دے۔ اس کی مشکل آسان کر۔" آہستہ آہستہ دعائیں کرتے ہوئے انھیں غنودگی سی آگئی تھی۔

رات کو ہاشم کا فون آیا۔ میں چاہنے کے باوجود اس سے ماں کی اصل حالت نہیں چھپا سکا۔ وہ شدید بیمار تھیں۔ اسے بتا دینا چاہیے تھا۔ شاید میں نے یہ زندگی کی سب سے بڑی غلطی کردی تھی۔

دوسرے دن شام کو اس کا فون آیا کہ وہ آرہا ہے۔ وہ امریکا کے کسی ایئرپورٹ سے بول رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ مت آئے۔ کراچی کے حالات نہیں بدلے ہیں۔ اس نے کہا تھا

وہ ایئرپورٹ سے بول رہا ہے اور اب آدھے گھنٹے میں فلائٹ نکلنے والی ہے۔ میرے سمجھانے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

دوسرے دن اس کی ماں کی حالت تھوڑی سی بہتر ہوئی۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ کہہ بیٹھی تھیں کہ "بیٹے اس کا فون آئے تو کہنا سب ٹھیک ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں' بالکل اچھی۔" اگلی صبح ان کی حالت بگڑ گئی۔ ساری دوائیں موجود تھیں۔ پروفیسر صاحب خود ان کو دیکھ رہے تھے۔ جان پہچان کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی خیال رکھا جارہا تھا' مگر وہ ہوش اور بے ہوشی کے درمیان جھول رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ شاید نہیں بچیں گی۔ چلو رات کو ہاشم بھی آجائے گا تو کم از کم مرنے سے پہلے دیکھ تو لے گا۔

میں اسے ایئرپورٹ سے اپنی آلٹو میں لے کر نکلا۔ میں نے اسے بتایا کہ ماں کی حالت کافی خراب ہے اور ہم سیدھے ہسپتال ہی جارہے ہیں' مگر اسٹار گیٹ کے فوراً بعد کالونی گیٹ سے پہلے قبرستان کے سامنے ایک پیلی ٹیکسی نے میرا راستہ روک لیا۔ مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کرتی ہوئی اس ٹھنڈ کا احساس بہت دنوں تک رہا تھا اور دو منٹ کے اندر ان تین آدمیوں نے میری گاڑی کا دروازہ کھول کر ہاشم کو سامان کی طرح اٹھا کر اپنی پیلی ٹیکسی میں ڈالا اور تیزی سے نکل گئے۔ دو دن تک ہاشم کا کچھ پتا نہیں لگا اور اسی شام ہاشم کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ وہ اپنے بچے کے ننھے ننھے ہاتھوں کو یاد کرتی ہوئی یکایک ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی تھیں۔ جنازے کے لیے میت تیار تھی تو کورنگی روڈ کے ساتھ ٹاٹ کی بوری ملنے کی خبر آئی۔ ہاشم کا جسم ٹکڑے ٹکڑے کرکے اس بوری میں رکھا ہوا تھا۔ سر اور جسم پر چوٹ کے نشان تھے۔ دونوں آنکھوں کو کسی سوئے سے بھونک کر پھوڑ دیا گیا تھا۔ ماں کے جنازے کے ساتھ بیٹے کا بھی جنازہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کے ساتھ اور جسم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے ساتھ۔

بڈو

وہ کالا بورڈ میں گندے نالے کے پُل کے نیچے پیدا ہوا تھا۔ وہی ملیر والا کالا بورڈ، بہت کم لوگوں کو پتا ہے کہ کالا بورڈ کے بس اسٹاپ کا نام کالا بورڈ کیوں ہے۔ بہت پہلے جب لانڈھی اور کورنگی کے صنعتی علاقے نہیں بنے تھے تو ائرپورٹ سے آنے والی پتلی سی سڑک پر جو ملیر سٹی کی طرف جاتی تھی سعود آباد موڑ پر ایک بڑا سا کالے رنگ کا سیمنٹ کا بورڈ بنایا گیا تھا جس پر اس پورے علاقے کا نقشہ بنا ہوا تھا کہ مکان کہاں ہوں گے، اسکول کدھر بنے گا، پارک، ہسپتال، کمیونٹی سینٹر، کھیل کے میدان اور تجارتی مرکز کدھر کدھر ہوں گے۔ پھر بس کے کنڈکٹروں نے اس جگہ کا نام ہی کالا بورڈ رکھ دیا تھا۔

ایک دن ملیر ندی سے آنے والا بجری کا ایک ٹرک بے قابو ہوگیا اور اس بڑے سے کالے سے بورڈ سے ٹکرا گیا۔ ٹرک اور کالا بورڈ دونوں ہی ٹوٹ گئے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ کالا بورڈ ٹوٹ پھوٹ کر زمین سے ملتا گیا تھا اور پھر صرف نام رہ گیا تھا۔ آج تک اس بس اسٹاپ کا نام کالا بورڈ ہی ہے۔ ملیر سعود آباد کا نقشہ بدل گیا ہے۔ پارکوں کی جگہ پر مسجد اور دوکانیں بن گئی ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں کی جگہ پر بلڈنگیں کھڑی ہوگئی ہیں۔ کھیل کے میدانوں پر بیداگیروں کا قبضہ ہوگیا ہے۔ بھلا ہو اس ٹرک کا جس نے اس اصل بنے ہوئے نقشے کے کالے بورڈ کو گرا دیا اور آج کے کونسلروں، صوبائی قومی اسمبلی کے ممبروں اور کے ڈی اے، کے ایم سی کے اہل کاروں کو شرمندگی سے بچالیا ہے۔

کالا بورڈ پر ہی سعود آباد سے آنے والا نالہ سڑک کے ساتھ ساتھ قومی شاہراہ سے ملتا ہے اور قومی شاہراہ کے نیچے سے گزر کر کراچی سے آنے والی ریلوے کی پٹڑی کے ساتھ بننے والے نالے میں مل جاتا ہے۔ یہ نالہ عام دنوں میں اتنا ہی بھرتا ہے کہ سڑک اور پٹڑی کے درمیان ہریالی برقرار رہتی ہے اور جب بارش ہوتی ہے تو یہ نالہ اُبل پڑتا ہے۔ اب تو دونوں جانب سے دو رویہ سڑکیں بن گئی ہیں اور نالے کے اوپر پختہ چھت بنا دی گئی ہے جس پر ٹھیلے والے پھلوں،

پکوڑوں، پان اور مچھلی کی دوکانیں لگاتے ہیں۔ پہلے بہت پہلے اس نالے میں برسات کے زمانے میں گلی کے بچے نہایا بھی کرتے تھے۔ یہ کہانی اسی زمانے کی ہے۔

پانچ بچوں میں صرف وہی کالا تھا۔ اس کی ماں اور بقیہ چار بھائی بھن بھورے رنگ کے تھے۔ وہ پانچوں اپنی ماں کے پیچھے پیچھے پھرتے رہتے تھے جو ادھر ادھر اپنے پانچوں بچوں کی رہنمائی کرتی رہتی تھی کہ غذا کہاں ملے گی۔ زندہ کیسے رہا جائے گا۔ پیدا ہونے کے ساتھ ہی زندہ رہنے کی جدوجہد شاید فطری جبر ہے، انسان ہوں کہ جانور۔ یہ بات جانور فوراً ہی سمجھ لیتے ہیں مگر انسان کے بچے کو یہ بات بہت دیر سے سمجھ میں آتی ہے اور جب وہ سمجھ لیتا ہے تو صرف زندہ نہیں رہنا چاہتا ہے بلکہ بہت شان سے زندہ رہنا چاہتا ہے اور وہ سب کچھ کرتا ہے جو جانور سوچتے بھی نہیں ہیں اور شاید سمجھتے بھی نہیں ہیں۔

میں بہت چھوٹا تھا اور اسکول میں پڑھتا تھا۔ اس دن وہ سب کچھ میرے سامنے ہوا۔ دوپہر کے وقت میں اسکول سے گھر واپس آرہا تھا تو میں نے دیکھا کہ دوپہر کی تپتی ہوئی دھوپ میں وہ پانچوں اپنی ماں کے ساتھ ریل کی پٹری کی طرف سے کالا بورڈ پر سڑک پار کرکے شاید گندے نالے کے پل کے نیچے سائے کی تلاش میں جارہے تھے۔ یہ عام سی بات تھی۔ مسافر ٹرینوں کے گزرنے کے بعد عام طور پر کتے مسافروں کے پھینکے ہوئے کھانے کی تلاش میں جایا ہی کرتے تھے اور شاید وہ پانچوں بھی اپنی ماں کے ساتھ کچھ کھا کر ہی واپس آرہے تھے کہ بیچ سڑک پہ نہ جانے کہاں سے بجری کے دو ٹرک آپس میں ریس لگاتے ہوئے چلے آرہے تھے اور سب کچھ آناً "فاناً" ہی ہوگیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس کی ماں اور چار بچے سڑک کے بیچ میں ٹرک کے پہیوں کے نیچے آکر فوراً" ہی ختم ہوگئے تھے۔ سرخ خون بالکل انسانوں جیسا خون، سڑک پر اپنا نشان بنا رہا تھا۔ نہ جانے وہ کالا چھوٹا سا کتا کیسے بچ گیا تھا۔ مجھے اچھے طریقے سے یاد ہے۔ میں سڑک کے کنارے گم سم ساکت سا، بے حواس کھڑا ہوا گوشت کے سرخ ٹکڑوں اور ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو تک رہا تھا اور وہ چھوٹا سا پلا اپنی ماں کے چیتھڑے جسم کو بار بار پکڑ کر کھینچنے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ تصویر جیسے میرے ذہن کے کسی گوشے میں، کسی خانے میں، جم کر رہ گئی تھی۔ تھوڑی دیر میں ہی ٹریفک دوبارہ ویسے ہی شروع ہوگئی تھی۔ نہ جانے والوں کو پتا تھا نہ آنے والوں کو علم تھا کہ کیا ہوچکا ہے۔ اگر زاہد نہیں ہوتا تو شاید وہ کالا پلا بھی دوسری گاڑیوں کی نذر ہوچکا ہوتا۔ نہ جانے کہاں سے زاہد دو بانس لے کر آیا تھا اور بانس سے اس کتیا اور اس کے چاروں پلوں کو آہستہ آہستہ گھسیٹ کر کالا بورڈ کے نالے میں دھکیل دیا تھا۔ پھر نہ جانے زاہد کے دل میں کیا خیال آیا تھا کہ

اس نے اس کالے سے پلّے کو جھپٹ کر اٹھالیا تھا۔
اسی وقت نہ جانے کیوں مجھے بے ساختہ اور بے اختیار اس چھوٹے سے کالے سے پلّے پر پیار آگیا۔ میں تیزی سے زاہد کے پاس گیا اور سہمے ہوئے اس کتے کے سر پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگ گیا تھا۔
زاہد نے کہا تھا "یہ بہت ڈر گیا ہے دیکھو پورا جسم جیسے تھرتھرا رہا ہے۔ میں اسے اپنے پلاٹ پر لے جاتا ہوں۔"
بس اسٹاپ پر اور بھی بہت سے لوگ کھڑے تھے وسیم پان والے نے زور سے کہا تھا "ابے لے جا لے جا، بڑا ہو جائے گا تو پلاٹ کی رکھوالی ہی کرے گا اور تو مزے سے اپنی خرمستی کرتے رہیو۔" وہ دونوں ہی زور سے ہنسے تھے۔
جبار پھل والے نے کہا "ابے کوئی نام رکھ لیجو اس کا۔ اب تو بے ماں کا ہو گیا ہے۔ سبھی مر گئے اس کے تو۔"
زاہد پھر ہنسا۔ میں ابھی تک اس سہمے ہوئے پلّے پر ہاتھ پھیر رہا تھا کہ زاہد نے مجھ سے کہا، بابو میاں آپ نام رکھ دیں اس کا۔ آپ مدرسے سے آرہے ہیں نا"
میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں کیا جواب دوں، میں سوچ ہی رہا تھا کہ زاہد نے پھر کہا "بڈو کیسا رہے گا؟"
"بہت بھلا نام ہے۔ یہ تو لگتا ہی بڈو ہے۔"
پھر اس کا نام بڈو پڑ گیا۔ زاہد اسے اپنے ساتھ لے کر چلا گیا۔ زاہد سیمنٹ ڈپو اور سنہری مسجد سے آگے ریلوے کے بھوت والے پل کے سامنے ایک خالی پلاٹ کا چوکیدار تھا۔ کالا بورڈ سے ملیر سٹی کی طرف جاتے ہوئے اس وقت قاری منزل کی دیوار کے بعد صرف اس پلاٹ کی چار دیواری بنی ہوئی تھی اور کچھ اور پلاٹوں پر تعمیر کا کام جاری تھا۔ بڈو زاہد کے ساتھ اس پلاٹ پر رہنے لگا تھا۔
میں خود سراسیمہ اور پریشان سا جب گھر پہنچا تو بار بار یہ حادثہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا۔ میری نانی نے مجھے میرا کھانا دیا اور میں نے انھیں بتایا کہ کس طرح کالا بورڈ پر یہ حادثہ ہوا تھا۔ وہ بہت مذہبی خاتون تھیں۔ ان کے خیال میں دنیا میں ہونے والا ہر امر صرف خدا کی مرضی سے ہوتا ہے اور صرف اس لیے ہوتا ہے کہ اس میں کوئی نہ کوئی اچھائی ہوتی ہے اور اس حادثے میں بھی انھوں نے بہت سارے اچھے پہلو نکال لیے تھے۔ خدا کی مرضی کا یہ فلسفہ ہی تو تھا جس

کے تحت ہمارے بزرگ اپنی مشکل زندگیوں کو بھی آسانی سے گزار لیتے تھے۔ اب تو ہم لوگ ہروقت سوال کرتے ہیں اور یہ سوال ہمیں کیا دیتے ہیں' الجھنیں' پریشانیاں' محرومیاں اور غصہ' زندگی آسان ہوجانے کے باوجود مشکل ہے' بہت مشکل۔ مجھے تسلی سی ہوگئی تھی۔

بڈو سے میری دوسری ملاقات بہت جلدی ہوگئی تھی۔ ملیر اے ایریا کی مارکیٹ میں غوثیہ مسجد کی دوکانوں میں کرائے کی کتابوں کی دوکان تھی جہاں ایک آنہ روز پر کتابیں کرائے پر ملتی تھیں۔ دوسرا دن چھٹی کا تھا۔ میں دوپہر کو سونے کے بعد گھر سے نکلا تھا کہ جاکر کچھ ابنِ صفی کی کتابیں اور عالمی ڈائجسٹ لے کر آؤں تاکہ کل اسکول کا کام ختم کرکے دن میں یہ کتابیں پڑھی جائیں۔ مارکیٹ کی طرف مڑنے سے پہلے زاہد کے پلاٹ کے پاس وہ سب لوگ بڈو کو گھیرے کھڑے تھے۔ گلو' حمید' محلے کے اور لڑکے موجود تھے اور ابراہیم نے بڈو کو پکڑا ہوا تھا۔ گلو ان سب میں بہت شریر تھا۔ میری نانی مجھے ہمیشہ گلو کے ساتھ کھیلنے سے منع کرتی تھیں۔ میرے بیچ میں آنے سے پہلے میں نے دیکھا تھا گلو کے پاس پتلی سی کوئی چیز تھی جس کے دونوں طرف لکڑی کے دو ٹکڑے بندھے ہوئے تھے اور ان لوگوں نے بڈو کی دم کو بیچ میں باندھا ہوا تھا اور لکڑی کے دونوں ٹکڑوں کو ایک طرف سے گلو نے پکڑ کر ابراہیم سے کہا تھا کہ دوسرا سرا پکڑ کر بڈو کو چھوڑ دے۔ جیسے ہی ابراہیم نے بڈو کو چھوڑا' گلو نے زور سے اپنی لکڑی کے ٹکڑے کو کھینچا تھا۔ مجھے تو صرف یہ نظر آیا کہ بڈو زور سے چیخا اور چیں چیں کرتا ہوا دور بھاگ گیا۔ زمین پر بڈو کی آدھی کٹی ہوئی دُم پڑی ہوئی تھی۔

سارے بچے زور زور سے ہنسنے لگے۔ گلو نے چیخ کر کہا تھا یہ ملاکر میرے اکتیس دُم ہوگئے۔ گلو مجھے پھر کبھی بھی اچھا نہیں لگا۔ گلی میں' شہر میں' کہیں بھی کوئی بھی دُم کٹا کتا دیکھ کر مجھے شدید خوف سا آتا ہے۔ بڈو کی بے چارگی یاد آتی ہے اور گلو کا بدصورت چہرہ یاد آجاتا ہے۔ گلو اب بڑا آدمی ہے۔ ہمارے علاقے کا سیاسی لیڈر ہے۔ وہ یونیورسٹی میں بھی لیڈر تھا اور اب بھی ہے لیکن میں اسے کبھی بھی معاف نہیں کرپایا ہوں۔ اس نے بڈو کی اور بڈو جیسے نہ جانے کتنے کتوں بلیوں کی دم کاٹی ہوگی' بغیر کسی وجہ اور مقصد کے۔ اس کھیل کا مجھے بعد میں پتا لگا تھا۔

گھوڑے کے دُم کے بال یا مانجھا لگے مضبوط دھاگے سے یہ کھیل ہوتا تھا۔ مجھے آج تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی ہے کہ آخر اس کھیل کی کیا ضرورت تھی' کیا مزا تھا اس کھیل میں اور کس قسم کا اطمینان نصیب ہوتا تھا؟ ہم لوگ بچپن سے ایسے کھیل کھیلتے ہیں جس میں جان دار کو تکلیف پہنچاکر ہمیں مزا آتا ہے۔ بڑے ہوکر انسانوں کو ماردینا بھی تو پھر آسان ہی ہوجاتا ہوگا۔

مجھے اس دن شدید تکلیف ہوئی تھی۔ بڈو کی زندگی بھی کیا زندگی تھی۔ آنکھوں کے سامنے ٹرک نے ماں کو کچل دیا تھا' ایک انسان نے پناہ دی تھی تو پھر انسانوں کے بچوں نے دُم کاٹ دی۔ میں نے کتابوں کی دکان سے واپسی پر لالہ کے تندور سے ایک روٹی خریدی تھی اور زاہد کے پلاٹ پر بڈو کو جاکر اپنے ہاتھوں سے کھلائی۔ وہ مجھے پہچان گیا تھا' اپنی تکلیف کو بھول کر وہ میرے قدموں پر مچل مچل سا گیا تھا۔

دوسرے دن صبح کو میں اپنا بستہ اٹھا کر اسکول جانے کے لیے نکلا تو رات کی بچی ہوئی ایک روٹی بھی میرے پاس تھی۔ میں پہلے پل کے سامنے زاہد کے پلاٹ پر گیا تھا' بڈو کو روٹی کھلائی' پھر اسکول روانہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنی کٹی ہوئی دُم ہلاتا ہوا میرے ساتھ ساتھ گیا تھا۔

پھر نہ جانے کیسے آہستہ آہستہ یہ معمول سا بن گیا تھا کہ میں جیسے ہی گھر سے نکلتا تھا تو بڈو سامنے موجود ہوتا۔ میں اسے باسی روٹی یا گوشت کا کوئی ٹکڑا دیتا تھا جسے وہ کھا کر دُم ہلاتا ہوا میرے ساتھ ساتھ چلتا تھا اور جب میں روڈ پار کرنے لگتا تھا تو وہ پلاٹ کی طرف چلا جاتا۔ دو بجے جب میں اسکول سے آتا تھا تو وہ مجھے روڈ کے کنارے ہی مل جاتا تھا۔ میرے آگے پیچھے اچھلتا کودتا ہوا مجھے میرے گھر تک چھوڑنے آتا۔

اسی قسم کے والہانہ پن کا اظہار وہ زاہد کے ساتھ بھی کرتا تھا۔ زاہد تو اس کا مالک بھی تھا اور شاید اس کی جان بچانے والا بھی۔ زاہد بھی اس کے ساتھ بہت مانوس ہو گیا تھا۔ میں اکثر دیکھتا تھا کہ وہ پلاٹ کے گیٹ پر کھڑا رہتا تھا اور پلاٹ کی طرف رخ کرنے والوں پر بے تحاشا بھونکنے لگتا تھا یہاں تک کے زاہد کو باہر آنا پڑتا تھا۔ زاہد اسے پیار سے ڈانٹ کر بولتا تھا۔ "بڈو چپ ہو جا' بیٹھ جا" اور بڈو دُم ہلاتا ہوا کونے میں ساکت ہو کر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ وقفے وقفے سے اس کی کٹی ہوئی دُم ہلتی تھی اور آنکھوں میں بے تحاشا تشکر کے جذبات ہوتے تھے۔ نہ جانے کتوں میں وفاداری کہاں سے آئی تھی۔ قدرت نے انسان کو زبان دے کر وفا چھین لی اور کتے سے زبان لے کر وفا دے دی۔ قدرت کا نظام قدرت ہی سمجھے۔

زاہد عجیب سا لا ابالی انسان تھا کسی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ اس پلاٹ پر کیسے رہ رہا ہے' یہ کس کا پلاٹ ہے' وہ کیا کرتا ہے اور اس پلاٹ پر کیا ہو گا؟ پلاٹ پر بنے ہوئے ایک کمرے میں اس کی رہائش تھی اور محلے کے دوسرے لاابالی نوجوان وہاں جمع رہتے تھے۔ وہ سب سگریٹ پیتے تھے' تاش کھیلتے تھے اور زور زور سے ہنستے رہتے تھے۔ ان کی بہت ساری باتیں اس وقت میری سمجھ سے بالاتر تھیں مگر اب مجھے سمجھ میں آتا ہے کہ وہاں کیا ہوتا تھا۔ وہ لوگ وہاں چرس بھی

پیتے تھے اور شاید زاہد ہی چرس بیچنے کا ذمہ دار بھی تھا۔ محلے کے جرائم پیشہ نوجوان دہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ آہستہ آہستہ مجھے پتا لگ گیا تھا کہ کوئی بھی انھیں پسند نہیں کرتا ہے۔ ایک دفعہ میں نے مسجد میں یہ بات چیت بھی سنی تھی جس میں منظور صاحب رضمی صاحب کو کہہ رہے تھے کہ "پتا کرنا چاہیے کہ یہ پلاٹ ہے کس کا اور ان لوگوں کو بتانا چاہیے کہ زاہد کی سرگرمیاں کیا ہیں۔"

وقت گزرتا گیا۔ میں اسکول کے آخری سال میں پہنچ گیا تھا اور بڈو چھوٹے پلّے سے بڑا ہوکر پورا کتا بن گیا تھا۔ زاہد جتنا بھی بُرا تھا محلے والے جتنے بھی اس سے ناخوش تھے وہ اپنی جگہ پر مگر اس نے بڈو کا بڑا خیال کیا تھا۔ دُم کٹا بڈو زاہد کے آگے پیچھے اس طرح سے گھومتا تھا جیسے کسی حکم کا منتظر ہو اور زاہد کی مرضی کے بغیر بڈو کسی کو بھی پلاٹ میں گھسنے نہیں دیتا تھا۔

پھر چند عجیب و غریب باتیں ہوئی تھیں جن کا بظاہر تو کوئی واسطہ نہیں تھا اور اس وقت میں سمجھا بھی نہیں تھا مگر اب کئی سال کے بعد آہستہ آہستہ دماغ میں یہ واقعات ریل کی طرح گاہے بہ گاہے چلتے ہیں اور ایک دوسرے سے منسلک ہوتے جاتے ہیں اور ایک مکمل تصویر بن جاتی ہے، بہت صاف ستھری اور واضح۔ میں تو بہت نادان تھا، بہت ناسمجھ، ابنِ صفی کی ناولیں پڑھنے کے باوجود۔

ایک روز اے ایریا کی مارکیٹ جاتے ہوئے بڈو کو باسی روٹی کے ٹکڑے دینے رکا تھا تو میری نظر اس پاگل عورت پر پڑی تھی جو زاہد کے کمرے کے سامنے ایک سیمنٹ کے بلاک پر بیٹھی ہوئی تھی۔ زاہد کمرے سے پلیٹ میں کوئی چیز لے کر آیا مگر مجھے دیکھتے ہی واپس چلا گیا۔ میں بڈو کے سامنے روٹیاں ڈال کر نکل گیا تھا۔ یہ تو وہی پاگل عورت تھی جو کبھی کالا بورڈ پر، کبھی اے ایریا کی مارکیٹ میں، کبھی پندرہ نمبر کے اسٹاپ پر ہاتھ میں پتھر لے کر گھوما کرتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ اس پلاٹ پر کیا کر رہی تھی۔ وہ مجھے پہلے کبھی وہاں نظر نہیں آئی تھی۔ کر رہی ہوگی کچھ، میں نے دماغ سے جھٹک دیا تھا۔

پھر وہ مجھے کئی دفعہ نظر آئی۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے وہ کچھ بدل رہی ہے۔ میں اس وقت نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ کیوں بدل رہی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ کالا بورڈ پر ایرانی ہوٹل کے سامنے پان کی دوکان پر محلے کے کچھ لوگوں کو میں نے یہ بھی کہتے ہوئے سنا تھا کہ پتا نہیں کون جانور ہے جس نے اس پاگل کو بھی نہیں چھوڑا ہے، پتا نہیں اب کیا ہوگا۔

لیکن ایک بات جو کسی کو بھی پتا نہیں ہے، صرف میں جانتا تھا لیکن بہت دنوں بعد سمجھا تھا۔

سردیوں کی ایک رات کے بعد صبح منہ اندھیرے فجر کی اذان کے فوراً بعد جب میں نماز پڑھنے مسجد جا رہا تھا تو میں نے بڈو کو دور سے پہچان لیا تھا جو تیزی سے گزرتی ہوئی ٹرین کے بعد نظر آیا تھا میں جھجک کر دیکھ ہی رہا تھا کہ پھر مجھے زاہد نظر آیا جو دوڑتا ہوا پلاٹ میں گھس گیا تھا۔ بڈو پھر میرے پاس آیا اور میرے ساتھ ساتھ مسجد کے قریب تک جا کر بھونکتا ہوا واپس چلا گیا۔ وہ کبھی بھی مسجد کے پاس نہیں آتا تھا کیوں کہ نمازی پتھر مار کر اسے بھگا دیا کرتے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ سمجھ گیا تھا کہ مسجد کے قریب نہیں جانا ہے۔

میں اسکول سے واپس آیا تھا تو مجھے پتا لگا تھا کہ صبح ٹرین کے نیچے آ کر کسی عورت نے جان دے دی ہے۔ پھر مجھے وہ پاگل عورت نظر نہیں آئی۔ نہ محلے میں نہ روڈ پر اور نہ ہی زاہد کے ٹھکانے پر۔ مجھے کچھ دنوں کے بعد پتا لگا تھا کہ ٹرین کے نیچے مرنے والی حاملہ عورت وہ پاگل عورت تھی۔ اس وقت بھی فجر کے وقت بڈو اور زاہد کا نظر آنا مجھے یاد نہیں آیا تھا۔

مجھے دو چار دفعہ زاہد نظر آیا تھا دوپہر کو اسکول سے واپسی یا شام کو کبھی کبھار بڈو کو کھانا دینے کے وقت مگر مجھے وہ اداس سا لگا تھا۔ بجھا بجھا، جیسے کچھ پریشان ہو۔ اس کے اڈے پر لوگ بھی نہیں تھے۔ اس دن وہ بے چینی سے چاروں طرف گھوم رہا تھا۔ وہ عام طور پر مجھ سے بات چیت نہیں کرتا تھا مگر نہ جانے کیوں میرے قریب آ گیا تھا۔ بڈو اپنی کٹی ہوئی دُم ہلا ہلا کر میرے پیروں میں مچل رہا تھا۔ زاہد نے بہت غور سے اسے دیکھا تھا، پھر مجھ سے بولا۔ ''بابو میاں میں اگر کہیں چلا جاؤں تو آپ بڈو کو کھانا تو کھلا دو گے نا؟''

میں نے کہا، ''ضرور، کیوں نہیں۔ پابندی کے ساتھ، لیکن تم جا کہاں رہے ہو؟''

''نہیں، کہیں بھی نہیں۔ ایسے ہی پوچھ رہا ہوں۔'' پھر وہ سوچتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تھا۔ میں بڈو سے کھیل ہی رہا تھا کہ گلو آیا تھا۔ بڈو اسے دیکھ کر بھونکا مگر زاہد باہر آ کر گلو کو اپنے ساتھ اندر لے کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ دونوں ساتھ ہی باہر آئے تھے۔ گلو مسکرا رہا تھا اور زاہد مجھے اور بھی پریشان سا لگ رہا تھا۔ گلو کے جانے کے بعد زاہد بے چینی سے ادھر ادھر گھومتا رہا، پھر جا کر اسی سیمنٹ کے بلاک پر بیٹھ گیا تھا جہاں میں نے اس پاگل عورت کو بیٹھا ہوا دیکھا تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے وہ کسی کرب سے گزر رہا ہے اندر سے کوئی چیز ہے جو اسے مارے ڈال رہی ہے۔ اس وقت میں نہیں سمجھا تھا کہ وہ کیوں پریشان ہے، وہ کیا سوچ رہا ہے کیوں، مجھ سے بڈو کو کھانا کھلانے کے وعدے لے رہا ہے، کون سا احساسِ جرم ہے جو اسے کچوکے لگا رہا ہے؟

دو دن بعد زاہد نے خودکشی کرلی۔ بھوت والے پل کے اوپر صبح سویرے ایکسپریس ٹرین کے نیچے آکر اس نے جان دے دی۔ اس وقت میں تانوں بانوں کو نہیں ملا سکا تھا مگر آج میں سوچتا ہوں کہ زاہد اس حاملہ پاگل عورت کو اپنا جرم چھپانے کے لیے ٹرین کے نیچے دھکا دے کر آرام سے نہیں بیٹھ سکا۔ وہ چرسی تھا اور چرس کے کاروبار میں تھا مگر احساسِ جرم اسے بے چین کیے رہا ہوگا۔ اس وقت کوئی بھی یہاں تک کہ میں بھی جس نے فجر کے وقت اس رات زاہد کو دیکھا تھا ٹرین کے سامنے ہونے والی دونوں موتوں کے درمیان کوئی تعلق نہ محسوس کرسکا تھا' نہ تلاش کرسکا تھا۔

بڈو نے ہی اپنے مالک کو ٹرین کے سامنے گرتے دیکھا تھا۔ بڈو ہی وہاں اس وقت تک بیٹھا رہا' جب تک پولیس والے لاش کو اٹھا کر نہیں لے گئے۔ پھر بڈو پلاٹ کے سامنے آکر بیٹھ گیا تھا۔ زاہد کا پوسٹ مارٹم ہوا' محلے والوں نے مل کر اس کا جنازہ اٹھایا' اسے قبرستان لے جاکر دفن کردیا۔ بڈو اس گیٹ کے سامنے سے نہیں ہٹتا تھا۔

میری باسی روٹیوں کے ٹکڑے وہاں جمع ہوتے رہے تھے۔ میں نے بہت کوشش کی تھی کہ بڈو پانی پی لے' تھوڑی روٹی کھالے۔ وہ مجھے دیکھتا تھا اور دھیرے دھیرے دم ہلاتا تھا مگر نہ کھاتا تھا نہ پیتا تھا۔ وہ لاغر ہوتا چلا گیا تھا۔ محلے کے دوسرے کتے میرے رکھے ہوئے روٹی کے ٹکڑے اور چھیچھڑے کھارہے تھے مگر بڈو اس بلاک پر جہاں زاہد بیٹھتا تھا' بیٹھا ہوا ٹکر ٹکر آسمان کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ مجھے اس کی آنکھیں یاد ہیں جو میں نے آخری دفعہ دیکھی تھیں۔ کھوئی کھوئی' ویران ویران سی آنکھیں۔ اس نے مجھے دیکھ کر زمین پر پڑے پڑے کوشش کی تھی کہ اپنی دُم ہلائے' اپنی وفاداری کا یقین دلائے' میرے روٹی کے احسان کا شکرگزار ہو' مگر وہ کچھ نہیں کرسکا تھا مجھے ایسا لگا تھا جیسے کمزوری کی وجہ سے وہ اپنی آنکھیں تک نہیں کھول پارہا ہے۔

میرا دل بھر آیا۔ میں گھبرا کر زمین پر بیٹھ گیا تھا' میں نے پورے خشوع و خضوع کے ساتھ دعا مانگی تھی میرے خدا' میرے اللہ میرے مالک' سارے جہانوں کے مالک' پہاڑوں کو بلندی دینے والے' آسمانوں کو بنانے والے' مُردوں کو اٹھانے والے میری یہ دعا قبول کرلے۔ بڈو کو ماردے اس کی روح کو کھینچ لے۔ یہ دعا مانگتے ہوئے میرے آنسو نکل آئے تھے۔

دوسرے دن اسکول جانے سے پہلے میں وہاں گیا تو میں نے دیکھا بڈو مرچکا تھا۔ شاید پہلی اور آخری دفعہ میں کسی کے مرنے پر بے انتہا خوش ہوا تھا۔

شکار پور سے شکاگو

کراچی ایئرپورٹ پر ستار موجود تھا۔ شکاگو سے جہاز کو کراچی پہنچنے میں پچیس گھنٹے لگ گئے تھے۔ جہاز شکاگو سے آٹھ گھنٹے میں فرینک فرٹ آیا تھا۔ دو گھنٹے فرینک فرٹ میں پورے کرنے کے بعد نو گھنٹے کا سفر دبئی تک تھا۔ دبئی میں چار گھنٹے رکنے کے بعد کراچی پہنچنے میں مزید تین گھنٹے لگ گئے تھے۔

میں دس سال سے شکاگو میں رہ رہا تھا۔ لیاقت میڈیکل کالج حیدر آباد سے ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد ہی میں نے امریکا کے ویزے کا امتحان بھی پاس کر لیا تھا۔ امریکا آنے کے بعد میں نے دماغی بیماریوں کے علاج میں مہارت حاصل کی تھی اور اس میں ہی امریکا کے بورڈ کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ امریکا بڑی جگہ ہے۔ بڑے ہسپتال ہیں اور بڑے لوگ ہیں۔ لیکن میں بھی اچھا ہی ڈاکٹر تھا۔ جب میں نے نوکری تلاش کرنی شروع کی تو تقریباً" اکیس جگہوں سے میرے لیے انٹرویو کالز آئے تھے، نو جگہ انٹرویو دینے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ شکاگو میں کام کروں گا۔

شکاگو میں کام کرنے کی کئی وجوہات تھیں۔ یہ شہر مجھے بہت پسند تھا۔ یہ امریکا کا ایک پرانا شہر ہے اس کی اپنی خوب صورتی ہے اور اپنا حسن۔ یہاں کی شدید سردی بھی اچھی ہے اور گرمی کا مزا کچھ اور ہے۔ شہر ایسا ہے کہ ہر ایک کے لیے اپنا دامن' پھیلائے بیٹھا ہے۔ کالا، گورا، مسلمان، یہودی، عیسائی، ہندو، روسی، جاپانی، چینی، آئرش ہر طرح کے لوگ یہاں مل جاتے ہیں۔ یہ شہر ہر ایک کو کچھ دینے کو تیار ہے اور ہر ایک اس شہر کو کچھ دے کر ہی جاتا ہے۔

میرا بچپن شکار پور میں گزرا تھا۔ ہزاروں سال پرانے اس شہر میں میں پیدا ہوا اس کی دھول مٹی کھا کر بڑا ہوا تھا اور یہاں کا پانی پی پی کر جوان ہوا تھا۔ میرے بچپن کا شکار پور بہت خوب صورت تھا جہاں ہندو مسلمان دونوں مل جل کر رہتے تھے۔ کہتے ہیں برسوں سے تجارتی قافلے شکار پور کے مختلف دروازوں سے آتے تھے اور کاروبار نمٹا کر ان دروازوں سے باہر چلے جاتے

تھے۔ یہ دروازے ہر ایک کے لیے کھلے ہوتے تھے۔ ہندو' مسلمان بد حسٹ' سکھ اور بعد میں عیسائی بھی۔ شہر میں رہنے والوں کی بڑی عزت تھی۔ یہ تو خود مجھے یاد ہے میرے بچپن کا شکار پور صاف تھا' خوب صورت تھا۔ روزانہ صبح صبح پورے شہر میں جھاڑو لگتا تھا اور پانی کا چھڑکاؤ ہوتا تھا۔ شام کے وقت جب شہر کی دیواریں گرم ہوتی تھیں تو بازاروں میں پانی کے چھڑکاؤ کے بعد جو سوندھی سوندھی خوشبو اٹھتی تھی وہ صرف شکار پور کی ہی خوشبو تھی۔ شکار پور کی شام کا دنیا میں کسی بھی شام سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہائے ظالم شکار پور۔ جام شورو میں پڑھنے کے دوران ہر مہینے میں دو دفعہ شکار پور کا چکر لگتا تھا۔ شکار پور کی قلفی' شکار پور کا حلوہ اور شکار پور کا اچار۔ شکار پور کی صبح' شکار پور کی شام' شکار پور کی رات۔ ہر ایک کا ایک طلسم تھا' ہر ایک کا ایک جادو۔

ڈاکٹر بننے کے بعد ایک سال کراچی میں' میں نے ہاؤس جاب کی تھی پھر سوچا تھا کہ کسی طرح سے شکار پور میں نوکری مل جائے تو پھر شکار پور ہی چلا جاؤں گا اور زندگی اچھی طرح سے گزر جائے گی۔ اپنے لوگوں کے درمیان' ان کی خدمت کرتے ہوئے' اپنے ماں باپ کی دیکھ بھال کرتے ہوئے۔ مگر کراچی میں سارا پروگرام بدل گیا۔ وہاں سول ہسپتال میں ڈاؤ میڈیکل کالج کے لڑکے تھے' کوئی انگلستان جانے کا پروگرام بنا رہا تھا' کسی نے امریکا جانے کی ٹھانی ہوئی تھی۔ میں نے بھی سوچا چلو امریکا کا امتحان تو دے ہی دیتا ہوں۔ امتحان بھی دیا اور پاس بھی ہو گیا۔ اس زمانے میں فوراً" ہی امریکا سے نوکری کی آفر آجاتی تھی۔ مجھے بھی آگئی۔

میں نے سوچا تھا کہ چار پانچ سال امریکا میں گزار کر کسی قابل بن جاؤں تو پھر واپس پاکستان آکر شکار پور میں کام کروں گا۔ کراچی تو مجھے ویسے بھی پسند نہیں تھا۔ بڑا شہر تھا اور اس کے اپنے مسائل گرد مٹی سے تو میں نہیں گھبراتا تھا مگر دھویں سے میری جان جاتی تھی' کہاں شکار پور کی ہوا' صاف ستھری جیسے سیدھی جنت سے چلی آئی ہو۔ مجھے یاد ہے جب میں چھوٹا تھا اور گرمیوں کی رات کو سوتا تھا تو فجر کے وقت کی سوندھی ٹھنڈی ہواؤں سے سردی لگتی تھی۔ میری ماں نماز پڑھنے اٹھتی تھی تو وضو سے پہلے کوئی اجرک' کوئی چادر' کوئی رلی میرے جسم پر ڈال دیتی تھی اور میرے ٹھنڈے سکڑتے ہوئے جسم میں جیسے جان پڑ جاتی تھی۔ میں روزانہ ان مہربان ہاتھوں کا انتظار کرتا رہتا تھا۔ وہ گرم گرم چادر' وہ شفیق جذبہ وہ پیار بھرا سایہ پھر کبھی نہیں ملا۔ بڑا ہوا تو بابا مجھے بھی زبردستی نماز کے لیے اٹھاتے تھے اور میں نماز میں اونگھتا ہوا اس گرم چادر کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ پہلے تو ماں باپ راضی نہیں تھے جب راضی ہوئے تو یہ پابندی لگا دی کہ شادی کر کے جانا ہو گا۔ پھر جلدی جلدی رضیہ سے میری شادی ہو گئی تھی۔ رشتہ تو شاید اسی وقت طے ہو گیا تھا جب میں میڈیکل کالج میں تھا۔ مگر میں نے نہیں سوچا تھا کہ اتنی جلدی شادی

بھی ہو جائے گی۔

امریکا آنے کے چھ مہینے بعد رضیہ بھی آ گئی تھی۔ میں بڑا مصروف رہتا تھا، صبح سے شام تک کام اور ویسے بھی میری عادت حرام خوری کی نہیں تھی۔ کام میں میرا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنا کام، سائنٹفک میٹنگ میں تقریریں، میڈیکل اسٹوڈنٹس کو پڑھانا، ہر کوئی میری عزت کرتا تھا اور میں ہر ایک کے کام آتا تھا۔

بیچ میں دو دفعہ پاکستان گیا تھا دس بارہ دن کی چھٹیوں پر یہ عجیب قسم کے دورے تھے دو تین دن جہاز میں، ایک دن کراچی میں۔ چار پانچ دن حیدر آباد میں اور پانچ چھ دن شکار پور میں۔ وقت نکل جاتا تھا اور واپس آکر لگتا تھا کہ جیسے خواب ہو۔

میرے بابا اور ماں، رضیہ کے والدین بھی ایک دفعہ شکاگو آ کر گئے تھے مگر شکاگو ان لوگوں کو پسند نہیں آیا تھا۔ تھوڑے دن گھومنے پھرنے کے بعد انھیں پاکستان کی اور شکار پور کی یاد ستانے لگتی تھی۔ میں اور میرے تینوں بچے ان لوگوں کو بہت مس کرتے تھے۔

پھر یکایک نہ جانے رضیہ کو کیا ہو گیا تھا کہ ایک روز کہنے لگی کہ اب ہم لوگوں کو واپس چلے جانا چاہیے، بہت ہو گیا امریکا میں رہنا۔ بہت کچھ سیکھ لیا بہت کچھ کما لیا دنیا دیکھ لی شکاگو بہت اچھا ہے، بہت خوب صورت ہے، بہت حسین ہے لیکن شکار پور تو نہیں ہے۔ نہ وہ گلیاں ہیں نہ وہ دیواریں نہ وہ آوازیں نہ وہ ہوائیں۔ نہ وہ مٹی نہ وہ باغ نہ وہ کھیت نہ وہ کھلیان۔ میرے دل سے بھی کسی نے کہا شاید یہ صحیح کہہ رہی ہے۔ دس سال میں پہلی بار میں نے سوچا تھا کہ چلنا چاہیے۔ میری یہاں یہ بہترین نوکری تھی، سال کے تقریباً چار لاکھ ڈالر سے زیادہ کماتا تھا۔ بڑا سا خوب صورت مکان تھا جس میں دنیا کی ہر اچھی چیز موجود تھی۔ کام والوں کے درمیان عزت تھی لیکن لگتا تھا دل کہیں اور ہے۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ دوسرے دن ہی مجھے ستار کا خط آیا ستار میرے کالج کا دوست تھا۔ اس نے لندن سے سرجری کی تھی اور کراچی کے جناح ہسپتال میں ایسوسی ایٹ پروفیسر تھا۔ اس نے بہت ساری باتیں لکھی تھیں، دوستوں کی خبریں دی تھیں اور آخر میں لکھا تھا کہ میں پاکستان واپس آجاؤں۔ کراچی میں بہت کام ہے، سرکاری نوکری بھی مل جائے گی۔

میں اور رضیہ بہت دنوں تک سوچتے رہے تھے۔ پھر ڈرتے ڈرتے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک ماہ کے لیے پاکستان جاؤں اور دیکھوں کہ ستار کیا کہہ رہا ہے اگر عزت کے ساتھ، انصاف کے ساتھ ذرا سا بھی کام کا آسرا ہو گیا تو پھر گڈ بائی شکاگو۔

ایئرپورٹ سے میں ستار کے گھر گیا تھا۔ ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی میں اس کا خوب صورت سا بڑا سا بنگلہ تھا۔ ساری آسائشوں کے ساتھ۔ یہاں پہنچنے کے بعد کھانا وغیرہ کھا کر بارہ گھنٹے تو ایسی

نیند آئی کہ کچھ پتا ہی نہیں لگا۔ جاگا تو شام کا وقت تھا اور ستار ابھی تک کلینک سے واپس نہیں آیا تھا۔ میں نہا دھو کر چائے پینے کے لیے بیٹھا ہی تھا کہ وہ آگیا۔

اس نے بتایا تھا کہ سندھ گورنمنٹ میں تو فوراً" ہی مجھے نوکری مل جائے گی۔ اس کے بقول میں قابل تھا۔ شکار پور کا ڈومیسائل تھا تو نوکری نا ملنے کا سوال ہی کیا ہے۔ گو کہ اس وقت نوکریوں پر پابندی ہے مگر پابندی ان لوگوں کے لیے ہے جن کی کوئی شنوائی نہیں ہے تمھارا تو کیس بنے گا' ایسا کیس بنے گا کہ نوکری ضرور ملے گی۔ مگر سوال یہ تھا نوکری کہاں ملے گی' ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی میں' لیاقت میڈیکل کالج حیدر آباد میں؟ نواب شاہ میڈیکل کالج میں یا چانڈکا میڈیکل کالج لاڑکانے میں؟ اس کا خیال تھا کہ مجھے ہر صورت میں ڈاؤ میڈیکل کالج میں کام کرنا چاہیے۔

اس نے بتایا کہ کل شام کو سائیں کے پاس ہم لوگوں کو جانا ہے۔ وہاں سب پتا لگ جائے گا کہ یہ کس طرح سے ہوتا ہے۔

اس رات ہم لوگوں کی دعوت شکار پور کے پرانے دوست کے گھر تھی جو کراچی میں وکیل تھا اور آج کل وزیر بھی تھا۔ اس کا گھر بھی ڈیفنس کے عالی شان گھروں میں سے ایک تھا۔ خوب صورت مکان۔ بڑا سا لان۔ سوئمنگ پول' گھر میں شان دار فرنیچر۔ کھانا بھی بڑے تکلف سے پکایا گیا تھا۔ ہم لوگ کھاتے رہے اور بچپن کی باتوں سے دل بہلاتے رہے۔ پرانے دوستوں کو یاد کرتے رہے۔ ستار نے بتایا تھا کہ علی بخش آج کل سندھ کا اٹارنی جنرل ہے۔ مولا بخش سپریم کورٹ میں جج ہے اور اسلام آباد میں رہتا ہے۔ امتیاز سومرو' آفتاب اور علی نواز کراچی میں ہی ہیں اور ڈیفنس میں ہی رہتے ہیں۔ دو اور دوست حیدر آباد میں پروفیسر ہو گئے تھے۔ اسے ہر ایک کے بارے میں ساری خبریں تھیں۔

میں نے پوچھا تھا یار کوئی شکار پور میں بھی ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ شکار پور میں ہر ایک کا گھر ہے' مگر وہاں ہے کوئی بھی نہیں۔

دوسرے دن سائیں کے گھر جانا ہوا۔ وہ کلفٹن کے ایک پرانے بنگلے میں رہتے تھے اور صرف سندھی یا انگلش میں بات کرتے۔ سائیں بہت تپاک سے ملے تھے۔ نوکروں سے بھرے گھر میں ہم دونوں کو بہت عزت سے بڑے کمرے میں بٹھایا گیا تھا۔ حال پوچھا اور کہا کہ اگر مجھے واپس آنا ہے تو نوکری تو ملنی ہی ملنی ہے اس کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ نوکری اگر نہیں ہے تو پیدا کی جائے گی۔ شکار پور کے ڈومیسائل کے ساتھ نوکری نہیں ملے گی تو کب ملے گی۔

میں نے حیرانی سے پوچھا تھا کہ اگر نوکری نہیں ہے اور اگر نوکریوں پر پابندی ہے تو یہ کام کیسے ہو گا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی۔ سائیں مسکرائے۔ مجھے ایسے دیکھا تھا جیسے میں کوئی بچہ ہوں۔ ستار بھی آہستہ سے ہنس دیا تھا۔

سائیں اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ میرے ساتھ آؤ۔ ایک دوسرا بڑا کمرہ تھا جس کے بیچ میں ایک گول میز تھی، چند کرسیاں اور دیواروں پر چارٹ لگے ہوئے تھے۔ وہ میز کے ایک طرف کھڑے ہو گئے اور مجھے دیکھ کر بولے کہ یہ سندھ کا کنٹرول روم ہے۔ ان چارٹوں پر سندھ میں اعلیٰ عہدوں پر کام کرنے والوں کی ساری تفصیل موجود ہے۔ کتنے جج ہیں، کتنے پروفیسر کتنے انجینئر ہیں، کتنے پروجیکٹ ڈائریکٹر، کتنے ایس ڈی ایم ہیں، کتنے سکریٹری اور کون سندھی ہے، کون مہاجر، کون پنجابی ہے کون کسی اور صوبے کا ہے اور کس ڈومیسائل پر کام کر رہا ہے۔ کس کا کب تقرر ہوا ہے اور کون کب ریٹائر ہو رہا ہے۔ سائیں دھیرے سے مسکرائے تھے اور کہا تھا۔ بلکہ میرے پاس تو یہ بھی اطلاع موجود ہے کہ سندھ کا کون آدمی دنیا میں کہاں ہے جو کسی وقت ان پوسٹوں پر آسکتا ہے مثلاً" تمہارا نام بھی میرے پاس ہونا چاہیے۔

یہ کہہ کر انھوں نے الماری کا دراز کھولا تھا۔ تم نے ۱۹۸۹ء میں پاس کیا تھا ٹھیک ہے نا۔ انھوں صفحے پر نظر ڈالی تھی جہاں میرا نام لکھا ہوا تھا، پوسٹ گریجویٹ فزیشن۔ ساتھ میں شکاگو کا ایڈریس بھی تھا۔

یہ اچھی بات ہے کہ تم آرہے ہو۔ دیکھو اس لسٹ میں بہت سارے نام ہیں جو انگلینڈ، امریکا اور کینیڈا میں موجود سندھی ہیں۔ لیاقت میڈیکل کالج یا کراچی کے پڑھے ہوئے ہیں مگر آتے نہیں ہیں۔

میں نے غور سے دیکھا۔ تقریباً" سارے ناموں کے آگے مختلف قسم کے کمنٹ لکھے ہوئے تھے۔ مگر مجھے نوکری کیسے ملے گی؟ میں نے پوچھا تھا۔ دیوار پر لگے ایک چارٹ پر سائیں نے ہاتھ رکھ دیا تھا، تم کو یہاں نوکری ملے گی۔ کراچی میں ڈاؤ میڈیکل کالج میں۔

میں نے قریب جاکر دیکھا مگر یہاں تو کسی کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سائیں نے مسکرا کر کہا۔ اس وقت نواب شاہ اور لاڑکانے کے میڈیکل کالجوں میں جگہ ہے ان میں سے کسی ایک جگہ تمہارا ایڈہاک تقرر ہو جائے گا اور تم جوائن کر لینا۔ ایک ہفتہ کام کرنے کے بعد تین چار مہینوں کی چھٹی لے کر واپس چلے جانا۔ امریکا سے آنے میں بھی تو وقت چاہیے ہو گا۔ جب تمہارے آنے کا وقت ہو گا تو جن صاحب کا نام لکھا ہوا ہے ان کا کراچی سے لاڑکانے ٹرانسفر ہو جائے گا۔ یہ یا تو چلے جائیں گے جس کا کم امکان ہے یا استعفیٰ دے دیں گے جو فوراً" قبول کر لیا جائے گا۔ ان کو ابھی ریٹائر ہونے میں آٹھ سال کا عرصہ لگے گا اور اگر یہ استعفیٰ دینے پر تیار نہیں ہوئے تو ان کے خلاف ایک مہم چلوا دی جائے گی جس کے دوران یہ مشورہ بھی دیا جائے گا کہ یہ لمبی چھٹیوں پر چلے جائیں۔ ان کو ان میں سے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا اور تمہارا راستہ صاف ہو جائے گا۔ ستار ان کی درخواست وغیرہ کاغذات کے ساتھ مجھے پہنچا دو تو میں

مناسب کارروائی کے لیے دے دوں گا اور ڈائریکٹ چیف منسٹر سے ہی حکم کرادوں گا کیا خیال ہے؟ سائیں نے کچھ سوچ کر کر بڑے زور سے قہقہہ لگایا تھا۔ نوکر نے دروازے پر آکے آواز دی تھی کہ کھانا تیار ہے۔ کھانے کے دوران ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہی تھیں مگر میں سوچ رہا تھا مسلسل سوچ رہا تھا کہ کراچی میں اس قسم کی نوکری کا کیا فائدہ ہے جس کی بنیاد ہی ناانصافی پر ہو۔ اس سے تو اچھا ہے کہ میں نواب شاہ میں جا کر اپنا کچھ سیٹ اپ بنالوں۔ ماں باپ' اپنی زمین مکان کے پاس بھی رہوں گا اور کسی قسم کی ناانصافی کا بوجھ بھی نہیں ہو گا۔ میں سوچتا رہا اور سوچتا ہی رہا کہ ستار نے کہا کہ اب چلنا چاہیے۔

راستے میں' میں نے ستار سے کہا تھا کہ یار یہ بات تو صحیح نہیں ایک قابل آدمی اپنی جگہ پر مناسب کام کر رہا ہے۔ میں کس طرح سے زبردستی اس کی جگہ لے لوں۔

ستار نے مجھے عجیب طرح سے دیکھا تھا "یار تم بھی عجیب بات کر رہے ہو۔ ساری دنیا کا نظام ایسے ہی چلتا ہے جس کی حکومت ہوتی ہے اس کی مرضی کے لوگوں کا تقرر بھی ہوتا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد صرف مہاجروں کی ہی حکومت تھی' ہر جگہ ہر پوسٹ پر یہ لوگ تھے۔ مغربی پاکستان میں یا مشرقی پاکستان میں۔ ارے اگر کسی چوکیدار کو بھی رکھا جاتا تھا تو وہ لالو کھیت کا ہوتا تھا' ملیر اور ٹھٹے کے لوگ نہیں لیے جاتے تھے۔ ایسے ایسے جاہل لوگ علی گڈھ اور عثمانیہ یونیورسٹی کی جعلی ڈگریوں پر بڑے بڑے پروجیکٹ کے ڈائریکٹر لگا دیے گئے تھے پھر تم تو قابل ہو۔ تمہارے پاس اصلی ڈگری ہے۔ تمھیں کاہے کا ڈر ہے۔ اب یہی وقت ہے کہ فائدہ اٹھایا جائے اگر فائدہ نہیں اٹھائیں گے تو کل سندھ میں سندھی ایسے ہی ہوں گے جیسے تمہارے امریکا میں ریڈ انڈین ہیں۔"

میں نے کہا کہ میں سوچتا ہوں شکار پور سے ہو کر آتا ہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں یہ کام نہیں کروں گا۔ شکار پور میں ہی اپنا ایک سینٹر بناؤں گا وہی رہوں گا سب خوش ہوں گے اور رضیہ بھی اسی میں زیادہ خوش ہو گی۔

دو دن کے بعد میں شکار پور چلا گیا تھا۔ یہ وہ شکار پور تو نہیں تھا جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ جہاں میں نے جوانی کی شامیں گزاری تھیں جسے چھوڑ کر شکاگو گیا تھا۔ شہر کی ہر سڑک ٹوٹی ہوئی تھی۔ شہر کا ہر نالہ ابل رہا تھا۔ ہندوؤں کی بنائی ہوئی کشادہ عمارتوں میں بے ڈھنگے طریقے سے ترمیم کی گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ شکار پور کی میونسپل کمیٹی کا وجود ہی نہیں ہے۔ پہلے میں آتا تھا تو جلدی سے چلا جاتا تھا۔ اتنی فرصت نہیں ہوتی تھی کہ چیزوں کو غور سے دیکھوں لیکن اس دفعہ کوئی اور بات تھی مجھے یہاں رہنا تھا مگر وہاں رہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ کوئی نیا اسکول کھلا تھا نہ کوئی نیا کالج نہ کوئی کھیل کا میدان بنا تھا نہ کسی پارک کا اضافہ کیا گیا تھا۔ نہ کسی نئی

لائبریری کا قیام عمل میں آیا تھا اور نہ ہی کوئی ہسپتال بنا تھا۔ شہر کے پرانے دروازے ختم ہو چکے تھے۔ شہر کے بیچوں بیچ ایک پرانا ایئر فورس کا جہاز بے ڈھنگے ستونوں پر لٹکا ہوا کسی چمگادڑ کی طرح شہر کی حالت زار پر ماتم کر رہا تھا۔

ستار نے تو مجھے بتایا تھا کہ کوٹہ سسٹم کی وجہ سے شکار پور کے بہت سے لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو گئے ہیں مگر مجھے وہاں کوئی بھی تربیت یافتہ سند یافتہ سرجن، فزیشن یا کوئی دوسرا ماہر نہیں ملا تھا۔ کہاں ہیں یہ لوگ؟ مجھے جلد ہی جواب مل گیا تھا۔ وہ سب لوگ کراچی میں رہتے ہیں۔ شکار پور کی گندی گلیوں سے دور، ابلتے ہوئے گٹروں سے پرے، ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کے بنگلوں میں۔ کلفٹن کے فلیٹوں میں اور سرکاری رہائش گاہوں میں۔

مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ اس شہر کا یہ حال ہے جہاں کے وڈیرے اور زمین دار ہر حکومت کے وزیر اور سندھ کے وزیر اعلیٰ رہے ہیں، جو سائیں کے مشورے پر حکومت چلا رہے ہیں۔ سازشیں کر کے نفرتیں بو کے، شہر کا صوبے کا جو بھی حال ہو۔

میں نے اپنے بارے میں سوچا، اپنے بچوں کے بارے میں سوچا، رضیہ کے بارے میں سوچا۔ میں اور رضیہ تو یہاں بہت خوش ہوں گے مگر بچوں کو وہ تعلیم نہیں ملے گی جو اکیسویں صدی میں کام کرنے والوں کو ملنی چاہیے۔ میں اپنا سینٹر بنا کر علاقے کے اتنے مریض دیکھوں گا کہ گزارے سے کہیں زیادہ پیسے کمالوں گا مگر بچوں کو شکار پور تو وہ بھی نہیں دے سکے گا جو مجھے ملا تھا۔ میں نے محنت سے اچھے نمبر لیے تھے۔ بغیر سفارش کے لیاقت میڈیکل کالج میں امتحان پاس کیے تھے۔ امریکن امتحان پاس کر کے امریکا جا کر بھی بہت عزت سے رہ رہا ہوں۔ میرے بچوں کو مجھے ان سب چیزوں سے زیادہ دینا چاہیے جو میرے باپ نے مجھے دیا تھا۔ شکار پور میں انھیں کیا دے سکوں گا۔ شاید کراچی میں گرامر اسکول میں پڑھ لیں گے۔ ڈیفنس سوسائٹی میں شاید وہ سب کچھ تو نہیں مگر کچھ تو ملے گا۔ شکار پور سے بہتر ملے گا۔ مگر کراچی کی نوکری کسی آدمی کو ہٹا کر مجھے اس کی جگہ ملے گی، اسے بلیک میل کیا جائے گا، اس کا ٹرانسفر کرا کے مجھے نوکری دلوائی جائے گی۔ میں اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ مجھے امریکا میں یہ ٹریننگ نہیں ملی تھی۔ مجھے شکاگو میں نوکری دی گئی تھی، گورے کو نوکری نہیں دی گئی تھی۔ میں زیادہ قابل تھا، میں زیادہ اچھا تھا۔

میں نے کافی دیر تک رضیہ سے فون پر بات کی تھی نہ کچھ اس کی سمجھ میں آیا تھا نہ کچھ میری سمجھ میں آیا تھا۔

دو دن بعد میں واپس کراچی پہنچ گیا اور ستار سے اپنے خدشات کا ذکر کیا۔ وہ ہنسا اور اس نے کہا کہ تم تو یار کتابوں کی باتیں کرتے ہو۔ بے وقوف، شکار پور میں کیوں کام کرو گے۔ تمھارے

بچوں کا ڈومیسائل ہو گا شکار پور کا، تمھارے کام ہوں گے شکار پور کے نام پر لیکن تم کراچی میں کام کرو گے اور شکار پور سے مریض تمھارے پاس یہاں بھی آئیں گے اور مجھے پتا ہے کہ تم کراچی میں اتنا کماؤ گے کہ عیش کرو گے عیش، اور ساتھ میں گورنمنٹ کی نوکری بھی ہو گی۔ اس نے کہا کہ چلو سائیں کے پاس چلو تمھارا تقریباً سارا کام ہو گیا ہو گا۔

میں نے کہا تھا "یار مگر میں نے تو کوئی درخواست دی ہی نہیں تھی۔" وہ پھر زور سے ہنسا تھا اور بولا تھا۔

"تم سائیں کو سمجھتے نہیں ہو۔ ارے تمھارے شکار پور جانے کے بعد انھوں نے مجھے بلایا تھا۔ تمھاری تفصیلات تو میرے پاس تھیں ہی اس کے بنیاد پر میں نے تمھارے نام سے درخواست لکھی تھی۔ اس کی ایک کاپی اس فائل میں ہے" اس نے ایک فائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ اس کے بعد تمھاری اچھی سی سمری بنی تھی جو سائیں نے ہیلتھ سیکریٹری سے ہی لکھوائی تھی۔ اس پر بعد میں چیف سکریٹری اور چیف منسٹر نے حکم بھی کر دیا ہے اور ہنگامی بنیادوں پر تمھارا تقرر نواب شاہ میڈیکل کالج میں کرا دیا گیا ہے کیوں کہ وہاں پر ایک پروفیسر کی فوری ضرورت ہے۔ وہ مسکرایا پھر مجھے آنکھ مار کر بولا تھا کہ اب دوسرے مرحلے پر اس کراچی والے کا ٹرانسفر لاڑکانہ کرا دیں گے کیوں کہ وہاں بھی ضرورت ہے۔ اس کے بعد جو ہو گا وہ تو تم کو سائیں بتا ہی چکے ہیں۔

میرے اندر، بہت اندر جیسے ایک آگ سی لگ گئی تھی میں نے کہا تھا ستار تم کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا سندھ میں بھٹائی اور سچل سرمست پیدا ہونے بند ہو گئے ہیں، کیا اب صرف سائیں جیسے لوگ ہی رہ گئے ہیں جو صرف سندھی اور انگلش میں بات کرتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ سندھیوں کا حشر ریڈ انڈین جیسا ہو جائے گا، تم کیا بات کر رہے ہو؟

اس نے مجھے بیچ میں ہی روک دیا تھا "یار تم بالکل امریکن ہو گئے ہو، بھائی وہ دنیا اور ہے یہ دنیا اور۔ تم کیوں بھول جاتے ہو کہ مہاجروں اور پنجابیوں نے مل کر جب پاکستان بنایا تھا تو ہم سندھیوں کو کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ چپراسی تک کی نوکری نہیں ملتی تھی ہم کو۔ کراچی میں اسکول کھلتے تھے، سوسائٹیاں بنتی تھیں، شکار پور اور نواب شاہ میں کیا ہوا تھا؟ بڑی مشکل سے جدوجہد کر کے ہم لوگ آگے بڑھے ہیں۔ اب سندھ میں سندھی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہو گی، یہ سائیں جیسے لوگوں کا احسان ہے جو یہ سمجھ رہے ہیں اور مل جل کر کام کر رہے ہیں۔ بہت کچھ حاصل کیا ہے اور بہت کچھ حاصل کر لیں گے۔ ارے ہم اپنا حق مانگ رہے، ہیں ڈیسائل کا حق۔ عثمانیہ اور علی گڑھ کی جعلی ڈگریوں پر نوکریاں نہیں لے رہے ہیں۔ وہ سنجیدہ تھا اس کا چہرہ سنجیدہ تھا مگر اس دوران میں نے شکاگو واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے اندر جیسے اطمینان کی ایک لہر

سے اٹھ گئی تھی۔ میں نے کہا "تمھیں ایک بات بتاتا ہوں تم یہ جا کر اپنے اس سائیں کو بھی بتا دینا۔ پانچ سو سال پہلے جب انگریزوں نے شکاگو پر قبضہ کیا تھا تو ریڈ انڈین کو مارنے پر لوگوں کو انعام ملا کرتا تھا۔ پانچ ہزار سال سے وہاں رہنے والے پالیو اور کاما کاما قبائلیوں کو مار مار کر وہاں سے بھگا دیا گیا تھا۔ افریقہ سے پکڑ کر سیاہ فام افریقیوں کو لائے تھے' انھیں غلام بنایا تھا اور ان کی جانوروں کی طرح خرید و فروخت ہوتی تھی۔ وہ جنگل کا قانون تھا۔ وہ طاقت کا جابرانہ تسلط تھا۔ جہالت کے بے سروپا اصول تھے۔ وقت کو بدلنا پڑا۔ سفید آبادی کو چار سو سال بعد سبھی ریڈ انڈین سے معافی مانگنی پڑی' کالوں کو غلامی سے آزاد کرنا پڑا' انھیں ووٹ کا حق دینا پڑا۔ شہر میں آگ لگ گئی' تمام شہر جل گیا' انھوں نے مل کر شہر کو دوبارہ بنا لیا۔ ال کپون جیسے غنڈوں کو انصاف کا سامنا کرنا پڑا۔ زندگی آگے کی طرف بڑھی پیچھے نہیں گئی۔ انیسویں صدی میں سولھویں صدی کے اصولوں پر انصاف کرنے کی کوشش نہیں کی گئی کیوں کہ زندگی آگے بڑھتی ہے' پیچھے نہیں جاتی ہے۔ تاریخ چکروں کا نام نہیں ہے کسی دائرے کی طرح نہیں ہے جو گھوم گھوم کر ایک ہی عمل دہراتی ہے' یہ تو ایک اسپرنگ کی طرح ہے جو ماضی کے دائروں کے مکمل ہونے سے قبل ان پر دائرہ بناتی ہے اور آگے بڑھتی ہے' اوپر جاتی ہے۔ تم لوگ جو بات کر رہے ہو اس سے تو ذہانت کا خاتمہ کر رہے ہو ایک ایسی فوج تیار کر رہے ہو جسے ڈومیسائل کی ضرورت ہے۔ میں شکاگو میں رہتا ہوں۔ میرے بچے گھر میں سندھی بولتے ہیں۔ جب پاکستانی جمع ہوتے ہیں تو اردو بھی بولتے ہیں اسکول میں انگلش میں پڑھتے ہیں اور میرا بڑا بیٹا علیحدہ زبان کے طور پر فرنچ بھی سیکھ رہا ہے۔ شاید ایک دن وہ سندھی' اردو' فرنچ سب کچھ بھول جائے گا مگر وہ نفرت کی کسی زبان سے بات نہیں کرے گا۔ وہ کالج میں بہت اچھا ہے' اسے شکاگو میں یونیورسٹی میں داخلے کے لیے شکارپور کے ڈومیسائل کی ضرورت نہیں ہے۔ جب میں شکاگو شہر میں بہار کے دنوں میں ریکرز ڈراؤ کے ساتھ ساتھ گھومتا ہوں اور شکاگو ندی کے اوپر کافی پیتا ہوں اور جلتے ہوئے شکاگو کے اوپر بننے والی بلڈنگوں کو دیکھتا ہوں' ٹائم اسکوائر کے پاس سے گزرنے والی گاڑیوں' بسوں' ریل کے ڈبوں کو دیکھ کر مجھے احساس کمتری نہیں ہوتا ہے' مجھے تھوڑا غرور سا ہوتا ہے حالاں کہ میں اس ترقی میں شامل نہیں تھا میں نے شکاگو کی آگ نہیں بجھائی تھی' شکاگو ندی پر بننے والے پلوں کے لیے گارا مٹی نہیں جمع کیا تھا' شہر کے باغ' میوزیم' ڈراموں کے مرکز' اخبار کے دفتر جوں کے چیمبر عیسائیوں' یہودیوں' مسلمانوں' ہندوؤں' بودھوں کی عبادت گاہوں کا نقشہ نہیں بنایا تھا مگر پھر بھی یہ سب لگتا ہے جیسے میرے ہیں۔ میرے اپنے۔ ہر ایک محبت کا دروازہ کھول کر کھڑا ہے۔ مجھے وہاں رہنے کے لیے کسی کا تبادلہ کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کل کی غلطی کو آج کی غلطی سے درست نہیں کیا جا سکتا ہے۔ تمھارے اور تمھارے سائیں کے اصول سب کچھ ختم کر دیں گے

اور جب سب کچھ ختم ہو رہا ہو گا تو ڈومیسائل کا یہ کاغذ، ہیلتھ سکریٹری کی سمری، چیف سکریٹری کی سمری، تقرر نامہ اور چیف منسٹر کا حکم کچھ بھی اس آگ کو نہیں بجھا سکیں گے اور یہ آگ ایسی آگ ہو گی جس میں نئے شکاگو کی طرح نیا کراچی یا نیا شکار پور نہیں بن سکے گا۔ میں جانتے بوجھتے ہوئے اس گڑھے میں نہیں گروں گا۔ آج میں کسی وجہ سے ایک مجبوری سے یا شاید اپنی خود غرضی کی وجہ سے شکار پور واپس نہیں جا رہا ہوں۔ وہاں نہیں جا رہا ہوں جہاں لوگوں کو میری ضرورت ہے مگر میں کل شکار پور کے نام پر خیرات بھی نہیں لوں گا۔ سندھ کے نام پر تجارت بھی نہیں کروں گا۔ میں واپس جا رہا ہوں شکاگو پھر کبھی بھی نہ آنے کے لیے۔ ڈومیسائل، سمری اور کوٹا سسٹم پر فیصلے ہوتے ہیں جب نفرت کی بنیاد پر سفر شروع ہوتا ہے اور جب دوسروں کی ناانصافی کو مثال بنایا جاتا ہے تو پھر سچل سرمست اور لطیف بھٹائی پیدا ہونا بند ہو جاتے ہیں پھر صرف "سائیں" جیسے لوگ پیدا ہوتے ہیں، ایسے ہی جیسے کراچی کے مہاجروں نے جو فصل لگائی تھی اس کے بعد وہاں بھی صرف "سائیں" ہی پیدا ہو رہے ہیں دور دور تک اور "سائیں" ہی پیدا ہوتے رہیں گے۔

ستار مجھے تعجب سے دیکھ رہا تھا اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی۔ اس کا تعجب اور حیرت کرنا تو میری سمجھ میں آگیا تھا مگر اس حیرت کو رحم میں بدلتا دیکھ کر مجھے بھی افسوس ہوا تھا۔ کبھی کبھی بہار میں جب تمام شکاگو پھولوں سے مہک رہا ہوتا ہے اور تازہ تازہ سبز پتوں سے ڈھکا ہوا ہوتا ہے اور میں اور رضیہ شکاگو ندی کے کنارے کافی پی رہے ہوتے ہیں تو شکار پور اسی شدت کے ساتھ یاد آتا ہے۔ ایک صاف سی خوب صورت سی تصویر وہی سوندھی سوندھی مٹی، وہی شام کا نکھار اور صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں، اجرک یا رلی کی گرمی، پھر یہ تصویر دھندلی ہو جاتی ہے اور اس دھند میں ستار آجاتا ہے، میرا بچپن کا دوست بھولا بھالا اور اس کے پیچھے ایک سایہ سا آتا ہے، سائیں کا سایہ اور تصویر اندھیرے میں کھو جاتی ہے۔

مکین شلوم

بیت المقدس یروشلم پہنچنا آسان نہیں تھا۔ قاہرہ سے روزانہ سیاحوں کی بسیں اسرائیل جاتی ہیں اور ان ہی بسوں میں سے ایک میں بیٹھ کر میں وہاں پہنچا تھا۔ پاکستانی پاسپورٹ لے کر اسرائیل جانے میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر ہمارے پاسپورٹ پر اسرائیل کی مہر لگ گئی اور پاکستان میں کسی نے دیکھ لیا تو یہ جرم مانا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ اسرائیل کی مہر والے پاسپورٹ پر کوئی بھی آدمی سعودی عرب نہیں جا سکتا ہے۔ پاکستان میں رہنے والا ہر ایک مرد عورت سعودی عرب نہیں جا پاتا ہے مگر اس کے خواب ضرور دیکھتا ہے۔

پاکستان اور سعودی عرب دنیا کے دو عجیب و غریب ملک ہیں۔ دونوں ملکوں کے شہری اسرائیل نہیں جاسکتے ہیں اور دونوں ہی ملکوں میں اسرائیل کو کرہ ارض پر قائم و دائم رکھنے والے ملک امریکا کے شہریوں کو جو عزت و احترام میسر ہے وہ امریکیوں کو امریکا میں بھی نہیں ہے۔ میں تو قاہرہ گیا ہی اس لیے تھا کہ مجھے یروشلم دیکھنا ہے نہ جانے کیوں مجھے بڑے سے سبز گنبد والے اس شہر کو دیکھنے کی آرزو تھی۔ میں نے پڑھا تھا کہ یہ سبز گنبد مخروطی چٹانوں کے اوپر بنایا گیا ہے۔ میرے ذہن میں ایک تصویر' ایک شکل تھی بیت المقدس کو دیکھنے کی ایک آرزو' تاریخ کو سمجھنے کی ایک تمنا تھی' اس سبز گنبد کے نیچے نماز پڑھنے کی ایک حسرت تھی اور اس کو ہی دیکھنے کی تمنا لے کر میں قاہرہ پہنچا تھا۔

قاہرہ سے بسیں جب اسرائیل کی سرحد پر پہنچی تھیں تو یہودی امیگریشن آفیسروں نے پاکستانی پاسپورٹ کو دیکھا اور پینتالیس ڈالر فیس لینے کے بعد مجھے ایک محدود مدت کے لیے اسرائیل میں گھومنے کا پروانہ بنا کر دے دیا تھا۔ میں نے تین دن کی میعاد مانگی تھی' انھوں نے مجھے سات دن کا ویزا دے دیا تھا۔ ایک چھوٹا سا کارڈ جو مجھے اپنے پاس رکھنا تھا یا جیب کے اوپر لگانا تھا جس کے اوپر لکھا تھا "سیاح پاکستانی اور سات دنوں کا قیام۔"

چھوٹا سا ہوٹل صاف ستھرا تھا اور پرانے یروشلم میں واقع تھا۔ میں نے اپنا سامان رکھا تھا اور مسجد اقصیٰ دیکھنے کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ وہاں بھی مجھے ایک فلسطینی گائیڈ مل گیا تھا جس نے سبز

گنبد، مسجد اقصیٰ، دیوار گریہ، انبیا کی قبر، مسلمانوں کے گھر، یہودیوں کی آبادی مسلمانوں کا قبرستان، عیسائیوں کے مکان، حضرت مریم کی رہائش گاہ، اور صلاح الدین ایوبی کے قصے سنائے تھے۔ بوڑھے فلسطینی گائیڈ کو ایک ایک پتھر، ایک ایک انچ اور ایک ایک دروازے کھڑکیوں کے بارے میں سب کچھ پتا تھا۔ وہ فلسطین، یروشلم، مسلمانوں کی عیاشی اور یہودیوں کی تاریخ سے مکمل طور پر آگاہ تھا۔

مجھے پہلی دفعہ پتا لگا کہ یروشلم کا سبز گنبد، مسجد اقصیٰ کا حصہ نہیں ہے۔ یہ تو چٹانوں کے اوپر ایک گول گنبد ہے جس پر اندر سے سونا چڑھایا گیا ہے۔ مسجد اقصیٰ تھوڑے سے فاصلے پر بنی ہوئی ہے جہاں غیر مسلموں کا داخلہ ممکن نہیں ہے۔ وہ شام اور رات میری زندگی کی عجیب ترین رات تھی۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں ہزاروں سال کا سفر کر کے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں پہنچ گیا تھا۔ فراعین اور رومنوں کے اس زمانے میں، جن کی داستانیں بچپن سے اتنی بار سنی تھیں کہ ذہن کے پردے پر ہر ایک کی تصویر بن گئی تھی، واضح صاف ستھری اور زندگی سے بھرپور۔ یروشلم ایسا ہی شہر تھا۔ وہاں تاریخ سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ سرکتی ہوئی، دھیمے دھیمے تاریخی کتابوں کے اوراق کی طرح جو الٹتے الٹتے پڑھنے والے کو ڈراتے بھی ہیں اور حیرت زدہ بھی کر دیتے ہیں۔

انسان اپنے ماضی کی پرورش کرتا ہے اور ماضی سے کبھی بھی رشتہ نہیں توڑتا۔ اپنے حال کی تشریح بھی ماضی سے چاہتا ہے اور مستقبل بھی ماضی کی بنیاد پر بناتا ہے۔ یروشلم ایسی ہی ایک مثال تھی ماضی حال اور مستقبل جہاں پر مل جاتے ہیں۔ اپنی شدتوں کے ساتھ وعدے لیے ہوئے، امیدیں کیے ہوئے۔ اس رات میں خوب تھک ہار کر سویا تھا۔ گہری نیند کہ جس کے بعد دیکھا ہوا کوئی خواب بھی یاد نہیں رہتا ہے۔

دوسرے دن صبح پرانے شہر کے بازار میں گھومتے گھامتے ہوئے، پتھروں کی پرانی عمارتوں، اینٹوں کے بنے ہوئے راستوں اور پتلی پتلی گلیوں سے ہوتے ہوئے میں نہ جانے اس گلی میں کیسے پہنچ گیا تھا کہ صحیح راستہ مل ہی نہیں رہا تھا۔ مجھے یہ خیال تھا کہ پاکستانی پاسپورٹ کے ساتھ کسی ایسی جگہ نہ پہنچ جاؤں کہ جہاں داخلہ بند ہو۔ پھر خواہ مخواہ کے مسائل میں الجھ جاؤں۔ فلسطینیوں کے ساتھ یہودیوں کے عجیب و غریب سلوک کی بہت سی داستانیں میں نے سنی ہوئی تھیں۔ یہی سوچتا ہوا میں ایک کشادہ گلی میں نکلا تھا کہ مجھے وہ پولیس والا نظر آیا تھا۔ جیکب اولیل نام تھا اس کا۔

میں نے اسے اپنے ہوٹل کا کارڈ دکھایا تھا جہاں مجھے جانا تھا۔ اس کی انگلش بہت معقول تھی اس نے کہا تھا تم بہت دور نکل آئے ہو۔ یہاں سے تمھیں بس یا ٹیکسی کرنی پڑے گی۔ چلو میں

تمھیں بڑے روڈ تک چھوڑ دیتا ہوں۔

اس نے مجھے پولیس کی گاڑی میں بٹھا لیا۔ درمیانے قد کے سانولے رنگ کا آدمی تھا وہ۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا تھا کہ وہ اسرائیل میں ہی پیدا ہوا تھا اور یہیں پڑھ لکھ کر پولیس کی ٹریننگ کے بعد یروشلم پولیس میں کام کر رہا تھا۔

پھر اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔ میرے بتانے پر کہ میں پاکستان سے آیا ہوں' اس نے پوچھا کہ "پاکستان...؟ کراتشی؟ کراتشی؟" میں نے مسکرا کر کہا کہ ہاں کراچی ہی میرے شہر کا نام ہے اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی عود کر آئی تھی۔ میرے پڑوس میں رہنے والے بھی اس شہر کا نام لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کراچی سے ہی اسرائیل آئے تھے میری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ کراچی سے کیسے آسکتے ہیں' لیکن وہ اس شہر کا اتنا نام لیتے ہیں کہ ہمیں یاد ہوگیا ہے۔ میری ان کے خاندان سے بڑی دوستی ہے انکل تو ابھی تک کراچی کو یاد کرتے ہیں مگر کسی اسرائیلی کا پاکستان جانا ممکن نہیں ہے اس نے مجھے بتایا۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اسرائیل میں کسی کراچی کے خاندان کا پتا مل جائے گا۔" میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میرا ہوٹل آ گیا۔ وہ بڑی گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملا کر مجھ سے رخصت ہوا تھا۔

میں چل چل کر کافی تھک گیا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر میں ٹھنڈے پانی سے خوب نہایا تھا پھر جیکب اور کراچی کے بارے میں سوچتا ہوا شام کی چائے پینے کے ساتھ سی این این کی خبریں دیکھ رہا تھا کہ مجھے نیند آگئی۔ میری آنکھ دو گھنٹے کے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی سے کھلی تھی۔ دوسری طرف سے جیکب بول رہا تھا۔

اس نے کہا تھا کہ اس کے پڑوسی مجھ سے ملنا چاہتے تھے کیا میں ان کے پاس رات کا کھانا کھانا پسند کروں گا؟

اس سے اچھی بات تو کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔ جیکب کے جانے کے بعد میں سوچتا رہا تھا کہ کراچی کے کسی پرانے آدمی سے ملنے میں کیا برائی ہے مگر کسی جھجک کی وجہ سے اپنی اس خواہش کا اظہار نہیں کر سکا تھا۔

جیکب شام سات بجے مجھے ہوٹل سے لینے آگیا تھا۔ مغربی یروشلم کی نئی عمارتوں میں جیکب کا کھلا کھلا سا اپارٹمنٹ تھا جہاں بوڑھے سولومن سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ دبلا پتلا اسی بیاسی سال کا آدمی تھا۔ لانبے قد کے ساتھ سفید بال جو کبھی سیاہ رہے ہوں گے اور لمبی نوکیلی ناک اس کے چہرے پر بہت واضح تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے کراچی کے گارڈن روڈ پر واقع گرینڈ لیز بینک سے نکلنے والا کوئی پرانا پارسی ہے' ویسی ہی رنگت تھی' وہی انداز۔ بڑے میاں نے مجھے غور سے دیکھا تھا شلوم کہہ کر ہاتھ ملایا تھا۔ وہ اچھی انگلش بولتا تھا اور اسے ابھی تک سندھی اور گجراتی کے

الفاظ یاد تھے۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا کہ وہ سندھی اور گجراتی بڑی اچھی بولتا تھا مگر اب آکر تقریباً" بھول گیا ہے۔

بڑے میاں مجھ سے کرید کرید کر کراچی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ بہت سی ایسی جگہیں جہاں میں سالوں سے نہیں گیا تھا انھیں ان کے بارے میں کیا بتاتا مگر میں انھیں مایوس نہیں کر سکتا تھا میں نے بتایا کہ برنس گارڈن ویسا ہی ہے۔ گاندھی گارڈن کے چاروں طرف دوکانیں بن گئی ہیں۔ فریئر ہال اب کے ایم سی کے زیر اہتمام ہے۔ کلفٹن پر لوگوں کا میلہ لگتا ہے۔ سینڈز پٹ' ہاکس بے کے راستے اب اچھے بن گئے ہیں اور راستوں پر ابھی تک کراچی کی پرانی سندھی آبادی رہتی ہے۔

بڑے میاں کو کراچی کی ایمپریس مارکیٹ اور سولجر بازار کی دوکانیں یاد تھیں۔ میں نے انھیں بتایا تھا کہ بولٹن مارکیٹ کا ٹاور ٹوٹ گیا ہے اور وہاں پر کوئی بھی گھنٹہ گھر نہیں ہے۔ پریڈی اسٹریٹ کا مندر بند ہو چکا ہے اور کراچی میں ہندوؤں اور پارسیوں کے بنائے ہوئے پانی کے وہ تمام اڈے جہاں جانور پانی پیا کرتے تھے' ٹوٹ چکے ہیں۔

بڑے میاں نے پوچھا تھا کہ جانور اب کدھر پانی پیتے ہیں؟ کیا گھوڑا گاڑیاں' اونٹ گاڑی' گدھا گاڑی سب ختم ہو گئی ہیں؟

میں نے بتایا تھا "ختم تو نہیں' مگر کم ہو گئی ہیں۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ اب بڑے میاں کو کیا بتاؤں مگر پھر میں نے بتا دیا تھا کہ اب کراچی میں انسانوں کو پانی نہیں ملتا ہے جانوروں کی کسے فکر ہے۔ اب تو وہاں سڑکوں پر لوگوں کو گولی مار دی جاتی ہے اور بوریوں میں ٹکڑے ٹکڑے انسان ملتے ہیں۔ بزدل ہندو کراچی چھوڑ گئے جو جانوروں کو پانی پلاتے تھے اب کراچی والوں کو کراچی والے خون پلاتے ہیں خون۔

بڑے میاں نے پوچھا تھا کہ کراچی پورٹ ٹرسٹ کی خوب صورت بلڈنگ کیسی ہے؟ میں نے بتایا تھا کہ ویسی ہی ہے سامنے سے صاف ستھری مگر اندر دیواروں' سیڑھیوں اور کونوں پر اردو بولنے والے کراچی کے نئے شہریوں نے پان کی پچکاری مار مار کے گندہ کر دیا ہے۔ کراچی کیا ہے گندہ شہر ہے جہاں نہ پبلک ٹوائلٹ ہے نہ ہی جانوروں کے پانی پینے کا اڈہ۔ بے ہنگم عمارتیں ہیں جن کی سیڑھیوں پر پان کی پیک ہے۔ کے پی ٹی کی بلڈنگ کا بھی وہی حال ہے جو بقیہ شہر کا ہے۔ بڑے میاں کے چہرے پر جیسے ایک سایہ سا گزر گیا تھا۔

بڑے میاں نے پوچھا تھا کہ پیلس' پیراڈائز اور کیپٹل سینما میں اب بھی فلمیں چلتی ہوں گی میں نے کہا تھا کہ یہ سینما ہال ختم ہو گئے ہیں' ان جگہوں پر بلڈنگیں بن گئی ہیں۔ اونچی اور خوف ناک وہ کراچی کے چہرے پر ایسی ہی لگتی ہیں جیسے کسی حسینہ کے چہرے پر برص کا نشان۔

بڑے میاں کا شوق اور کراچی کی محبت دیکھ کر میں بہت جھوٹ نہیں بول سکا تھا میں نے انھیں بتایا تھا کہ کراچی اب ۱۹۴۷ء سے پہلے کا کراچی نہیں ہے جہاں ہندو، مسلمان، پارسی یہودی اور عیسائی ساتھ رہا کرتے تھے۔ جہاں جانوروں کے لیے پینے کا پانی کا انتظام بھی ہوتا تھا، جہاں سڑکیں روزانہ دھوئی جاتی تھیں۔ جہاں شام کے وقت الفنسٹن اسٹریٹ پر لوگ گھوما کرتے تھے، جہاں ٹرام کی ٹن ٹن شہر میں کسی موسیقی کی طرح رہتی تھی۔ جہاں کیپٹل سینما میں فلمیں چلتی تھیں اور سب لوگ دیکھا کرتے تھے، جب کراچی لسبیلہ اور تین ہٹی کے پل پر ختم ہو جاتا تھا۔ جہاں محبت کی ہوائیں چلتی تھیں، جہاں پورٹ ٹرسٹ سے ریلوے تک اور کسٹم سے کے ایم سی تک قابلیت کی بنیاد پر نوکری ملتی تھی۔ جب اندرون سندھ کے زمین دار کراچی آرام کرنے آتے تھے، شہر سے محبت کرتے تھے یہاں کے قوانین کی پاسداری کرتے تھے۔ جب کراچی چھوٹا تھا اور کراچی والوں کا دل بہت بڑا تھا۔ میرا سر نیچے تھا کسی مجرم کی طرح اور میں نے رک رک کر انھیں بتایا تھا کہ اب کراچی بہت بڑا ہے اور کراچی والوں کا دل بہت چھوٹا ہے۔ اب کراچی میں زیادہ تر مندر بند ہو گئے ہیں۔ سڑکیں گندی ہیں، پرانی عمارتیں توڑ کر وہاں پر میمن لوگوں نے پلازے کھڑے کر دیے ہیں، جہاں انسان کو جانوروں کی طرح ٹھونس دیا گیا ہے۔ کراچی کے نئے شہریوں نے پان تھوک تھوک کر کراچی کو چیچک زدہ بنا دیا ہے۔ باہر سے آنے والوں نے چاہے پنجابی ہوں یا پٹھان، بلوچی ہوں یا مہاجر سب نے کراچی کو لوٹا ہے، اسے دیا کچھ نہیں ہے۔ اب الفنسٹن اسٹریٹ، زیب النسا اسٹریٹ ہے اور میکلوڈ روڈ، چندریگر روڈ ہے اور بندر روڈ جناح روڈ ہے۔ جہاں اندرون سندھ کے زمین دار وڈیرے آکر کراچی کی بے حرمتی کرتے ہیں۔

اب وہ کراچی نہیں ہے جب گدھا گاڑی اور اونٹ گاڑی والے جاہل لوگ سڑکوں پر چلنے والے پیدل لوگوں کا خیال کرتے تھے۔ ٹریفک پولیس کے ہاتھ کے اشاروں پر رکتے تھے اس کے ہی اشاروں پر چلتے تھے اب بڑی بڑی گاڑیوں میں تعلیم یافتہ ڈرائیور اور منی بس اور ٹرکوں کے جاہل ڈرائیور یکساں طریقوں سے انسانوں کو کچلتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ آٹومیٹک ٹریفک سگنل سے گزر جاتے ہیں۔ انسان انسان سے نفرت کرتا ہے۔ گھروں میں گھس کر گولی مار دی جاتی ہے اور بوریوں میں کٹے ہوئے انسانوں کے سر ملتے ہیں۔

بوڑھے کے چہرے پر دوبارہ تاریکی سی چھا گئی تھی۔ انھوں نے جیکب کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ جیکب، جیکب! ایسا تو یہاں بھی نہیں ہوتا ہے۔ ایسا تو قدامت پسند یہودی فلسطینیوں کے ساتھ بھی نہیں کرتے ہیں۔ نہیں تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔ بڑے میاں کے چہرے پر بے یقینی کی کیفیت صاف ظاہر تھی۔

میں نے کہا ”نہیں، میں سچ کہہ رہا ہوں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بہت سا سچ نہیں کہہ رہا ہوں۔ چلیں چھوڑیں۔ میں نے چائے کے ساتھ بسکٹ کھاتے ہوئے کہا تھا“ مجھے بتائیں آپ کراچی میں کہاں رہتے تھے۔ میں نے تو سب کچھ بتا دیا ہے۔

بوڑھا سولومن دھیرے سے مسکرایا۔ پھر دھیرے سے ہی بولا میں تو کراچی میں ہی پیدا ہوا تھا۔ میرا باپ بھی کراچی میں پیدا ہوا تھا۔ میرا دادا کوچین سے تجارت کرنے کراچی جاتا تھا پھر نہ جانے کیا بات ہوئی تھی اور کراچی اسے ایسا لگا تھا کہ وہ کراچی میں ہی رہ گیا تھا۔ سولجر بازار میں رہتے تھے ہم لوگ اور بھگوان داس روڈ پر ہم لوگوں کا سینی گاگ تھا جہاں عبادت کرتے تھے میں نے سنا ہے وہاں پر اب ایک مارکیٹ بن گئی ہے اور بھگوان داس روڈ کا نام نشتر روڈ ہو گیا ہے۔

میں نے کراچی کے یہودی اسکول میں پڑھا تھا اور ڈی جے کالج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی کراچی کے سینی گاگ میں چودہ سال کی عمر میں برت می لا کی تقریب منعقد کی گئی تھی۔ اس تقریب میں ایک یہودی بچہ اپنے ایمان کی توثیق کرتا ہے۔ اسی سینی گاگ میں اپریل کے ماہ میں ہماری یہودی کمیونٹی پیساک کے تہوار کی عبادت کرتی تھی اور اکتوبر میں سوکوٹ کی عبادت ہوتی تھی۔ ہم لوگ اپنے گھروں کے باہر حضرت موسیٰؑ کی یاد میں چھوٹے چھوٹے خیمے لگاتے تھے جہاں مسلمانوں کی تواضع پھلوں سے کرتے تھے اور خدا کا شکر ادا کرتے تھے جس نے حضرت موسیٰؑ پر مہربانیاں کی تھیں۔ جمعے کی شام سے ہفتے کی شام تک سبت کے دن کوئی کام نہیں ہوتا تھا آرام کرتے تھے۔ کراچی خوب صورت تھا۔ صاف تھا نہ پانی کی کمی تھی اور نہ ہی جگہ کی کمی تھی اور شام کی ہوائیں کیماڑی سے سمندر کی خوشبو لے کر آتی تھیں تو ہم لوگ پاگل پاگل سے ہو جاتے تھے۔ تم نے اس عمر میں مجھے کیا بتا دیا ہے مجھ سے میرا کراچی چھین لیا ہے۔ وہ حقیقت جس کے خواب میں بار بار دیکھتا تھا اسے گندہ اور میلا کر دیا ہے۔ بوڑھے نے عجیب طرح سے مجھے دیکھا تھا۔ میں نے اپنے دماغ میں ایک کراچی بسا رکھا تھا اور اسرائیل کے اس جنگل میں جہاں یہودی نہ ہونا بھی ایک جرم ہے، جہاں روز دیکھنا پڑتا ہے کہ ہم یہودی لوگ کس طرح سے اس زمین میں ہزاروں سال سے بسنے والے فلسطینیوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں کیا کر رہے ہیں اور اس پریشانی میں اسی کراچی کو یاد کر لیا کرتا تھا جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ میں نے بھی دل میں سوچا تھا کہ اچھا نہیں کیا میں نے، نہیں بتاتا تو کیا فرق پڑتا، مگر اب بات ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا سولومن خود ہی بولا تھا مگر اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تم نے تو وہی بتایا ہے جو ہے۔“ پھر وہ ایک گہری سانس لے کر بولا تھا۔ ”ہمارا کراچی بہت اچھا تھا ہم سب ہی باہر سے آئے تھے ایران اور ہندوستان کے پارسی، گوا اور بمبئے کے عیسائی، کوچین اور تامل ناڈو کے یہودی، مقامی ہندو اور مسلمان سب نے مل کر کراچی کو بنایا تھا۔ سڑکیں باغ، اسکول کالج کلب

ہم لوگ انسان کو کیا جانور کو بھی نہیں مارتے تھے۔

سولومن کے مزید کچھ کہنے سے پہلے آواز دی گئی کھانا تیار ہے۔ کھانے کی میز پر سولومن نے دعا پڑھی تھی صدیوں پرانی یہودیوں کی دعا جس میں خدا کو حضرت موسیٰؑ سے کیے ہوئے وعدے کی یاد دہانی تھی اور شکر تھا کہ جس نے زمین پر بھی موسیٰؑ کے ماننے والوں کو اپنے رحمتوں سے نوازا ہے۔ میں نے تجسس کے ساتھ دعا کا مطلب پوچھا تھا۔ کھانا سادا اور مزیدار تھا۔ کوشر کیا ہوا گوشت، اچھی سبزی، چاول اور ڈبل روٹی۔ کھانے کے دوران بھی ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہی تھیں۔ جیکب نے مجھے بتایا تھا کہ اسرائیل میں دو طرح کے یہودی رہتے ہیں ایک وہ جو یورپ سے آئے ہیں اور ایک وہ جو ایشیا اور افریقہ سے آئے ہیں اور دونوں ایک کو دوسرے پر برتر سمجھتے ہیں۔ مذہب ضرور ایک ہے مگر ثقافت جدا جدا ہے، اب تو آپس میں شادیاں بھی ہوتی ہیں، پہلے یہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ پھر اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ اسرائیل میں دو طرح کے یہودی رہتے ہیں ایک وہ جو موجودہ اسرائیل کے رہتے ہوئے فلسطینیوں کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتے ہیں اور دوسرے وہ جو فلسطینیوں کو اس جگہ سے نکال دینا چاہتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جو بنیاد پرست یہودی ہیں، جھکی اور بالکل دیوانے جن کے سامنے کسی بھی چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ لوگ مذہبی دیوانگی کا شکار ہیں اور ان کی حرکتوں پر ہم لوگوں کے سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔ مذہبی دیوانگی کا تو کوئی علاج نہیں ہے۔

کھانے کے بعد ہم لوگ دوبارہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے تھے۔ چائے کے دور کے دوران سولومن نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کراچی میں اس کا ایک کام کرنے میں مجھے کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا۔

"میں نے کہا تھا بڑی خوشی سے"۔ بوڑھے سولومن میں مجھے پرانے کراچی کی خوشبو سی لگی تھی۔"ضرور کروں گا اگر ممکن ہو سکا تو۔"

اس نے کہا تھا ۱۹۴۸ء میں جب اسرائیل بنا تھا اور کراچی میں ہندوستان کے مسلمان آنے لگے تھے تو کراچی کے دو ہزار پانچ سو یہودیوں کی میٹنگ میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ اب پاکستان چھوڑ کر اسرائیل جانا ہو گا، ایک تو یہ کہ پاکستان میں مسلمانوں کے جذبات یہودیوں کے خلاف گرم ہو رہے تھے، دوسرے یہ کہ اسرائیل خدا کے وعدے کے مطابق بن گیا تھا اور اسرائیل کو یہودیوں کی ضرورت تھی اور اس پاک جگہ پر آنے سے کون یہودی انکار کر سکتا تھا۔ چند یہودیوں نے اپنے کاروبار کی وجہ سے فیصلہ کیا تھا کہ وہ بمبئی جائیں گے اور ہم لوگوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اسرائیل جائیں گے۔ میں اس وقت صرف اکیس سال کا تھا۔ میں، میرے والدین اور دو چھوٹے بھائی اور بہن آنے کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ میری ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ آنے سے ایک ہفتہ

پہلے ہم لوگوں نے سینی گاگ میں عبادت کی تھی اور ماں کو یہودیوں کے قبرستان میں دفن کردیا تھا۔ اس کے بعد ہم میں سے کوئی بھی اپنی ماں کی قبر پر نہ دعا پڑھ سکا نہ پھول ڈال سکا اور نہ ہی موم بتی جلا سکا۔ ہر سال یارزیت کے موقع پر یعنی میری ماں کی برسی کے دن ہم صرف دعا کر کے رہ جاتے ہیں۔ مجھے ابھی تک یاد ہے قبرستان کے شروع ہوتے ہی دائیں جانب عورتوں کے قبر میں اوپر سے گنو تو چودھویں لائن کی آخری قبر ہے۔ تم وہاں جا کر میری طرف سے پھول کا ایک گلدستہ رکھ دینا اور میری ماں ریکا کو بتانا کہ اس کا بیٹا اسے بھولا نہیں ہے اور یہاں دیوار گریہ پر رو رو کر اس کے لیے دعا کرتا ہے اور اب اس کے پاس آنے والا ہے۔

بوڑھے کا چہرہ فرطِ جذبات سے سرخ ہو گیا تھا۔ وہ کچھ سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔

میں جیکب سے ادھر ادھر کی باتیں کر ہی رہا تھا کہ سولومن پھر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا ایک کاغذ تھا جس پر عبرانی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ اگر ممکن ہو سکے تو پھولوں کے ساتھ کاغذ کا یہ ٹکڑا اس کی ماں کے قبر کے سرہانے رکھ دوں۔ مجھے اس نے غور سے دیکھا تھا جیسے تول رہا ہو پھر جیسے اسے یقین آگیا تھا کہ میں یہ کام ضرور کروں گا۔ اس نے لمبی سانس بھر کر کہا تھا تم کو پتا ہے مگین شلوم کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ مگین شلوم کراچی کے سینی گاگ کا نام تھا۔ بہت پرانا سینی گاگ تھا وہ صدیوں سے اس مگین شلوم میں ہم لوگ عبادت کر رہے تھے۔ مگین شلوم کا مطلب ہوتا ہے تحفظ دینے والی جگہ جہاں امان ملتی ہے۔ وہ جگہ تو ٹوٹ گئی ہے، ختم ہو گئی ہے، کراچی بھی ٹوٹ گیا ہے ختم ہو گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے بڑی جگہ ہے بغیر کسی روح کے نہ کوئی تحفظ ہے اور نہ ہی امان۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ شہروں کی روح ہوتی ہے۔ ان کی بھی کوئی روحانیت ہوتی ہے لیکن بوڑھے سالومن نے جس یقین سے یہ بات کہی تھی مجھے لگا تھا جیسے سچ کہہ رہا ہے کراچی اب ایسا ہی شہر تھا بغیر کسی روح اور روحانیت کے ۔ تھوڑی دیر مزید بیٹھنے کے بعد میں نے اجازت چاہی اور رات کے گیارہ بجے جیکب مجھے میرے ہوٹل چھوڑ گیا تھا۔

ایک دن میں خود سے گھومتا رہا اور ایک دن جیکب مجھے اپنے ساتھ نیا اور پرانا شہر دکھانے لے گیا پھر اسی راستے سے واپس قاہرہ آکر میں کراچی واپس پہنچ گیا۔

کراچی کا وہی حال تھا۔ گندگی، گھٹن، دھواں، ٹریفک، بداخلاقی، بدتمیزی، ابلتے ہوئے گٹر، ٹوٹی ہوئی سڑکیں، نعروں سے بھری ہوئی دیواریں، اغوا، قتل، ڈکیتیاں، اور چوریاں میرا شہر، پیارا شہر کیا کیا تھا اور کیا ہو گیا تھا۔

چار پانچ دن کے بعد جب مجھے اپنے کاموں سے تھوڑی فرصت مل گئی تو میں پرانے کراچی میں نشتر روڈ پر مگین شلوم کی تلاش میں پہنچا تھا۔ نشتر روڈ اور جمیلہ اسٹریٹ کے جنکشن پر جس جگہ پر

سینی گاگ ہوتا تھا وہاں ایک کپڑے کی بڑی مارکیٹ تھی جس کے پیچھے ایک پرانی بلڈنگ کے بوڑھے مالک نے بتایا تھا کہ یہاں پر یہودیوں کی عبادت گاہ ہوتی تھی۔ بوڑھے کو یاد تھا کہ مگین شلوم میں ہفتہ وار پابندی سے عبادت ہوتی تھی۔ بوڑھے نے ہی بتایا تھا کہ میوہ شاہ کے قبرستان میں یہودیوں کا قبرستان بھی ہے۔

میوہ شاہ کا قبرستان بہت بڑا ہے جہاں سندھیوں' مہاجروں' شیعوں کے الگ الگ قبرستان بنے ہوئے ہیں۔ مرنے کے بعد بھی کراچی والوں نے ایک دوسرے سے الگ ہی رہنا پسند کیا ہے۔ اصل قبرستان سے پہلے پتھروں کی ٹوٹی ہوئی دیوار کے احاطے میں ایک جگہ پر چھ کونوں کا ستارہ ایک ٹوٹی ہوئی قبر کے اوپر بنا ہوا تھا۔ میں پہچان گیا تھا یہی یہودیوں کا قبرستان تھا۔

یہاں بے تحاشا گھاس پھونس اگی ہوئی تھی۔ احاطے کے کونے میں ایک کمرہ تھا' ٹوٹا پھوٹا شاید سالوں سے وہاں کوئی نہیں آیا تھا۔ پرانی قبروں کے کتبے ٹوٹے ہوئے تھے اور بہت ساری قبروں سے غائب ہو چکے تھے۔ قبروں کی قطاریں غائب ہو چکی تھیں۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ریکا کی قبر تلاش کی جا سکے۔ میں کافی دیر تک بوڑھے سے کیے گئے وعدے کو نبھانے کے لیے قبروں کی قطاروں کو گنتا رہا' بھٹکتا رہا' تلاش کرتا رہا۔ حضرت موسیٰؑ کے ماننے والوں کے درمیان کراچی کے پرانے شہریوں کی قبروں کے درمیان' بیت المقدس میں کھوئے ہوئے ایک کراچی کے بیٹے کی ماں کی قبر نہیں تلاش کر سکا تھا۔ میں قبرستان میں سب سے صاف اور اونچی جگہ پر گیا' گلدستہ رکھ کر انگلیوں اور پتھر سے زمین کھود کر بوڑھے کا دیا ہوا خط مٹی میں دبا دیا۔

بوڑھے سالومن کو میں نے ایک خط لکھا جس میں ایک بہت بڑا جھوٹ تھا کہ قبرستان مجھے مل گیا تھا اور اوپر سے گزر کر چودھویں قطار میں آخری قبر محفوظ تھی۔ اس قبر پر میں نے پھول رکھ دیا تھا اور زمین میں تمہارا خط بھی دبا دیا تھا۔

شاید یہ میری زندگی کا پہلا جھوٹ تھا جس کے بعد میرے دل میں اطمینان تھا' یہ سوچ کر کہ وہ بوڑھا یہودی اپنی ماں کا قرض لے کر نہیں مرے گا۔ لیکن ساتھ ہی یہ خوف بھی تھا کہ مگین شلوم کا کیا ہو گا۔ کراچی کا کیا ہو گا؟

اسد محمد خان

کچھ شیر شاہ کی کہانیوں کے بارے میں

میں نے ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کتاب کے ساتھ بہت اچھے دو دن گزارے۔ میں ان کا ممنون ہوں اور اسی ممنونیت کے اظہار کے لیے یہاں آیا ہوں۔ یہ بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ یہ کہنا کہ انھوں نے اپنی کہانیوں میں منافقت اور جھوٹ کے خلاف پرچار کیا ہے، ایک چیختی ہوئی violent سچائی کو oversimplify کرنا اور شاید اسے کم اثر کر دینا ہے۔ ہر بھلا آدمی چاہے وہ کہانیاں لکھتا ہو یا popcorn بیچتا ہو منافقت اور جھوٹ کا مخالف ہوتا ہے۔ ان ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ کہا وہ تو بہت اشتعال انگیز ہے۔

ان کی کہانیاں پڑھ کر مجھے یوں لگا کہ یہ منافقت اور جھوٹ کے خلاف بلوہ کرنے باہر نکل آئے ہیں۔ اب بھی وقت ہے، ان کی ہم وطن اکثریت نے اگر انھیں اب نہیں روکا تو یہ اتھلی پاکستانیت، آرائشی دین داری اور بڑھکیں مارتے jingoism کے خلاف باقاعدہ رولا ڈال دیں گے۔

یہ فوجی افسروں کو corrupt کہنے کی ہمت رکھتے ہیں جو اتنی ہی خطرناک اور mischievous بات ہے جتنی مولوی کے خدا کو clean-shaven، یا ڈاڑھی والا یا بوڑھا کہہ دینا۔ معاذ اللہ! ان چاروں بیانات پر کسی کو بھی اور کبھی بھی وقت سنگسار کیا جا سکتا ہے۔

ایک اور oversimplification اور cliche یہ ہے کہ شیر شاہ سید کیوں کہ ڈاکٹر ہیں اس لیے ایک درد مند دل رکھتے ہیں۔ نہیں جناب! درد مندی کوئی، ان کے پیشے یا ان کے scalpel سے مخصوص نہیں ہے۔ منٹو کا بڑی مونچھ والا ممد بھائی بھی ایک بڑا سا چاقو اور ایک درد مند دل لیے بمبئی میں وارد ہوا تھا، کل کی بات ہے۔

اگر میں یہ کہوں کہ بے خوفی سے لکھ دینا اور دھاڑ سے کہہ دینا ان کی خصوصیت ہے تو یہ کام بھی بہت سے لوگ کر رہے ہیں۔ لیکن نہیں۔ شیر شاہ سید کے یہاں ایک conviction ہے جو مشق سے نہیں مر مر کے حاصل ہوتا ہے۔

ہم ہندی مسلمانوں کی اجتماعی psyche کا خمیر لا علمی اور منافقت سے اٹھا ہے (حسبِ معمول یہاں ہندی مسلمانوں سے مراد جنوبی ایشیا کے تین ملکوں کے مسلمان ہیں)۔ ہم نے اپنی تاریخ کو بہت pamper کیا بلکہ بگاڑا ہے۔ محمود غزنوی سے لے کے عالمگیر بادشاہ تک وقائع نگاروں نے لکھا کہ ہم بڑی شان و شوکت، بڑے دبدبے والے تھے۔ تہذیب میں افضل تھے۔ کیسی کیسی عمارتیں بنوا دیں۔ انھیں آج بھی دیکھا اور ہاتھ لگا کے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

اصل میں شوکت اور دبدبہ اور عمارات وغیرہ لکھتے ہوئے وقائع نگار ہمارے elite کا، ہماری Ruling Class کا ذکر کرتے رہے تھے۔ وہ جو ہم میں حمال اور بہشتی اور نانبائی اور نداف اور Non-entity تھے، وقائع نگاروں کی دسترس میں وہ کبھی نہیں رہے۔ میرا خیال ہے وہ لوگ خاصے مضبوط، بڑے down to earth ہوں گے۔ کہیں کہیں لوک کہانیوں، گیتوں، محاوروں میں ان کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ وہ بیبے لوگ تھے اور بڑے ظالم اور خبیث بھی تھے۔ پانچ سات سو برس پرانے راجستھانی لوک گیتوں میں عورتوں کی زبان سے ان "مگلوں" "مسلوں" کے rapine اور assault کا بڑا گرافک بیان ملا ہے۔ مگر اس سے ان کے original ہونے پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انھیں جو کرنا تھا کرتے رہے۔

لال قلعہ کے زوال اور رنگون میں ایک جھلنگا چارپائی پر بہادر شاہ بادشاہ کے دم توڑ دینے کے بعد ہماری شوکت اور ہمارا دبدبہ ڈھیلے ہیٹ کی طرح خود ہمارے کانوں کے گرد آن گرا۔ شاید جبھی سے ہم اور زیادہ شکست خوردہ اور self-conscious ہو گئے ہیں...... اور منافق بھی۔

ہمارے عالم اور مدبّر اپنے وقت کے صاحبِ ثروت لوگوں سے بھر بھر جھولیاں لیتے اور خود کو درویشِ خدامست بتاتے رہے۔ کتنوں نے اپنی مے کشی کو عامتہ المسلمین سے راز رکھا۔ خوب صورت نثر میں Jesmine چائے کا قصیدہ پڑھا جب کہ بات انھیں شراب کی کرنی تھی۔ اربابِ نشاط سے وہ خوب خوب رابطے میں رہے، کوٹھوں پہ گئے آئے اور صاف چھپا گئے۔

تو گزارش یہ ہے کہ ڈاکٹر سید کی کہانیوں کے یہ کردار ساری منافقتیں کسی isolation میں نہیں کر رہے، وہ double standards کے ساتھ گزاری ہوئی ایک ڈیڑھ صدی اپنے ہمراہ لیے پھرتے ہیں۔

آپ کو یاد ہو گا ترکِ موالات کا زمانہ۔ انگریز کو اس کے دیے ہوئے خطابات لوٹانے کی

چاروں طرف پھیلی ہوئی زندگی کے بظاہر معمولی واقعات اور تلخ و تند باتوں کو چابک دستی سے افسانہ بنا دینے کے قائل، ڈاکٹر شیر شاہ سیّد ۱۹۵۳ء میں کراچی میں پیدا ہوئے۔ این جے وی اسکول اور جامعہ ملیہ کراچی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ڈاؤ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد آئرلینڈ اور انگلینڈ کے مختلف اسپتالوں میں پیشہ ورانہ تربیت حاصل کی اور گائنی کولوجی (امراضِ نسواں) میں پوسٹ گریجویٹ اسناد حاصل کیں۔ وہ سول اسپتال کراچی سے وابستہ ہیں اور پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کے حوالے سے سماجی شعبے میں سرگرم رہتے ہیں۔

مختلف تجربات اور منفرد انداز کے حامل اپنے افسانوں کی وجہ سے شیر شاہ سیّد نے افسانے کے قارئین کو خوش گوار حیرت میں مبتلا کر دیا۔ زندگی سے قربت کی وجہ سے ان افسانوں کو سراہا گیا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "دل کی وہی تنہائی" ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ "جس کو دل کہتے تھے" ۱۹۹۸ء میں اور تیسرا مجموعہ "دل کی بساط" ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔

شہرزاد
SCHEHERZADE
Rs. 60